# رزق کی بسط وکشاد کے قرآنی قوانین

پروفیسر ڈاکٹر فاروق عزیز

Marfat.com

# رزق کی بست وکشاد کے

# قرآنی قوانین

**پروفیسر ڈاکٹر فاروق عزیز**

**اسلامک بک سینٹر**

نزد مقدس مسجد، اردو بازار، کراچی۔ فون: 2736870

Marfat.com

۱۱ ۔ ۴۹۷
ف ۱۹ /
۲۵۱۵۷

جملہ حقوق بہ حق منصف محفوظ ہیں

کتاب کا نام — رزق کی بست و کشاد کے قرآنی قوانین
مصنف — پروفیسر ڈاکٹر فاروق عزیز
کمپوزنگ — غلام عباس وفا، محمد حسن
سن اشاعت — 2006ء
ناشر — اسلامک بک سینٹر
ٹائٹل — پروفیسر ڈاکٹر فاروق عزیز
قیمت — /200 روپے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ط

وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ط مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ط وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ ۝

اگر یہ لوگ تورات اور انجیل اور ان کی جانب جو کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ان کے پورے پابند رہتے تو یہ لوگ اپنے اوپر سے اور نیچے سے کھاتے ان میں سے کچھ لوگ میانہ رو ہیں اور بہت سے ایسے ہیں جن کے اعمال بُرے ہیں۔

# انتساب

اپنی بہنوں

شائستہ جاوید

اور

بینا ابرار

کے نام

Marfat.com

# آغازِ سخن

برصغیر پاک وہند کی تاریخ میں ایسے مفکرین جنہوں نے اسلامی معاشیات پر لکھا ان میں مولانا مناظر حسن گیلانی کو دو (۲) حوالوں سے انفرادیت حاصل ہے اول یہ کہ انہیں اس خطے میں اسلامی اقتصادیات پر پہلی کتاب لکھنے کا شرف حاصل ہے دوم اپنی کتاب ''اسلامی معاشیات'' میں انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ ہمیں ان قوانین کو سمجھنا چاہیے جن پر رزق کی تنگی اور فراوانی کا انحصار ہوتا ہے تاہم ضرورت کی نشاندہی کے باوجود انہوں نے اس حوالے سے کوئی بحث نہیں کی کہ کس طرح طبعی قوانین کی طرح معاشی قوانین بھی وضع کیئے جائیں۔ بدقسمتی سے گیلانی صاحب کے بعد سے آج تک کم از کم برصغیر پاک وہند کی حد تک کسی مسلم معاشی مفکر نے اس جانب توجہ نہیں دی۔ یہ ایک بدیہی ضرورت تھی اور ہے اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے یہ ایک ادنیٰ سی کاوش ہے۔

جس طرح طبعی اصولوں و قوانین کا ایک منضبط ڈھانچہ موجود ہے اسی طرح سماجی اور معاشی اصولوں و قوانین کا ایک ڈھانچہ ترتیب دینے کی ضرورت ہے۔ یہ حقیقت بجا طور پر تسلیم کی جاسکتی ہے کہ یہ ایک بہت مشکل امر ہے تاہم یہ مشکل بنیادی طور پر اس وجہ سے زیادہ ہے کہ اس جانب کبھی سنجیدگی سے کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ طبعی قوانین کی جانچ چونکہ آسانی سے ممکن ہوسکتی ہے لہٰذا ان کی ترقی غیر معمولی رہی ہے جبکہ سماجی اور معاشی قوانین ایک طویل اور پیچیدہ جانچ کے عمل سے ہی وضع ہوسکتے ہیں تاہم بہرحال یہ امر ناممکنات میں سے نہیں۔

اس حوالے سے اگر قرآن مجید فرقان حمید سے رہنمائی طلب کی جائے تو وہ ہمیں مایوس نہیں کرتا زیرِ نظر کاوش کو اسی تناظر میں دیکھا جانا چاہیے اس کوشش میں قرآن مجید کے ان قوانین کو سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے جو بالخصوص معاشی حوالے سے بیان کیئے گئے ہیں اس حوالے سے یہ چونکہ نقشِ اولین ہے لہٰذا کچھ پہلوؤں کا نظر انداز ہوجانا عین ممکن

ہے ویسے بھی قرآن پر تدبر کے دروازے تاقیامت کھلے ہیں اس حوالے سے مزید فکر و تدبر سے قرآنی تعلیمات کے مزید کئی گوشے وا ہو سکتے ہیں۔

یہ امر اس لئے بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ آج کل کے دور میں جب کہ اسلامی معاشیات میں دلچسپی اور لکھنے والوں کی تعداد میں اضافہ کا رجحان ہے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ ان بنیادی اصولوں و قوانین پر بھی بحث کی جائے جن پر یہ نظام استوار ہے۔

تاہم خالصتاً علمی پہلو سے قطع نظر یہ مسئلہ ایک عام آدمی کا بھی ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ عام آدمی کا کہیں زیادہ ہے تو قطعی بے جا نہ ہوگا۔ بدقسمتی سے عقیدۂ جبر ہمارے ذہنوں میں اتنا راسخ کر دیا گیا ہے کہ ایک عام آدمی کی زندگی میں جو بھی اونچ نیچ آتی ہے خواہ وہ اقتصادی حوالے سے ہو یا کسی بھی دیگر حوالے سے وہ اسے تقدیر کا لکھا سمجھ لیتا ہے اور کبھی غور و فکر کی زحمت نہیں کرتا ویسے تو بہ حیثیت امہ ہم اپنے ذہن کو ایسی زحمت دینے کے عادی نہیں۔ تاہم بہرحال یہ سب کچھ اتنا سادہ نہیں کہ اسے تقدیر کا لکھا سمجھ کر اس پر تدبر نہ کیا جائے۔ زندگی کے تمام حقائق خواہ وہ معاشی ہوں یا کوئی اور تدبر مانگتے ہیں کہ اگر کوئی واقعہ ہوا ہے خواہ وہ اچھا ہو یا برا تو کس وجہ سے ہوا ہے؟ اس کائنات میں کوئی بھی شے خواہ وہ جاندار ہو یا بے جان چند مخصوص قوائد و ضوابط کے تابع ہے۔ اگر ہم ان قوائد و ضوابط کے خلاف چلیں گے تو کارگہ حیات میں خس و خاشاک ہو جائیں گے۔ دنیاوی اور اخروی فلاح کا واحد ذریعہ ان قوانین سے ہم آہنگی ہے انفرادی سطح پر فرد اور اجتماعی سطح پر قوم جتنا زیادہ اپنے آپ کو ان قوانین سے ہم آہنگ کرنے میں کامیاب ہوگی اسی قدر فلاح اور کامرانی اس کے قدم چومے گی لہٰذا ان قوانین کی دریافت اور ان پر عمل پیرا ہونا دونوں لازمی ہیں۔

یہی اس کاوش کا بنیادی مقصد ہے کہ مشیت ایزدی نے رزق کی بست و کشاد کے جن قوانین کو قرآن مجید کے ذریعے انسانوں کو عطا کیا ہے انہیں سمجھا جائے اور نہ صرف سمجھا جائے بلکہ ان پر عمل کے ذریعے دنیاوی اور اخروی فلاح بھی حاصل کی جائے۔

Marfat.com

اس کتاب میں جو کچھ پیش کیا گیا ہے وہ فکرِ قرآن سے متعلق ایک انسانی کوشش ہے جو سہو و خطا سے ماوراء نہیں ہو سکتی۔ اس کتاب میں جو بھی سہو ہے وہ یقیناً میری کوتاہی فہم کا نتیجہ ہے اور میں اس کی تمام تر ذمے داری قبول کرتا ہوں۔

میرے ساقی نے عطا کی ہے مئے درد و صاف
رنگ جو کچھ دیکھتے ہو میرے پیمانے کا ہے

اس سہو و خطا کے لئے اپنے رب سے خواستگار عفو ہوں وہ یقیناً درگذر کرنے والا، بخشنے والا اور مہربان ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ میں آپ سے بھی ملتمس ہوں کہ اس حوالے سے اغلاط کی نشاندہی کی جائے تاکہ آئندہ اس کی اصلاح ہو سکے۔

آخر میں اس درخواست کے ساتھ کہ یہ نہ دیکھیں کہ کون کہہ رہا ہے بلکہ یہ دیکھیں کہ کیا کہہ رہا ہے میں اپنے ان گنت رت جگوں کا یہ ماحصل اپنی تمام تر کوتاہ دامانیوں کے اعتراف کے ساتھ قلب سلیم کے حامل نفوس کو پیش کرتا ہوں۔

گر قبول افتد زہے عزو شرف

پروفیسر ڈاکٹر فاروق عزیز

انچارج شعبہ بزنس ایڈمنسٹریشن

وفاقی اردو یونیورسٹی گلشن اقبال کیمپس کراچی

Marfat.com

# فہرست


| صفحہ نمبر | باب |
|---|---|
| ۱ | ۱۔ اسلام بہ حیثیت دین |
| ۲۹ | ۲۔ انسانی اختیار و ارادہ |
| ۶۳ | ۳۔ صفت ربوبیت اور رزاقیت |
| ۹۱ | ۴۔ رزق کی اہمیت |
| ۱۰۱ | ۵۔ تکمیل نعمت اور اس کی شرائط |
| ۱۱۷ | ۶۔ رزق کی کشاد کے قوانین |
| ۱۸۵ | ۷۔ رزق کی بستگی کے قوانین |
| ۲۷۲ | ۸۔ آزمائش کا پہلو |


Marfat.com

باب اول

# اسلام بہ حیثیت دین

اسلام اپنا تعارف بہ حیثیت دین کرواتا ہے۔

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَاللّٰہِ الْاِسْلَامُ (۳/۱۹)

دین اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہے۔

دین عربی زبان کا ایک وسیع المعانی لفظ ہے جو غلبہ، اقتدار، حکومت، مملکت، آئین، قانون، نظم و نسق، فیصلہ، ٹھوس نتائج، جزا اور سزا اور بدلے وغیرہ کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اسے اطاعت و فرماں برداری اور ایسی روش کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے جو التزاماً تبدیل نہ ہو۔

اپنے مخصوص تناظر میں یہ لفظ چار (۴) بنیادی تصورات کا عکاس ہے یعنی:۔

i۔ اللہ کی حاکمیت اور اس کا اقتدار اعلیٰ۔

ii۔ اطاعت و بندگی جو اللہ کی حاکمیت کے مقابلے میں اختیار کی جائے۔

iii۔ وہ قوائد و ضوابط یا طریقہ کار یا نظام فکر و عمل جو اللہ کی حاکمیت کے زیر اثر ہے اور

iv۔ جزا اور سزا جو اس نظام کی اطاعت اور عدم اطاعت کا منطقی نتیجہ ہو۔

اسلام دین کامل ہے، جس میں زندگی کے تمام امور کے متعلق مکمل رہنمائی موجود ہے۔ یہاں مکمل رہنمائی سے مراد زندگی کے تمام شعبوں کے متعلق بنیادی اصول و قوانین کی فراہمی ہے۔ یہ اصول و قوانین مکمل طور پر غیر لچکدار اور زمان کی حدود سے ماوراء ہیں۔ ان مطلق اصول و قوانین کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر مکمل فوز و فلاح کے ضامن ہیں اور یہ فوز و فلاح صرف اخروی نہیں بلکہ دنیاوی بھی ہے۔ کوئی بھی معاشرہ وقت کے کسی بھی لمحے میں اگر ان اصول و قوانین پر استوار کیا جائے گا تو استخلاف فی الارض اس کا حتمی مقدر ہے۔

Marfat.com

(۲)

یہاں یہ امر یقیناً ملحوظِ خاطر رہے کہ یہ اصول وقوانین غیر متبدل ہیں ان کی جزئیات نہیں، جو تمام تر اضافی ہوتی ہیں یعنی بلحاظ وقت اور ضروریات متعین ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر دولت کی منصفانہ تقسیم ایک مطلق اصول ہے لیکن اس پر عمل درآمد ہر دور کے لحاظ سے اور اس دور میں مروج طریقۂ کار کی مدد سے ہی ممکن ہے۔ بالفاظ دیگر ان اصولوں کی اطلاقی حکمت عملی کا تعین ہر عہد کا ذھن اپنی ضروریات اور تقاضوں کے مطابق خود کرتا ہے کیونکہ ہر عہد، ہر معیشت بلکہ ہر علاقے کی صورتِ حال مختلف ہوتی ہے لہٰذا جزئیات اس پس منظر میں متعین ہوں گی لیکن اصول بہر حال غیر متبدل رہتے ہیں۔ یہی صورت حال تمام شعبہ ہائے زندگی کے بارے میں ہے جن کے متعلق اصول اسلام نے فراہم کر دیئے ہیں۔ اسی بنیاد پر اسلام کو دین کامل کہا گیا ہے۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِىْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ط (۵/۳)

آج ہم نے تمہارے لئے تمہارا دین کامل کر دیا ہے اور اپنی نعمتیں پوری کر دی ہیں اور تمہارے لئے اسلام کو بطور دین پسند کیا ہے۔

مکمل ضابطہ زندگی کی حیثیت سے اسلامی تعلیمات کے دو (۲) پہلو ہیں ایک طرف اسلام زندگی کی بنیادی حقیقتوں پر روشنی ڈالتا ہے اور ہمیں بتاتا ہے کہ اس کائنات کی حقیقت کیا ہے؟، اس میں انسان کا اصل مقام کیا ہے؟، زندگی کا مقصد کیا ہے؟ اور جو اساسی قانون اس میں کارفرما ہے اس کی حقیقت کیا ہے؟۔ بالفاظِ دیگر اللہ، کائنات اور انسان کی اقنوم ثلاثہ کے مابین تعلقات کی نوعیت کیا ہے؟ ان کے مابین صحیح اور درست تعلق کیسے استوار ہو سکتا ہے؟ دوسری طرف اسلام زندگی کا مفصل قانون پیش کرتا ہے تاکہ انسان افراط وتفریط سے بچ کر اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو اعتدال اور توازن کی بنیاد پر استوار کرے اور کامیاب و کامران رہے۔ عقائد اور ضابطۂ عمل کے اس مجموعے کا نام اسلامی نظریۂ حیات

ہے۔ لہٰذا اسلامی نظریہ حیات (Islamic Ideaology) سے مراد وہ بنیادی تصورات اور اصول وقوانین ہوں گے جو دین اسلام کی اساس ہیں۔

کسی بھی ایسے نظام فکر کے لئے جو نظریہ حیات ہونے کا مدعی ہو جیسا کہ اسلام ہے چار (۴) بنیادی فلسفیانہ پہلوؤں کو زیر غور لانا ضروری ہوتا ہے۔

۱۔ خدا کا تصور

۲۔ کائنات کے بارے میں تصور

۳۔ انسان کے بارے میں تصور اور

۴۔ خدا، انسان اور کائنات کا باہمی تعلق۔

اس حوالے سے اسلامی نظریہ حیات کا تجزیہ مندرجہ ذیل ہے۔

## ۱۔ خدا کا تصور

کسی بھی نظریہ حیات میں خدا کا تصور اساسی نوعیت کا حامل ہوتا ہے۔ یہی وہ خشتِ اول ہوتی ہے جس پر فکر کی پوری عمارت تعمیر کی جاتی ہے۔ عمل ہمیشہ فکر کا محتاج ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر خدا کا تصور تمام تر اعمال کا منبع اور سرچشمہ ہے کیونکہ تمام تر فکر و عمل اسی سوتے ہی سے پھوٹتے ہیں جس قسم کا خدا کا تصور ہو گا اس کے پیروکاروں کا طرز عمل بھی ویسا ہی ہو گا۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ "جیسا خدا ویسے پجاری"۔

اس پس منظر میں اگر اس خدا کے تصور کا جائزہ لیا جائے جو اسلام ہمیں پیش کرتا ہے تو یہ بات بغیر کسی شک وشبہ کے کہی جاسکتی ہے کہ اس سے زیادہ جامع اور مکمل خدا کا تصور بھی ممکن نہیں ہے۔ قرآن مجید نے ذاتِ خداوندی کے لئے اللہ کا لفظ استعمال کیا ہے جو خدا کی ذات کا نام ہے۔ جس کی مختلف صفات کا تذکرہ قرآن مجید میں کیا گیا ہے۔ قرآنی تعلیم کا نکتۂ ماسکہ یہ ہے کہ لا الہ الا اللہ یعنی کائنات میں کوئی ہستی، کوئی ایسی قوت نہیں جسے الہ تسلیم کیا جائے ایسی ہستی ایک ہی ہے جسے قرآن نے اللہ کہہ کر پکارا ہے۔ بالفاظ دیگر اس

Marfat.com

کے معنی یہ ہوئے کہ کائنات میں صرف ایک اللہ کا قانون ایسا ہے جس کی اطاعت اختیار کی جائے۔ جس سے سامانِ حفاظت طلب کیا جائے۔ جسے تمام مشکلات و مصائب کے لئے سپر بنایا جائے اس اعتبار سے دیکھئے تو الہ ایک نہج سے خدا کی ذات کا تصور سامنے لاتا ہے اور دوسرے نہج سے یہ اس کی صفت بھی ہے۔ انسان اللہ تعالیٰ کی ذات کی نوعیت و ماھیت کو سمجھ ہی نہیں سکتا۔ اسے یہ استعداد دی ہی نہیں گئی ہے۔ ایک محدود ذہن کس طرح لامحدود کا تصور کر سکتا ہے لہٰذا یہ ممکن ہی نہیں ہے۔ اللہ کی مثل کوئی شے نہیں اسے کسی مثال کی مدد سے نہیں سمجھایا جا سکتا۔

لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ ۚ (۴۲/۱۱)

اس کی مثل کوئی شے نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی ذات کی بابت کوئی اشارہ نہیں۔ تاہم اس دنیا کی حد تک اللہ تعالیٰ کو صرف اس کی صفات (Attributes) سے جانا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی جن صفات کا تذکرہ قرآن مجید میں کیا گیا ہے ان سے جس قسم کے خدا کا تصور بنتا ہے وہ اکمل ترین ہے۔ اس سے بلند، پاکیزہ اور مکمل تصور ممکن نہیں ہے۔ اللہ کی ذات چونکہ اکمل اور کامل ترین ہے اس لئے اس کی صفات بھی مکمل ترین ہیں جنہیں قرآن نے اسما الحسنٰی سے تعبیر کیا ہے یعنی انسب ترین تناسب۔ یوں تو اللہ تعالیٰ کی لاتعداد صفات کائنات میں جلوہ گر ہیں تاہم کتاب کے موضوع کے لحاظ سے آئندہ ابواب میں صرف اس کی صفت ربوبیت اور صفت رزاقیت پر بحث کی جائے گی۔

## ۲۔ کائنات کے بارے میں تصور

جہاں تک اس کائنات کا تعلق ہے اسے اللہ نے خلق کیا ہے وہی اسے پہلی دفعہ عدم سے وجود میں لایا ہے۔

Marfat.com

بَدِيعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط (۲/۱۱۷)

اس نے زمین اور آسمانوں کو پہلی دفعہ پیدا کیا۔

ایک دوسرے مقام پر اس حقیقت کے بیان کا پیرایہ اظہار یہ ہے۔

فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۶/۱۴)

اس نے زمین اور آسمان کو پہلی دفعہ پیدا کیا۔

نہ صرف اس نے انہیں پیدا کیا بلکہ اس انداز میں پیدا کیا ہے کہ ان میں کہیں کسی قسم کا کوئی نقص نہیں ہے۔

الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ۭ مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ۭ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ۝ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ (۶۷/۳-۴)

اس نے سات آسمان اوپر تلے بنائے (اے دیکھنے والے) کیا تو (خدائے) رحمٰن کی آفرینش میں کچھ نقص دیکھتا ہے؟ ذرا آنکھ اٹھا کر دیکھ بھلا تجھ کو کوئی شگاف نظر آتا ہے؟ پھر دوبارہ (سہ بارہ) نظر کر تو نظر (ہر بار) درماندہ ونا کام واپس آئے گی۔

اس بنیاد پر اللہ احسن الخالقین ہے (۲۳/۱۴) اور (۳۷/۱۲۵) یعنی تمام خلق کرنے والوں میں سب سے بہترین، اعلیٰ اور ارفع خالق۔ کائنات کی تخلیق بلاوجہ نہیں ہے اور نہ ہی یہ حادثاتی طور پر وجود میں آئی ہے۔

اس کائنات کی تخلیق کا ایک باقاعدہ مقصد ہے اور یہ مقصد تعمیری نتائج کا حصول ہے اسی وجہ سے یہ کائنات بالحق پیدا کی گئی ہے۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ط (۱۶/۳)

اس نے زمین اور سماوات کو بالحق پیدا کیا ہے۔

Marfat.com

حق کے معنی ہیں کسی چیز کا اس طرح موجود، واقع اور ثابت ہو جانا کہ اس کے واقع ہونے یا ثابت ہونے سے انکار نہ کیا جا سکے یعنی کسی چیز کا ٹھوس شکل میں سامنے آجانا یا ثابت ہو جانا کوئی چیز اسی صورت میں باقی رہ سکتی ہے کہ وہ قانون حفظ و بقا کے عین مطابق ہو، یعنی جو زمانے کے تقاضوں کا ساتھ دے سکے جو اپنی جگہ پر بھی فٹ ہو اور بدلتے ہوئے حالات میں بھی موافق رہے۔ چنانچہ حق کے معنی علم و عقل، عدل و انصاف اور واقعات و مصالح کے عین مطابق ہونا ہے۔ لہٰذا ہر اس چیز کو حق کہا جاتا ہے جو حکمت کے تقاضوں کے عین مطابق ہو۔ سورۃ یونس میں حق کا لفظ ظن کے مقابلے میں آیا ہے (۱۰/۳۶)۔ ظن غیر یقینی، شک اور قیاس کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے اسی وجہ سے کہا گیا کہ ظن حق کے مقابلے میں کچھ کام نہیں دیتا (۱۰/۳۶)۔ اسی لئے حق کا اتباع لازمی ہے حق چونکہ نا قابل تردید حقیقت کا نام ہے لہٰذا اللہ خود حق ہے (۱۰/۳۰)، اس کا رسول حق ہے (۳/۸۵)، قرآن مجید حق ہے (۳۴/۶)، خدا کے وعدے (قوانین) حق ہیں (۱۰/۵۵)، اسکا دین حق ہے (۹/۳۳) اور یہ کائنات برحق ہے (۵/۳۹)۔

ہر عمل کا نتیجہ یا نتائج لازمی سامنے آتے ہیں اور ان سے کسی صورت فرار ممکن نہیں۔ ہر عمل کا کوئی نہ کوئی مثبت یا منفی نتیجہ لازمی ہے اور جس کا عمل کرنے والے کو سامنا کرنا ہوگا۔

یہ نتائج ان قوانین کے پیدا کردہ ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنی مشیت سے متعین کئے ہیں اور کائنات کا ذرہ ذرہ انکا پابند ہے۔ یہ قوانین اپنی جگہ اٹل ہیں اور کسی بھی قسم کی لچک کے تصور سے مکمل نا آشنا۔ یہ اللہ کا اختیار مطلق ہے کہ وہ جب، جہاں، جیسے، جس طرح اور جو چاہے کر سکتا ہے تاہم وہ جب کوئی قانون متعین کر دیتا ہے تو خود بھی اس کی مکمل قدرت رکھتے ہوئے اس قانون کی کبھی خلاف ورزی نہیں کرتا وہ ایسا کر سکتا ہے لیکن اس نے ایسا کرنا خود اپنے اوپر واجب کر لیا ہے۔

اس حوالے سے قرآن مجید کی دو (۲) اصطلاحات پر تدبر لازمی ہے اول کلمۃ اللہ

Marfat.com

اور دوم سنت اللہ۔

کلمہ، اس لفظ کا مادہ ک ل م ہے۔ اس کے بنیادی معنی ۱) بات کرنا اور ۲) زخمی کرنا کے آتے ہیں۔ قرآن مجید میں اس اصطلاح کا استعمال تقریباً ۲۶ مختلف مقامات پر کیا گیا ہے اور اسے منجملہ تمام مقامات پر بات کرنے کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً سورۃ الیونس میں ارشاد ربانی ہے۔

كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ فَسَقُوْٓا اَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ

(۱۰/۳۳)

اور اس طرح جن لوگوں نے فسق اختیار کیا ہے ان پر آپ کے رب کی بات صادق آ گئی کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

اسی طرح دیگر مقامات پر بھی یہی انداز اختیار کیا گیا ہے مثلاً سورۃ الانعام میں ارشاد ربانی ہے:۔

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۭ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

(۶/۱۱۶)

اور آپ کے رب کی بات تو حق اور انصاف کیساتھ پوری ہو کر رہے گی کیونکہ اس کی باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں اور وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

یہاں اور دیگر مقامات پر بھی خدا کے کلمہ سے مراد خدا کا قانون ہی ہے یہ احکام مکمل اور محکم ہیں اور قیامت تک کیلئے ہیں۔

قانون کی تعریف ان الفاظ میں کی جا سکتی ہے۔

If-Then-Always

یعنی ''اگر ایسا کرو گے تو اس کا نتیجہ ہمیشہ ایسا ہوگا''۔ یہ ایک غیر متبدل فیصلہ ہوتا ہے جس پر عمل کے ثمرات اور خلاف ورزی کے نقصانات ہمیشہ ایک جیسے ہوتے ہیں۔ بالفاظ

Marfat.com

دیگر اللہ نے اپنی مشیت سے جو قوانین متعین کر دیئے ہیں ان پر عمل کے مثبت اثرات اور انحرافات کے منفی نتائج ہمیشہ یکساں ہوتے ہیں۔

یہ قوانین خداوندی چونکہ صدق اور عدل پر مبنی ہیں لہٰذا ان پر عمل درآمد کے نتیجے میں مثبت ثمرات ہمہ وقت یقینی ہوتے ہیں۔

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ۝ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۢ بِاِذْنِ رَبِّهَا ۭ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ (۲۵-۱۴/۲۴)

کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے پاکیزہ بات کی مثال کس طرح بیان فرمائی، مثل ایک پاکیزہ درخت کے جس کی جڑ مضبوط ہے اور جس کی ٹہنیاں آسمان میں ہیں جو اپنے رب کے حکم سے ہر وقت پھل لاتا ہے، اور اللہ تعالیٰ لوگوں کے سامنے مثالیں بیان فرماتا ہے تا کہ وہ نصیحت حاصل کریں۔

باالفاظ دیگر یہ قوانین ایک ٹھوس اور مضبوط بنیاد رکھتے ہیں اور نہ صرف یہ کہ ان کی اساس گہری ہے بلکہ یہ وسعت میں بھی سماء تک پہنچتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ ان قوانین کی مثال طیب (پاک) درخت سے دی گئی ہے۔ طیب کے بنیادی معنی اس چیز کے ہیں جس سے انسان کا نفس اور حواس دونوں لذت یاب ہوں یعنی ہر وہ چیز جو حواس کے لئے پسندیدہ ہو اور نفس کو بھی اس سے فیض پہنچے۔ گویا یہ قوانین ہر لحاظ سے انسان کے لئے منفعت بخش ہیں۔ یہ حواس کو بھی سرور دیتے ہیں اور نفس کی تقویت کا ذریعہ بھی ہیں۔

قرآن مجید کے اس دعوے کا اثبات چھٹے باب میں بہ عنوان "رزق کی کشاد کے قوانین" کے تحت کیا گیا ہے جہاں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اللہ کے قوانین پر عمل کا نتیجہ صرف اور صرف خیر اور نعمائے خداوندی کے حصول کی شکل میں نکلتا ہے۔

یہ حقیقت بذات خود اللہ کے وجود کی ایک بنیادی دلیل بھی ہے۔ اللہ خیر مطلق ہے وہ

Marfat.com

کسی پر ظلم نہیں کرتا۔

وَاَنَّ اللّٰہَ لَیۡسَ بِظَلَّامٍ لِّلۡعَبِیۡدِ (۳/۱۸۲)

اللہ کسی پر ظلم نہیں کرتا۔

ظلم کرنا تو درکنار وہ تو اسکا ارادہ بھی نہیں کرتا ہے۔

وَمَا اللّٰہُ یُرِیۡدُ ظُلۡمًا لِّلۡعِبَادِ (۴۰/۳۱)

اللہ اپنے بندوں پر ظلم کرنا نہیں چاہتا۔

چونکہ اللہ خیر ہے لہٰذا اس کے قوانین کے اتباع کا نتیجہ بھی خیر کی صورت میں نکلتا ہے۔ کیا بے جان مادے یا کسی اندھی بہری قوت سے اس قسم کے قوانین کی تشکیل کی توقع کی جاسکتی ہے؟ کیا مادہ اس امر پر قادر ہوسکتا ہے یا کائنات از خود اس قسم کے قوانین تشکیل دے سکتی ہے جو ہر لحاظ سے انسانوں کیلئے باعث منفعت ہوں؟ ظاہر ہے اس کا جواب سوائے نفی کے اور کچھ نہیں۔ یہ صرف اسی ذات واحد کی رحمت ہے کہ اس نے ایسے قوانین مرتب کئے جن پر عمل پیرا ہو کر انسان کو ہر قسم کی نعمتیں حاصل ہوتی ہیں۔ جہاں تک اللہ کے ان کلمات (قوانین) کا تعلق ہے انکا ایک حصہ خارجی دنیا میں نافذ العمل ہے جنہیں قوانین فطرت (Laws of Nature) کہا جاتا ہے دوسرا حصہ وہ ہے جو انسانی دنیا سے متعلق ہے۔ اول الذکر قوانین کو سائنس دریافت کرتی ہے۔ سائنس کی مختلف شاخیں جن میں طبیعات (Physics)، کیمیاء (Chemistry)، فلکیات (Astronomy) اور دیگر کئی شاخیں شامل ہیں مختلف حوالوں سے ان قوانین کی دریافت میں مصروف ہیں۔ یہ قوانین مکمل غیر لچکدار ہیں اور ان کی اسی غیر لچکداریت کی خوبی نے سائنس کو جنم دیا ہے۔ ایک جیسے حالات میں کیا جانیوالا کوئی بھی تجربہ دنیا میں کہیں بھی کسی بھی وقت ہمیشہ ایک جیسے نتائج دیتا ہے اسی خصوصیت سے سائنس کے مختلف قوانین ترتیب پاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی بڑے سے بڑا ولی یا قطب بھی ہوا کے عام دباؤ پر پانی کو ۱۰۰ درجے سے اوپر یا نیچے

Marfat.com

نہیں ابال سکتا یہ ممکن ہی نہیں نہ یہ کل ممکن تھا نہ آج ہے اور نہ تا قیامت کبھی ایسا ہو سکے گا۔ یہ ایک ایسی بے رحم حقیقت ہے جس سے فرار ممکن نہیں۔

ان قوانین کا دوسرا حصہ وہ ہے جو انسانی دنیا سے متعلق ہے۔ یہ قوانین وحی کے ذریعے انسانوں کو دیئے گئے ہیں اور قرآن کریم کی شکل میں مکمل محفوظ ہیں۔ یہ قوانین مطلق صدق وعدل کیساتھ تکمیل کو پہنچ گئے ہیں (۶/۱۱۵)۔ ظاہر ہے جب ان تمام قوانین کو جن کی انسانی معاشرے کو ضرورت تھی قرآن مجید فرقان حمید کی شکل میں انسانوں تک پہنچا دیا گیا ہے لہٰذا اب کسی قسم کی نبوت کی کوئی ضرورت نہیں لہٰذا باب نبوت اب قیامت تک کیلئے بند ہو چکا ہے۔

انسانوں سے متعلق یہ قوانین بھی عام طبعی قوانین کی طرح مکمل غیر لچکدار ہیں۔ انسان انفرادی اور اجتماعی سطح پر جو بھی افعال انجام دیتا ہے ان کے نتائج انہی قوانین کے مطابق مرتب ہوتے ہیں اور قیامت تک اسی طرح مرتب ہوتے رہیں گے۔ ان قوانین کے عملی اطلاق کیلئے قرآن ''سنۃ اللہ'' کی اصطلاح استعمال کرتا ہے۔

سُنَّةَ مَنْ قَدْ أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيلًا

(۱۷/۷۷)

جو پیغمبر ہم نے آپ سے پہلے بھیجے تھے ان کے بارے میں ہمارا یہی طریق رہا ہے اور آپ ہماری سنت (دستور) میں کوئی تبدیلی نہیں پائیں گے۔

یہی قوانین فیصلہ کن ہیں جو ہر دور میں یکساں رہے ہیں۔

سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ وَكَانَ أَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُورًا

(۳۳/۳۸)

یہی طریق اللہ نے پہلے لوگوں میں جاری کیا تھا اور خدا کا حکم تو ایک فیصلہ کن امر ہے (اسے کوئی نہیں ٹال سکتا)۔

اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ اللہ کی سنت کو یاد رکھو بالفاظ دیگر اس کے قوانین کے مطابق عمل کرو جن قوانین میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔

سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۝

(۴۸/۲۳)

اللہ کی اس سنت کو یاد رکھو جو ہمیشہ سے چلی آئی ہے اور آپ کبھی اللہ کے مقررہ طریقے میں کوئی تبدیلی نہیں پائیں گے۔

اس حقیقت کا اعادہ (۳۸/۸)، (۱۸/۵۵)، (۳۵/۴۳) اور (۴۰/۸۵) میں بھی کیا گیا ہے۔ چونکہ اللہ کے قوانین کی اطاعت ہی دنیاوی اور اخروی فلاح کا واحد ذریعہ ہے۔ لہٰذا صرف اور صرف اللہ کے قوانین کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔

سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۝

(۳۳/۶۲)

اللہ کی اس سنت کو اختیار کرو جو ان لوگوں میں جاری ہوئی تھی جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں اور آپ کبھی اللہ کی سنت میں تبدیلی نہیں پائیں گے۔

یہ قوانین انسانوں کی فلاح کیلئے اس ذات کریم نے متعین کیئے ہیں جس سے صرف خیر کا ظہور ممکن ہے۔ جو کسی پر ظلم نہیں کرتا (۳/۱۸۲) لہٰذا یہ قوانین بھی مبنی بر خیر ہیں۔ ان قوانین پر عمل پیرا ہو کر انسان دنیاوی اور اخروی فلاح حاصل کر سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے قوانین کے متعلق جب یہ کہا گیا کہ وہ نفس کی تقویت کا ذریعہ ہیں (۱۴/۲۴-۲۵) تو اس سے مراد یہ ہے کہ وہ نفس انسانی کی نشوونما اور اس کے توازن و استحکام کا ذریعہ بنتے ہیں اور اس طرح دنیا اور آخرت دونوں کی فلاح ان قوانین سے ہم آہنگی کے ذریعے ممکن ہے۔

Marfat.com

يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ
وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ ۙ وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ۠ ؕ
(۱۴/۲۷)

اللہ اہل ایمان کو اس قائم رہنے والی (اور پاک) بات کے ذریعے سے اس دنیاوی زندگی میں بھی ثبات بخشتا ہے اور آخرت کی زندگی میں بھی بخشے گا اور اللہ ظالموں کو ہلاک کرتا ہے اور اللہ جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے۔

اس کے برعکس ایسے اصول وضوابط یا قوانین جو احکام خداوندی سے متصادم ہوں وہ سخت ناپائیدار اور عارضی ہوتے ہیں جنہیں ہوا اڑائے پھرتی ہے انکا نہ کوئی نتیجہ نکلتا ہے اور نہ ہی یہ کوئی ثمر دیتے ہیں۔

وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةِ ۨ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ ؕ
(۱۴/۲۶)

اور بری بات کا حال برے درخت کی طرح ہے جسے زمین سے اکھاڑ کر (پھینک) دیا گیا ہو (اور) جسے (کہیں بھی) قرار نہ ہو۔

گویا یہ کہا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کائنات بالحق ان معنوں میں تخلیق کی ہے کہ یہ مثبت اور تعمیری نتائج اس صورت میں فراہم کرتی ہے جب ان قوانین کا اتباع کیا جائے جو مشیت خداوندی نے اس حوالے سے متعین کیے ہیں۔

یہاں یہ امر بے جا نہ ہوگا کہ ان بنیادی معاشی قوانین پر ایک نظر ڈال لی جائے جو ہمیں قرآن مجید سے ملتے ہیں اس حوالے سے دو (۲) امور کا تذکرہ لازم ہے۔ اول یہ کہ اسلام ایک مکمل وحدت ہے وہ جو اصول وضوابط یا بنیادی قوانین فراہم کرتا ہے وہ پوری زندگی پر محیط ہوتے ہیں اور معاشی پہلو چونکہ سماجی زندگی کا ہی ایک حصہ ہوتا ہے لہٰذا یہ اصول دیگر شعبوں کی طرح یہاں بھی اسی انداز میں لاگو ہوتے ہیں۔ اس کی وضاحت ایک بالکل بنیادی اصول کی مدد سے کی جاسکتی ہے۔ مثلاً قرآن مجید کی مجموعی تعلیمات کا سب سے اہم

Marfat.com

ترین اصول یہ ہے:۔

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ج (۶/۱۶۵)

کوئی بوجھ اٹھانے ولا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

اسی طرح اس حوالے سے دوسرا اصول یہ ہے۔

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ط (۵۳/۳۹)

انسان کیلئے اس کی سعی سے ماسوا کچھ نہیں۔

یہ دونوں اصول ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں اور جہاں عام انسانی افعال پر لاگو ہوتے ہیں بالکل اسی طرح معاشی قوانین کی اساس بھی بنتے ہیں۔اسی طرح دیگر اصولوں کا بھی معاملہ ہے لہٰذا معاشی حوالے سے ماسوا استثنائی صورت کے کوئی علیحدہ سے قوانین کا مجموعہ نہیں ہے۔

دوم یہ کہ جہاں تک ان اصولوں یا احکام وضوابط کا تعلق ہے جو اس حوالے سے قرآن مجید میں دیئے گئے ہیں وہ بلاشبہ تعداد میں محض چند ہیں۔تاہم یہ اصول تعداد میں کمی کے باوجود اتنے جامع اور ہمہ گیر ہیں کہ ان پر پورے اسلامی معاشی نظام کی عمارت استوار ہے۔ ویسے بھی اصولوں کی کمی بذات خود کوئی مسئلہ نہیں ہوتی اصل مسئلہ ان پر عمل درآمد کا ہوتا ہے۔ ایک عمومی طریق کے تحت بھی بنیادی اصول ہمیشہ سے معدودے چند ہی ہوا کرتے ہیں انہی گنے چنے اصولوں پر پورے نظاموں کی عمارت استوار ہوتی ہے مثال کے طور پر محاسبی (Accounting) جیسے وسیع وعریض علم کی بنیاد کل دس (۱۰) اصولوں پر ہے۔اسی طرح اس حوالے سے زبانوں کی مثال دی جاسکتی ہے ماسوائے مستثنیات کے زبان کے حروف تہجی کی تعداد بہت کم ہوتی ہے تاہم ان سے ہزاروں الفاظ پر مشتمل زبانیں تشکیل پاجاتی ہیں۔لہٰذا اس اعتراض کو کوئی وزن حاصل نہیں ہوسکتا کہ یہ اصول کم کیوں ہیں۔

جہاں تک معاشی حوالوں سے بنیادی اصولوں کا تعلق ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

Marfat.com

## i۔ اللہ اور اس کے رسول کی حکمرانی

ایک اسلامی معیشت وریاست میں حکمرانی صرف اور صرف اللہ اور اس کے رسول کی ہوتی ہے۔ اللہ کی حکمرانی سے مراد ام الکتاب یعنی قرآن مجید کی حکمرانی ہوتی ہے باالفاظ دیگر اس ریاست ومعیشت میں کوئی قانون خواہ اسکا تعلق معیشت سے ہو یا کسی بھی دیگر شعبے سے ایسا نہیں بنایا جاسکتا جو قرآن مجید سے متصادم ہو۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴)

جولوگ جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے (قرآن) اس کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے وہی کافر ہیں۔

اس کتاب کے علاوہ کسی کا اتباع جائز نہیں کیونکہ آخری اتھارٹی بہر حال قرآن مجید فرقان حمید ہی ہے۔

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۭ (۷/۳)

جو تمہاری طرف تمہارے رب کی طرف سے نازل کیا گیا ہے اسکا اتباع کرو اور اللہ کے سوا کسی کارساز ورفیق کا اتباع نہ کرو لیکن بہت تھوڑے ہیں جو نصیحت حاصل کرتے ہیں۔

جہاں تک رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کا تعلق ہے رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں اطاعت صرف اور صرف آپ ﷺ کی تھی لیکن آپ ﷺ کے بعد یہ حق اسلامی حکومت کو حاصل ہے جو اللہ کے احکامات کے مطابق ریاست اور معیشت چلاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اللہ اور رسول کی اطاعت کا حکم ساتھ ساتھ دیا گیا ہے۔

اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ (۴/۵۹)

اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔

اسی طرح ایک اسلامی ریاست اور معیشت میں احکامات اور اصول وضوابط کا بنیادی ماخذ قرآن مجید ہے انکا نفاذ اسلامی حکومت کی جانب سے عمل میں آئے گا اور عوام الناس پر ان کی اطاعت لازم ہے۔

### ii۔ مستقل اخلاقی اقدار

اللہ کی مختلف مثلاً صفات ربوبیت، رزاقیت اور رحمانیت وغیرہ کو دور حاضر کی اصطلاح میں مستقل اخلاقی اقدار کہا جاتا ہے۔ دین کی ساری عمارت انہی اخلاقی اقدار پر استوار ہے۔ اسلام انہی اخلاقی اقدار کا منبع ہے۔ ایسی اقدار جو مطلق ہیں اور زمان ومکان سے بے نیاز اور نتائج کے اعتبار سے یکساں ہیں۔ مثلاً ایفائے عہد ایک مستقل قدر ہے جس کی جتنی اہمیت سماجی نکتۂ نگاہ سے ہے اتنی ہی اہمیت معاشی نکتۂ نگاہ سے بھی ہے۔ اسی طرح دیگر اخلاقی اقدار مثلاً عدل اور احسان، اسراف وتبذیر سے اجتناب معاشرے اور معیشت دونوں میں یکساں اہمیت رکھتی ہیں۔ ایک اسلامی معیشت کی شناخت ہی یہ اخلاقی اقدار ہوتی ہیں۔

### iii۔ حلال وحرام کا تصور

اسلام کے معاشی نکتۂ نگاہ سے چند مخصوص کاروبار ایسے ہیں جن کی اجازت نہیں ہے لہٰذا ایک اسلامی معیشت میں انکا کوئی وجود نہیں ہو سکتا مثلاً کسی بھی قسم کا جوا، شراب کا کاروبار اور ربا پر مبنی کوئی بھی معاملت وغیرہ۔

### iv۔ نجی ملکیت کا حق

قرآن مجید بغیر کسی شک وشبہ کے نجی ملکیت کا حق تسلیم کرتا ہے یہ حق قرآن مجید کی ان چھیاسی (۸۶) آیات سے مستنبط ہے جن میں مختلف اشیاء مثلاً زرعی پیداوار، باغات (زمین نہیں)، سونا چاندی، مال واموال وغیرہ کی نجی ملکیت تسلیم کی گئی ہے۔ ان آیات کی کسی بھی حوالے سے تفسیر کی جائے ان آیات میں انسانوں کو عطا کئے جانیوالے اس خدائی

Marfat.com

حق کی نفی کسی صورت ممکن نہیں نہ ہی تاریخ سے اس قسم کی کوئی ایک مثال پیش کی جاسکتی ہے جس میں اس حق کی نفی کی گئی ہو۔ حتیٰ کہ ایسے مفسر حضرات جنہوں نے اس حق کو چیلنج کیا وہ بھی اپنے دعوے کے حق میں کوئی ایک دلیل بھی پیش نہیں کر سکے۔

چونکہ نجی ملکیت تسلیم کی گئی ہے لہٰذا نجی کاروبار اور منافع پر بھی کوئی قدغن عائد نہیں کی جاسکتی ماسوا اس کے کہ ایک اسلامی ریاست و معیشت میں کوئی ایسا کاروبار نہیں کیا جاسکتا جو حرام کے دائرے میں آتا ہو۔ یہ ایک بدیہی حق ہے جو قرآن انسانوں کو دیتا ہے لہٰذا معیشت کی کوئی بھی ایسی شکل مثلاً سوشلزم جو اس حق کی تنسیخ پر مبنی ہو قرآنی نکتۂ نگاہ سے ممکن نہیں ہے۔ اسی طرح ایسی قانون سازی جس سے اس حق کی نفی ہوتی ہو ممکن نہیں ہے۔ اس طرح کی کوشش فطرت سے جنگ کے مترادف ہے اور انسان فطرت کو ہرا نہیں سکتا یہ ممکن نہیں ہے۔

## ۷۔ معاوضہ محنت بقدر محنت

قرآن جہاں لامحدود نجی ملکیت کی اجازت دیتا ہے تو دوسری طرف صرف اس آمدنی کو جائز ٹھہراتا ہے جو انسان کی ذاتی محنت کا نتیجہ ہو۔

وَاَنۡ لَّیۡسَ لِلۡاِنۡسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی (۵۳/۳۹)

اور بے شک انسان کیلئے اس کی سعی سے ماسوا کچھ بھی نہیں۔

یہ آیت واضح اور دوٹوک انداز میں جہاں عام انسانی افعال کے بارے میں فیصلہ کن اتھارٹی ہے تو دوسری طرف انسانی سماج و معیشت کا سب سے بنیادی قانون ہے یعنی انسان کسی بھی ایسی چیز کو حاصل کرنے پر قادر ہی نہیں ہے جو اس کی محنت کا نتیجہ نہ ہو خواہ وہ مال و دولت ہو یا کوئی بھی دیگر شے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید سے ہمیں ''مکتسب آمدنی'' (Earned Income) جو انسانی محنت کا نتیجہ ہو، کا تصور تو ملتا ہے ''غیر مکتسب آمدنی'' (Unearned Income)

Marfat.com

کا کوئی تصور نہیں ملتا۔ یہاں ''مکتسب آمدنی'' سے مراد ایسی آمدنی ہے جو صرف اور صرف انسانی محنت کا نتیجہ ہو جبکہ غیر مکتسب آمدنی سے مراد ایسی آمدنی ہے جو ماسوا محنت کسی بھی ذریعے مثلاً کرایہ، سود، لگان، ٹھیکے وغیرہ سے حاصل ہوتی ہے۔ اس حقیقت کا اثبات قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیات سے ممکن ہے۔

وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَٰكِنُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُم (۹/۲۴)

بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارے رشتے دار وہ مال جو تم نے کمائے ہیں وہ تجارتیں جن کے خسارے سے تم ڈرتے ہو وہ مکان جن کو تم پسند کرتے ہو۔

اسی طرح سورۃ البقرہ میں اسی حوالے سے ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

يَٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوٓا أَنفِقُوا مِن طَيِّبَٰتِ مَا كَسَبْتُمْ (۲/۲۶۷)

اے اہل ایمان! جو کچھ تم نے کمایا ہے اس میں سے پاکیزہ چیزیں اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔

ان دونوں آیات میں قابل غور نکتہ یہ ہے کہ دونوں جگہوں پر یہ کہا گیا ہے کہ ''جو تم نے کمایا'' نہ کہ ''تمہیں حاصل ہونے والی آمدنی'' گویا صرف ذاتی کمائی کا تصور ہے کسی اثاثے سے حاصل ہونے والی آمدنی کا کوئی تصور پورے قرآن مجید کی کسی بھی آیت سے بلاواسطہ یا بالواسطہ اخذ نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا صرف محنت کا معاوضہ ممکن ہے۔

اس حوالے سے دوسری دلیل یہ ہے کہ اگر ان تمام اشیاء کا جائزہ لیا جائے جن کی قرآن نے نجی ملکیت تسلیم کی ہے تو وہ تمام تر وہ اشیاء ہیں جو صرف اور صرف انسانی محنت کا نتیجہ ہوتی ہیں مثلاً مال و دولت، سونا، چاندی، گھر، باغات اور زرعی اجناس وغیرہ۔ یہ تمام چیزیں انسانی محنت کا نتیجہ ہوتی ہیں لہٰذا ان کی نجی ملکیت تسلیم کی گئی ہے۔ پورے قرآن سے کسی ایسی شے کی نجی ملکیت ثابت نہیں کی جا سکتی جو انسانی محنت کا نتیجہ نہ ہو اور قرآن نے

Marfat.com

اسے نجی ملکیت میں دے دیا ہو یہ ممکن ہی نہیں ہے۔

ایسے ذرائع رزق جنہیں حرام قرار دیا گیا ہے ان سب میں واحد قدر مشترک یہی ہے کہ ان ذرائع سے حاصل ہونے والی آمدنی انسانی محنت کا نتیجہ نہیں ہوتی لہٰذا ان کا دروازہ مکمل طور پر بند کر دیا گیا ہے۔

يَآيُّهَا الَّذِينَ امَنُوٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (۵/۹۰)

اے اہل ایمان! شراب، جوا، بت اور فال کے تیر (یا پانسے) تو گندے شیطانی کام ہیں ان سے دور رہو تا کہ فلاح پاؤ۔

اس طرح ناپ تول میں کمی سے جو آمدنی حاصل ہوتی ہے ظاہر ہے وہ بھی کسی محنت کا نتیجہ نہیں ہوتی لہٰذا اس کے لئے بھی شدید وعید آئی ہے۔

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ۝ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ط (۳-۱/۸۳)

کم تولنے والوں کے لئے عذاب ہے جو تول کر لیتے ہیں تو خوب پورا لیتے ہیں اور جب دوسروں کو دیتے ہیں تو کم کر دیتے ہیں۔

اسی طرح کوئی بھی ایسا ذریعہ جہاں سے اس قسم کی آمدنی کا امکان ہو قرآن مجید اسکا دروازہ سختی سے بند کر دیتا ہے۔ مثلاً کسی یتیم کے مال کھانے کا معاملہ ہو یا قحبہ گری سے حاصل ہونے والی آمدنی سب کے لئے شدید وعید ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِىْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ؕ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا ط (۴/۱۰)

جو لوگ یتیموں کا مال ظلم سے کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں آگ بھرتے ہیں اور عنقریب وہ جہنم کی آگ میں جلیں گے۔

Marfat.com

یہی صورت حال قحبہ گری سے حاصل ہونے والی آمدنی کیساتھ بھی ہے۔

وَلَا تُكْرِهُوا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَاءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوا عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ط (۲۴/۳۳)

اورتم اپنی لونڈیوں کو بدکاری پر مجبور نہ کرو اگر وہ نیک رہنا چاہتی ہوں تاکہ تم ان کے ذریعے سے دنیاوی زندگی کا سامان جمع کرلو۔

یہی وہ بنیادی وجہ ہے جس کی وجہ سے قرآن مجید میں ہر قسم کے سرمایہ (Assets) کا معاوضہ حرام قرار دیا ہے۔ اس حوالے سے قرآن مجید میں جو اصطلاح استعمال کی گئی ہے وہ ''مال'' ہے جو ایک بہت جامع اصلاح ہے قرآن مجید میں اسے زر سے لے کر جملہ عام اثاثہ جات تک سب کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں یہ اصطلاح جملہ اثاثہ جات اور زر کے حوالے سے جن آیات میں استعمال کی گئی ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

خالصتاً زر کے معنوں میں (۲/۱۷۷)، (۲/۲۶۴)، (۹۲/۱۸)، (۲/۱۸۸)، (۹/۲۴) اور (۳۰/۳۹) وغیرہ۔

خالصتاً اثاثہ جات کے معنوں میں یہ اصلاح (۸۸/۱۰)، (۶/۱۷)، (۲۶/۸۸)، (۲/۱۰۴)، (۶/۹۰)، (۲/۲۴۷)، (۶/۱۵۳)، (۱۸/۴۶)، (۲۳/۵۵)، (۲۷/۳۶)، (۶۸/۱۴)، (۸۹/۲۰)، (۱۸/۳۴)، (۱۸/۳۹)، (۱۹/۷۷)، (۷۴/۱۲)، (۳/۱۰۴)، (۲/۱۱۱)، (۲/۱۵۵)، (۴/۱۰)، (۴/۱۶۱) وغیرہ میں استعمال کی گئی ہے۔

اس پس منظر میں ان آیات پر تدبر کرنا لازمی ہے جن میں ربا کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ یہ آیات مندرجہ ذیل ہیں۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ٥ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ (۲/۲۷۹-۲۷۸)

اے اہل ایمان! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اگر تم مومن ہو تو جتنا ربا میں بچ گیا ہو اسے چھوڑ دو اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے (برپا ہونے والی) جنگ کا یقین کر لو اگر تم ربا سے توبہ کر لو تو تمہارے لئے اصل اموال وصول کرنا جائز ہے (اس صورت میں) نہ تم ظلم کرو گے نہ تم پر ظلم ہوگا۔

ان آیاتِ کریمہ میں جو تدبر طلب پہلو ہیں وہ یہ ہیں۔

۱۔ ربا کی مد میں باقی تمام رقم چھوڑ دینے کا حکم ہے کوئی مومن اس مد میں ایک پیسہ بھی وصول نہیں کر سکتا لہٰذا اس حوالے سے نام نہاد سود اور مہاجنی سود کی بحث ہی بے معنی ہو جاتی ہے جب کسی قسم کی کوئی اضافی رقم وصول نہیں کی جا سکتی تو یہ کہنا کہ اتنی رقم وصول ہو سکتی ہے اتنی نہیں کار لا حاصل ہے۔

۲۔ توجہ طلب امر یہ ہے کہ ان آیات میں ہر قسم کے اموال کی بابت یہ کہا گیا ہے کہ صرف اصل مال واپس لیا جا سکتا ہے۔ آیت کے الفاظ پر غور کیجئے رء وس اموالکم ''تمہارے اصل اموال'' صرف ان کو واپس لینے کو کہا گیا ہے پیچھے وضاحت کی جا چکی ہے کہ قرآن مجید میں مال کی اصطلاح زر سے لیکر ہر قسم کے اثاثے کیلئے استعمال کی گئی ہے۔ اس پس منظر میں جب قرآن مال کی جمع اموال کا لفظ استعمال کرتا ہے تو اسکا مطلب واضح ہے یعنی کسی بھی قسم کا اثاثہ۔ اسے کسی کو دینے کے بعد صرف اس کی اصل شکل میں واپسی ممکن ہے اس سے زائد نہیں۔ اس بنیاد پر ربا کی تعریف ان الفاظ میں کی جا سکتی ہے۔

''ربا سے مراد وہ اضافی رقم ہے (قطع نظر نوعیت اور مقدار کے) جو سرمایہ (کسی بھی نوعیت کے اثاثہ جات بمعہ زر) کا مالک اپنے سرمایہ کو ایک خاص مدت کے لئے کسی دوسرے کو استعمال میں دینے (بلا استثنیٰ مقصد استعمال) کے عوض وصول کرتا ہے خواہ یہ اضافہ معاہدے کا حصہ ہو یا نہ ہو۔''

اس بنیاد پر نہ کرایہ نہ مضاربہ، نہ ٹھیکیداری نظام اور نہ ہی زمین کے لگان کی کوئی گنجائش

Marfat.com

پچتی ہے۔ لہٰذا ایک بنیادی اصول جو پوری نوع انسانی کے لئے ہے وہ یہ ہے کہ کوئی بھی انسان بہ حیثیت انسان صرف اور صرف اپنے ہاتھوں کی کمائی پر قادر ہے اس سے زائد نہیں۔

اس حوالے سے یہ امر بھی ذہن نشین رہنا چاہیے کہ یہ حکم یعنی محنت سے کمائی کا حکم پوری نوع انسانی کے لئے ہے جو انسان جب بھی اور جہاں بھی اس حکم سے انحراف کرے گا وہ انتہائی بدترین نتائج کا سامنا کرے گا۔ یہی وجہ ہے کہ جب انسانوں کے لئے یہ کہا گیا کہ انسان کے لئے صرف وہی ہے جس کے لئے اس نے کوشش کی تو ایسا نہ کرنے والوں بالفاظ دیگر ماسوا محنت دیگر ذرائع سے رزق یا آمدنی حاصل کرنے والوں کو بھی بہ حیثیت انسان بدترین نتائج سے آگاہ کیا گیا ہے۔

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ وَاَمْرُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (۲/۲۷۵)

جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ (بالکل) اسی طرح کھڑے ہوتے ہیں جس طرح وہ شخص کھڑا ہوتا ہے جس پر شیطان (سانپ) کا سخت حملہ ہوا ہو یہ اس وجہ سے ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ (خریدو) فروخت (بھی تو) بالکل ربا کی طرح ہے حالانکہ اللہ نے (خریدو) فروخت کو حلال کیا ہے۔ اور ربا کو حرام قرار دیا ہے تو جس شخص کے پاس اللہ کی نصیحت پہنچی اور وہ باز آگیا تو جو پہلے ہو چکا اسکا معاملہ اللہ کے سپرد اور جو پھر لینے لگا تو ایسے لوگ جہنمی ہیں جس میں وہ ایک (بہت) طویل مدت رہیں گے۔

اس آیت کریمہ میں ربا (کوئی بھی غیر مکتسب آمدنی) وصول کرنے کے جو تباہ کن

Marfat.com

نتائج بیان کیے گئے ہیں ان پر تفصیلی بحث ساتویں باب میں رزق کی بست کے پہلے قانون بہ عنوان ''اللہ کے ذکر سے اعراض سے معیشت تنگ ہو جاتی ہے'' میں کی گئی ہے۔ فی الحال جو توجہ طلب نکتہ ہے وہ یہ ہے کہ اس آیت میں خطاب پوری نوع انسانی ہے کسی خاص گروہ یا افراد سے نہیں۔ آیت کے ابتدائی الفاظ ''جو لوگ ربا کھاتے ہیں'' اس امر کی صریح شہادت ہیں کہ کوئی بھی انسان جب بھی، جہاں بھی ''ربا وصول'' کرے گا اسے انہیں شدید بدترین نتائج کا سامنا کرنا ہوگا جو اس آیت میں بیان کیئے گئے ہیں۔ گویا کسی بھی انسان کے بس میں یہ نہیں کہ وہ اپنی محنت سے زائد کچھ بھی حاصل کر سکے۔ یہ تقدیر پوری بنی نوع انسان کیلئے ہے، کسی خاص گروہ انسانی کے لئے نہیں۔

## vi۔ انفاق

معیشت اور معاشرت دونوں حوالوں سے یہ ایک اور اساسی نوعیت کا حکم ہے اس سے مراد ہے زائد از ضرورت تمام دولت و آمدنی کو اللہ کی راہ میں کھلا رکھنا ہے۔ اس نکتے پر تفصیلی بحث چھٹے باب میں رزق کی کشاد کے تیسرے قانون بہ عنوان 'خدا سے ڈرنے والوں، توکل کرنے والوں، نمازیوں اور انفاق کرنے والوں کے لئے باعزت رزق'' کے تحت کی گئی ہے۔

## vii۔ تقسیم دولت میں مساوات

ایک بنیادی قرآنی حکم ہے کہ

لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ ؕ (۵۹/۷)

دولت تم میں سے امراء کے درمیان نہ گھومتی رہے۔

بالفاظ دیگر دولت کی منصفانہ تقسیم حکم ربی ہے۔ اس مقصد کے لئے ظاہر ہے ہر حکومت اپنے اپنے حالات کے تناظر میں حکمت عملی اختیار کر سکتی ہے تاہم اس اصول سے انحراف ممکن نہیں۔

سن ۱۵۱۰ ء

Marfat.com

## viii۔ معاشرے کے معاشی لحاظ سے پس ماندہ طبقات کی دستگیری

معاشرے کے معاشی لحاظ سے پس ماندہ طبقات کی دستگیری معاشرے کے خوشحال لوگوں پر بہ حیثیت فرض عائد ہوتی ہے۔ اس فرض سے کوئی فرار ممکن نہیں۔ یہ ایک لازمی فریضہ ہے۔ اس نکتے پر تفصیلی بحث ساتویں باب میں رزق کی بستگی کے پانچویں قانون بہ عنوان "سماجی تحفظ کے نظام کی عدم موجودگی سے رزق کی تنگی" کے تحت کی گئی ہے۔

یہ وہ بنیادی معاشی قوانین ہیں جو قرآن مجید ہمیں فراہم کرتا ہے انہی قوانین کی بنیاد پر اگر کوئی معاشرہ اور معیشت ترتیب دی جاتی ہے تو وہ حقیقی معنوں میں دنیاوی اور اخروی فلاح حاصل کر سکے گی۔ یہ بات پوری احتیاط اور ذمے داری سے کہی جاسکتی ہے کہ اگر معاوضہ صرف محنت کا تسلیم کیا جائے اور تمام زائد از ضرورت دولت اللہ کی راہ میں کھلی رکھی جائے تو صرف یہی دو امور معیشت اور معاشرے کی تقریباً تمام برائیوں کا سد باب کرنے کے لئے بہت کافی ہیں۔ صرف آزمائش شرط ہے۔

## ۳۔ انسان کے بارے میں تصور

جہاں تک انسان کا تعلق ہے انسان یقیناً اشرف المخلوقات نہیں ہے تاہم اسے اللہ نے اپنی اکثر مخلوقات پر برتری دی ہے۔

وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا (۱۷/۷۰)

اور (نوع انسانی کو) اپنی بہت سی مخلوقات پر فضیلت دی۔

نوع انسان کو اللہ نے واجب التکریم بنایا ہے۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (۱۷/۷۰)

ہم نے بنی آدم کو واجب التکریم بنایا۔

انسان کی تخلیق کا بنیادی مقصد اللہ کی اطاعت ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (۵۱/۵۶)

Marfat.com

ہم نے انسانوں اور جنات کو اپنی اطاعت کے لئے پیدا کیا۔

اطاعت سے مراد ان قوانین خداوندی کی اطاعت ہے جنہیں سنۃ اللہ کہا گیا۔ اگر یہاں یہ سوال پوچھا جائے کہ اس اطاعت کا حاصل یا مقصد کیا ہے؟ تو اس کا سیدھا سادا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نفس کی شکل میں ہر انسان کو ایک بیش بہا دولت عطا کی ہے جو قطعی متوازن لیکن مضمر اور خوابیدہ شکل میں انسان کو ملتی ہیں۔ انسانی زندگی کا بنیادی مقصد نفس کے اس توازن کو برقرار رکھنا اسے نشوونما اور ترقی دینا ہے۔ اقبال کی اصطلاح میں اسے تعمیر خودی کہا جاسکتا ہے۔ (از روئے قرآن اس توازن کی برقراری یا نفس کی نشوونما کا بنیادی ذریعہ یا وسیلہ انسان کے معاشی افعال ہیں)۔ یہ مقصد صرف اور صرف سنۃ اللہ کی اطاعت سے ہی حاصل ہوسکتا ہے۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے تیسرا باب)۔ بالفاظ دیگر قوانین خداوندی سے مکمل ہم آہنگی اسی کو تقویٰ کہا جاتا ہے۔ تقویٰ کا مادہ وق ی ہے اس کے بنیادی معنی کس چیز کی حفاظت کرنا، نگہبانی اور نگہداشت کرنا اور اسے مضر اور تکلیف دہ چیزوں سے بچانا ہے۔ قرآن مجید میں کئی مقامات پر واتقو اللہ کے الفاظ آئے ہیں جس کے معنی ہیں اللہ کا تقویٰ اختیار کرنا یا بالفاظِ دیگر احکام خداوندی کا اتباع کرنا ہیں۔ سورۃ مائدہ میں اسے عدوان کے مقابلے میں استعمال کیا گیا ہے۔ (۵/۲) جس کے معنی سرکشی اور نافرمانی کے ہیں۔ سورۃ آل عمران میں اس کی مزید تصریح یہ کہہ کر کردی گئی ہے جہاں ارشاد ربانی ہے۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ (۳/۱۰۲)

اے اہل ایمان! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جیسا کہ تقویٰ اختیار کرنے کا حق ہے۔

سورۃ شعرا میں متقین کے مقابلے میں غاوین آیا ہے (۲۶/۹۰-۹۱) جس کے معنی قوانین خداوندی سے انحراف یا راہِ حق کو چھوڑ کر دیگر راہ اختیار کرنے کے ہیں۔ اس سے

تقویٰ کے معنی مزید واضح ہوجاتے ہیں۔ لہٰذا متقی سے مراد وہ شخص ہوگا جو قوانین خداوندی کی کامل اطاعت کرے اور اس سے انحراف نہ کرے۔ درحقیقت یہی وہ واحد راہ ہے جو تعمیری نتائج (انسانی ذات کی تعمیر) کی طرف جاتی ہے باقی تمام راہیں خواہ وہ کوئی ہوں انکا انجام صرف اور صرف تباہی ہے اسی وجہ سے قرآن مجید اہل علم و عقل کو خاص طور پر اپیل کرتا ہے کہ وہ صرف اور صرف تقویٰ کی راہ اختیار کریں۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ۖۚ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (۶۵/۱۰)

اے عقل والو! جو ایمان لائے ہو اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔

بالفاظ دیگر قرآن کی اپیل عقل و بصیرت سے ہے کہ صرف یہی راہ کامیابی کی ہے لہٰذا اسے اختیار کیا جانا چاہیے اسی کو خدا کے رنگ میں رنگنا کہا جاتا ہے۔

صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۫ وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ (۲/۱۳۸)

کہہ دو کہ ہم نے اللہ کا رنگ اختیار کرلیا ہے اور اللہ سے بہتر رنگ کس کا ہوسکتا ہے اور ہم اسی کی عبادت کرنیوالے ہیں۔

تاہم اللہ تعالیٰ نے خود انسان کو یہ اختیار دیا ہے کہ اگر وہ یہ راہ اختیار نہ کرنا چاہے تو وہ اپنی مرضی سے جو راہ چاہے اختیار کرلے۔ اس حوالے سے اسے مکمل اختیار حاصل ہے۔ کیونکہ اللہ ہی نے انسان کو وہ شعور عطا کیا ہے جس کی مدد سے وہ جو چاہے راہ اختیار کرسکتا ہے۔

الَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى ۙ وَالَّذِيْ قَدَّرَ فَهَدٰى (۸۷/۲-۳)

جس نے (انسان کو) خلق کیا پھر (اس کے اعضاء کو) درست کیا اور جس نے اسکا اندازہ ٹھہرایا (پھر اس کو) راستہ بتایا۔

اس حقیقت کو سورۃ البلد میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

Marfat.com

اَلَمۡ نَجۡعَلۡ لَّهٗ عَيۡنَيۡنِۙ ○ وَلِسَانًا وَّشَفَتَيۡنِۙ ○ وَهَدَيۡنٰهُ النَّجۡدَيۡنِ ۚ
(۹۱/۸۔۱۰)

بھلا ہم نے اس کو دو آنکھیں نہیں دیں؟ اور زبان اور دو ہونٹ (نہیں دیئے) اور اس کو (خیر و شر کے) دونوں راستے بھی دکھا دیئے۔

سورۃ الیل میں اس حوالے سے ارشاد ربانی ہے۔

وَنَفۡسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ○ فَاَلۡهَمَهَا فُجُوۡرَهَا وَتَقۡوٰىهَا (۹۲/۷۔۸)

اور انسان کی اور اس کی (قسم) جس نے اسکے اعضاء کو برابر کیا پھر اس کو بدی اور تقویٰ کی سمجھ دی۔

متذکرہ بالا آیات اور دیگر متعدد آیات سے بھی یہ واضح نتیجہ مستنبط ہوتا ہے کہ نوع انسانی کو اللہ نے خلق کرنے کے بعد اسے اختیار و ارادہ کی دولت عطا کی اور نیک و بد میں امتیاز کرنے کا شعور بھی دیا۔ اب یہ انسان کی مرضی ہے کہ وہ خالق دو جہاں کی بتائی ہوئی راہ مستقیم پر چلنا چاہتا ہے یا کوئی بھی انحراف کی شکل اختیار کرنا چاہتا ہے۔ انسانی اختیار و ارادہ کے حوالے سے تفصیلی بحث دوسرے باب میں کی گئی ہے۔

ایسے لوگ جو اللہ پر ایمان لاتے ہیں اس کی اطاعت و بندگی اختیار کرتے ہیں مومن/مسلمان کہلاتے ہیں دوسری طرف ایسے افراد جو اپنی مرضی سے اسلام کی راہ کے علاوہ کوئی بھی دیگر راہ اختیار کرتے ہیں وہ کفار میں شمار کئے جاتے ہیں۔

## ۴۔ خدا، انسان اور کائنات کا باہمی تعلق

جیسا کہ عرض کیا گیا اللہ ایک کامل ترین ہستی ہے اسی نے یہ کائنات خلق کی ہے اور جاندار اور بے جان تمام اشیاء کے لئے قوائد و ضوابط متعین کر دیئے۔ انسان کو شعور کیساتھ ارادہ و اختیار کی قوت بھی دی۔ اسے اس کی زندگی کا مقصد بھی بتا دیا اس مقصد کے حصول کی راہ کی بھی نشاندھی کر دی اور ساتھ ہی کائنات کو خام حالت میں پیدا کیا اور اسے انسان کی

Marfat.com

صوابدید پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ اس کی تعمیر کرتا ہے یا تخریب۔ اگر انسان ایسے افعال انجام دیتا ہے جن سے اس کائنات کی تعمیر ہوتی ہے تو یہ افعال خود اس کی خودی کی تعمیر کا ذریعہ بھی بنتے ہیں اور برعکس صورت میں صورت حال برعکس ہو جاتی ہے یعنی تخریبی افعال سے انسانی خودی بھی برباد ہو جاتی ہے۔ وہ لوگ جو مومن ہیں وہ اس کائنات کو کارگہ عمل کی حیثیت سے لیتے ہیں اور اللہ کے قوانین کی اطاعت کے ذریعے اپنی دنیا اور آخرت دونوں سنوار لیتے ہیں۔ اس طرح مومن کیلئے یہ خام کائنات اس کی تعمیر خودی کا ذریعہ بنتی ہے اور اس مقصد کیلئے وہ ایک مبنی بر عدل اور اخلاقی اقدار سے بہرہ ور معاشرے کی تشکیل کی جدوجہد کرتا ہے جو ایک اعلیٰ سطحی سرگرمی ہے۔

جبکہ اس کے برخلاف جو لوگ اللہ پر ایمان نہیں رکھتے ان کے نزدیک یہ کائنات ایک عارضی فائدے کی جگہ ہے۔ نفسِ امارہ کی خواہشات کی تکمیل انکا مقصود و منتہا ہوتا ہے۔ خواہ خواہشات کتنی ہی پست کیوں نہ ہوں انہیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ وہ اسی دنیا کے ہو جاتے ہیں بالفاظِ دیگر زادِ راہ کو منزل سمجھ لیتے ہیں اور اسی کو جمع کرنے اور ضرب دینے میں زندگی گذار دیتے ہیں اس کارگہ عمل کو سیر و تفریح کا ذریعہ سمجھتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ لذت کے حصول کو زندگی کا مقصدِ اولیٰ قرار دے دیتے ہیں۔ وہ حیات کو اس سنجیدگی سے نہیں لیتے جس سنجیدگی کا وہ ان سے تقاضہ کرتی ہے۔ نتیجتاً حیات بھی انہیں خاطر میں نہیں لاتی اور وہ کارگہ حیات میں خس و خاشاک بن کر ضائع ہو جاتے ہیں۔

اس طرح انسانوں کے یہ دو گروہ دو (۲) الگ الگ راہوں کے مسافر ہوتے ہیں۔ اول الذکر کائنات کو اس حوالے سے دیکھتا ہے کہ وہ اس کی جتنی زیادہ سے زیادہ تعمیر کرے گا وہ اس کے لئے بہتر ہے کیونکہ اسے پتہ ہے کہ کائنات برحق ہے یعنی ٹھوس نتائج پیدا کرنے والی ہے لہٰذا اس کے لئے یہ کائنات بے معنی نہیں بلکہ با مقصد ہوتی ہے۔ جبکہ ثانی الذکر اسے محض اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ ظاہر ہے جو جس قسم کا لائحہ عمل

Marfat.com

اختیار کرتا ہے اسی قسم کی تقدیر اس پر منطبق ہو جاتی ہے اور اسی قسم کے نتائج کا اس کو سامنا کرنا ہوگا۔ اول الذکر دنیا اور آخرت دونوں کی فلاح حاصل کرتے ہیں جبکہ ثانی الذکر محض ایک عارضی منفعت اور پھر دائمی خسارہ۔

Marfat.com

باب دوم

# انسانی اختیار و ارادہ

جب کسی بھی حوالے سے کسی قاعدے یا قانون کی بات کی جاتی ہے تو یہ بات اسی تناظر میں ممکن ہے کہ انسان کو ارادہ و اختیار حاصل ہو۔ عقیدۂ جبر کی موجودگی میں کسی قائدے یا قانون پر بحث ہی کارِلا حاصل ہے کیونکہ جب سب کچھ پہلے سے طے شدہ اور متعین ہے تو ظاہر ہے جزا اور سزا کے کوئی معنی نہیں رہ جاتے نہ صرف جزا اور سزا کے کوئی معنی نہیں رہ جاتے بلکہ خود خدا کے متعلق بہت عجیب و غریب تصوّر پیدا ہوتا ہے جس کے تحت وہ خود اپنی مخلوقات میں سے کسی پر انعام و اکرام کرتا ہے کسی پر ظلم پہ ظلم کیئے چلا جاتا ہے اور انسان کا کوئی پرسانِ حال نہیں۔ بالفاظِ دیگر نعوذ باللہ کوئی قواعد و ضوابط یا اصول نہیں اللہ کا جو دل چاہتا ہے کرتا ہے اور اپنی مصلحت وہ خود ہی بہتر جانتا ہے۔

یقیناً ایسا ہرگز نہیں ہے دورِ ملوکیت میں تو اس قسم کے خدا کا تصوّر ایک ''سیاسی مجبوری'' تھا تا کہ ''ظل الہیٰ'' کے اقدامات کو جواز فراہم کیا جا سکے لیکن آج بہرحال اس قسم کی کوئی ''مجبوری'' نہیں ہے۔ مزید برآں جب رزق کی بست و کشاد کے قوانین کے حوالے سے بات کی جائے تو قانون کی موجودگی صرف ارادہ و اختیار سے ہی ممکن ہوا کرتی ہے لہٰذا یہ ضروری ہے کہ پہلے اس حوالے سے یہ وضاحت کردی جائے کہ از روئے قرآن انسان کو اختیار و ارادہ کی قوت حاصل ہے بصورتِ دیگر لفظ قانون کے کوئی معنی ہی نہیں رہ جاتے۔

جیسا کہ گذشتہ باب میں عرض کیا گیا کائنات اور انسان دونوں کی تخلیق بامقصد ہے اور مقصد ارادہ و اختیار سے مشروط ہوتا ہے۔ اگر انسان کو ایک مقصد دینے کے بعد ارادہ و اختیار نہ دیا جاتا تو یہ ایک قطعی بے معنی بات تھی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں کئی مقامات پر قطعی واضح اور دو ٹوک انداز میں اس امر کی صراحت کی گئی ہے کہ انسان کو اختیار و ارادہ کی نعمت دی گئی ہے اور وہ اس نعمت کو استعمال کرنے میں مکمل آزاد بھی ہے۔

Marfat.com

انسان تو پھر انسان ہے از روئے قرآن یہ زمین اور پوری کائنات نہ صرف یہ کہ باشعور ہے بلکہ ارادہ واختیار کی بھی حامل ہے اس حقیقت کا اثبات مندرجہ ذیل آیتِ قرآنی سے ہوتا ہے۔

ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ وَهِىَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا قَالَتَآ اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ (۴۱/۱۱)

پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور وہ دھواں تھا تو اس نے اس سے اور زمین سے فرمایا کہ دونوں آؤ (خواہ) خوشی سے خواہ ناخوشی سے انہوں نے کہا کہ ہم خوشی سے آتے ہیں۔

یہ آیت سادہ طور پر اس امر کی گواہ ہے کہ زمین اور کائنات دونوں باشعور ہیں جہاں تک زمین کے باشعور ہونے کا تعلق ہے اس پر تو سائنس مہر تصدیق ثبت کر چکی ہے کائنات تک ابھی سائنس کی رسائی ہی نہیں لیکن اس حوالے سے قرآن کی گواہی بہت کافی ہے۔ زمین اور کائنات نہ صرف یہ کہ باشعور ہیں بلکہ انہیں ارادہ واختیار بھی حاصل ہے آیت (۴۱/۱۱) میں اللہ تعالیٰ کا ان دونوں سے خطاب اور ان دونوں کا اپنی مرضی سے آنا اس امر کی کھلی شہادت ہے کہ انہیں اختیار وارادہ حاصل ہے اور انہوں نے اپنی رضا سے اللہ کو لبیک کہا۔ مقامِ تدبر یہ ہے کہ جب زمین اور کائنات کو ارادہ واختیار کی دولت اللہ نے عطا کی ہے تو کیا انسان کو اس دولت سے محروم رکھا گیا ہوگا؟ ارادہ واختیار کے بغیر انسانی تخلیق کے کوئی معنی ہی نہیں رہتے کیونکہ اگر انسان کو یہ قوت حاصل نہ ہو تو سزا اور جزا کے کوئی معنی ہی نہیں رہتے۔ صرف سزا اور جزا تصوّر کی موجودگی ہی اس امر کی شہادت ہے کہ انسان کو ارادہ واختیار کی صلاحیت حاصل ہے۔

اس حوالے سے ایک دلیل یہ بھی ہے کہ یہ پوری کائنات مخصوص اصول وضوابط یا قوانین کی پابند ہے۔ یہ قوانین چاہے طبعی دنیا سے متعلق ہوں یا انسان کی سماجی دنیا سے قطعی

Marfat.com

غیر لچکدار ہیں۔ یہاں توجہ طلب امر یہ ہے کہ قانون خود کس چیز کا غماض ہے؟ یہی کہ اگر ایسا کیا جائے تو ایسا ہوگا۔ یہ حقیقت بذاتِ خود اس امر کا ثبوت ہے کہ انسان کو ارادہ و اختیار حاصل ہے کیونکہ انسان اپنے ارادے سے ہی یہ فیصلہ کرتا ہے کہ اسے ایسا کرنا چاہیئے یا نہیں کرنا چاہیئے اور اس فیصلے کے مطابق اسی قسم کا قانون اس پر منطبق ہو جاتا ہے۔ اگر انسان کے پاس اختیار و ارادہ کی قوت نہ ہوتی تو انسانی دنیا میں کوئی قانون بھی نہ ہوتا کیونکہ جانوروں کے لیے کسی قاعدے یا قانون کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس حوالے یہ نکتہ بھی قابلِ تدبر ہے کہ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر کہا گیا ہے کہ اللہ ہر شے پر قادر ہے۔

أَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ (۲/۲۵۹)

بے شک اللہ تمام اشیاء (کے پیمانوں) پر قادر ہے۔

اسی طرح (۲۲/۶)، (۲/۲۸۴) اور دیگر مقامات پر بھی یہ مضمون دہرایا گیا ہے تاہم توجہ طلب امر یہ ہے کہ ان تمام مقامات پر لفظ ''اشیاء'' استعمال کیا گیا ہے انسان نہیں کہا گیا۔ یہ صورتِ حال سیدھے سادے انداز میں اس امر کی غماض ہے کہ تمام اشیاء کائنات اللہ تعالیٰ کے پیمانوں (قوانین) کے مطابق چلنے کے لیے مجبور ہیں لیکن انسان بہر حال مجبور نہیں ہے۔ اللہ نے انسان کو اشیاء کی طرح تقدیرات کا پابند نہیں کیا ہے اسے ارادہ و اختیار کی دولت سے نوازا ہے اقبال کے الفاظ میں:

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات
مومن فقط احکام الٰہی کا ہے پابند

قانون کی موجودگی بذاتِ خود انسانی اختیار و ارادے کی قوت کی مظہر ہے۔ اس حوالے سے قرآن کریم میں سے کئی آیات پیش کی جا سکتی ہیں جو قانون کی اساس پر مبنی ہیں یعنی اگر ایسا کرو گے تو نتیجہ ایسا ہوگا۔ یہ آیاتِ کریمہ انسانی اختیار و ارادہ کا کھلا کھلا اظہار ہیں۔

ا۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور صالح اعمال کیئے ان کے لیے جنت کے باغ ہیں۔ (۲/۸۲)، (۲/۲۵)

Marfat.com

باالفاظِ دیگر اگر ایمان لاؤ گے اور اعمال صالح کرو گے تو جنت کے حقدار ہو گے۔

۲۔ جو لوگ میری ہدایت کی پیروی کریں گے نہ ان کو کوئی خوف ہوگا نہ وہ غمناک ہوں گے۔ (۲/۳۸)

۳۔ جو لوگ اپنا مال خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں پھر اس کے بعد اس کا کسی پر احسان نہیں دھرتے نہ کسی کو تکلیف دیتے ہیں ان کا اجر ان کے رب کے پاس محفوظ ہے نہ ان کو خوف ہوگا نہ وہ غمگین ہوں گے۔ (۲/۲۶۲)

یعنی اگر اللہ کی راہ میں مال خرچ کیا جائے گا تو اس کا نتیجہ خوف وحزن سے تحفظ کی صورت میں سامنے آئے گا۔

۴۔ نہ تم ظلم کرو گے نہ تم پر ظلم کیا جائے گا۔ (۲/۲۷۹)

یعنی اگر تم ظلم کرو گے تو تم پر ظلم ہوگا۔

۵۔ اگر کتاب کے بعض حصوں کا اتباع کرو گے اور بعض سے انکار کرو گے تو اس دنیا میں ذلیل وخوار ہو گے اور آخرت میں بھی سخت عذاب میں مبتلا ہو گے۔ (۲/۸۵)

۶۔ اگر وہ ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو خدا سے بہت اچھا صلہ پاتے۔ (۲/۱۰۳)

۷۔ تم مجھے یاد رکھو میں تمہیں یاد کرتا رہوں گا اور میرا شکر ادا کرو اور میری ناشکری نہ کرنا۔ (۲/۱۵۲)

اس آیت کریمہ میں قطعی واضح اور دوٹوک انداز میں کہہ دیا گیا ہے کہ اگر تم مجھے (اللہ کو) یاد رکھو گے اس کا ذکر کرو گے تو میں (اللہ تعالیٰ) تمہیں یاد رکھوں گا۔

۸۔ اگر تم مومن ہو تو تم ہی غالب رہو گے۔ (۳/۱۳۹)

۹۔ اگر تم اللہ کی راہ میں مارے جاؤ یا مر جاؤ تو یقیناً اللہ کی رحمت اور بخشش اس سے جو وہ جمع کرتے ہیں کہیں بہتر ہوگی۔ (۳/۱۵۷)

Marfat.com

۱۰۔ اگر اللہ تمہاری مدد کرے تو کوئی تم پر غالب نہیں آ سکتا اور اگر وہ تمہاری مدد چھوڑ دے تو کوئی تمہاری مدد کرنے والا نہیں ہے۔ (۳/۱۶۰)

۱۱۔ اگر تم ایمان لاؤ گے اور تقویٰ اختیار کرو گے تو تمہیں بڑا اجر ملے گا۔ (۳/۱۷۹)

۱۲۔ اگر تم کبائر (گناہ کبیرہ) سے بچو گے تو ہم تمہارے عیب دور کر دیں گے اور تمہیں معزز مقام عطا کریں گے۔ (۴/۳۱)

۱۳۔ اگر اہل کتاب ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ضرور ان کی برائیاں ان سے دور کر دیتے اور انہیں نعمتوں والے باغوں میں داخل کرتے۔ (۵/۶۵)

۱۴۔ اگر وہ تورات اور انجیل اور جو کچھ ان کے رب کی طرف سے ان پر اتارا گیا ہے کا اتباع کرتے تو ضرور انہیں فراواں رزق ملتا۔ (۵/۶۶)

۱۵۔ اگر ان بستیوں کے رہنے والے ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم آسمان اور زمین سے ان پر برکتوں کے دروازے کھول دیتے۔ (۷/۹۶)

۱۶۔ جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اپنے ایمان کو ظلم سے مخلوط نہیں کیا انہی لوگوں کے لیے امن مقدر ہے اور وہی ہدایت پانے والے ہیں۔ (۶/۸۲)

۱۷۔ اے اہل ایمان! اگر تم اللہ کا تقویٰ اختیار کرو گے تو وہ تمہارے لیے بڑے امتیاز کا سامان پیدا کر دے گا اور تمہاری کمزوریوں کو دور کر دے گا۔ (۸/۲۹)

۱۸۔ آپ کفار سے کہہ دیجئے کہ اگر وہ باز آ جائیں تو جو وہ پہلے کر چکے ہیں وہ معاف کر دیا جائے گا اور اگر وہ (پھر انہی کرتوتوں کی طرف) لوٹیں گے تو پہلے لوگوں کی جو سنت گذر چکی ہے (وہی ان کے ساتھ بھی دہرائی جائے گی)۔ (۸/۳۸)

۱۹۔ یہ (عذاب) تمہارے گذشتہ کرتوتوں کا نتیجہ ہے اور اللہ اپنے بندوں پر ذرا بھی ظلم نہیں کرتا۔ (۸/۵۱)

۲۰۔ اگر تم میں بیس ثابت قدم رہنے والے ہوں گے تو وہ دو سو پر غالب آ جائیں گے اور

اگر سو ثابت قدم رہنے والے ہوں گے تو ایک ہزار کفار پر غالب آ جائیں گے۔ (۸/۶۵)

۲۱۔ اگر تم منہ پھیرو گے تو وہ تمہاری جگہ اور لوگوں کو لے آئے گا۔ (۴۷/۳۸)

۲۲۔ جو ہمارے ذکر سے اعراض برتے گا اس کی روزی تنگ ہو جائے گی۔ (۲۰/۱۲۴)

۲۳۔ جو میری ہدایت کی پیروی کرے گا وہ نہ گمراہ ہو گا نہ تکلیف میں پڑے گا۔
(۲۰/۱۲۳)

۲۴۔ اور جو شخص حد سے نکل جائے اور اپنے رب کی آیات پر ایمان نہ لائے ہم اس کو ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں۔
(۲۰/۱۲۷)

۲۵۔ اگر تم شکر کرو گے تو میں تمہیں زیادہ دوں گا اور اگر ناشکری کرو گے تو میرا عذاب بہت سخت ہے۔
(۱۴/۷)

۲۶۔ جس نے اللہ کی راہ میں مال دیا اور تقویٰ اختیار کیا اور نیک بات کو سچ جانا اس کو ہم آسان طریقے کی توفیق دیں گے اور جس نے بخل کیا اور لاپرواہ بنا رہا اور نیک بات کو جھوٹ جانا اسے سختی پہنچائیں گے۔
(۹۲/۵۔۱۰)

۲۷۔ اور جس طرح کی نیکی یہ کریں گے اس کی ناقدری نہیں کی جائے گی اور اللہ متقین کو خوب جانتا ہے۔
(۳/۱۱۵)

متذکرہ بالا آیات قرآن مجید کی ان کئی آیات میں سے محض چند ہیں جہاں بنیادی استدلال یہ ہے کہ "اگر ایسا کرو گے تو ایسا ہوگا"۔ ظاہر ہے کہ ان آیات سے انسانی اختیار و ارادہ کے پہلو کو کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اسی حوالے سے ان تمام اقوام کی تباہی کے اسباب کا اگر تجزیہ کیا جائے جن کا ذکر قرآن مجید میں کیا گیا ہے تو وہاں بھی قرآن مجید نے پہلے ان اسباب و علل کی مکمل وضاحت کی ہے جن کی وجہ سے یہ قومیں تباہ و برباد ہوئیں۔ ان اسباب میں بھی آخری تجزیے میں وہ تمام اقوام خود اپنی تباہی کی ذمے دار ٹھہرتی ہیں۔ نہ وہ اقوام اپنے افعال بد کو اس انتہا تک

Marfat.com

پہنچاتیں (جہاں عذاب لازم ہوجاتا ہے) نہ وہ تباہ ہوتیں۔ مثال کے طور پر قوم نوح علیہ السلام کے متعلق ارشادِ ربانی ہے:

وہ اپنے گناہوں کی وجہ سے غرق کیئے گئے اور آگ میں داخل کیئے گئے۔
(۷۱/۲۵)

پھر نوحؑ نے کہا اے میرے ربّ! انہوں نے میری نافرمانی کی ہے اور اس کا اتباع کیا جس کے مال واولاد نے بجز نقصان کے کسی چیز میں اضافہ نہیں کیا اور انہوں نے بڑی سازشیں کیں اور اپنی قوم سے کہتے رہے کہ تم اپنے معبودوں کو نہ چھوڑنا نہ ودّ کو چھوڑنا، نہ سواع کو چھوڑنا اور نہ یغوث کو اور نہ یعوق کو اور نہ نسر کو اور انہوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کیا اور (اے خدا) ظالموں کو صرف ناکامی میں ہی بڑھا۔ (۲۳-۲۰/۷۱)

حضرت نوح علیہ السلام کے یہ الفاظ اس امر کی کھلی گواہی ہیں کہ ان کی قوم نافرمانبرداری اور ظلم کی انتہا تک پہنچ چکی تھی یہ نافرمانبرداری اور ظلم خود انہوں نے کیا تھا اور ظلم کا نتیجہ صرف اور صرف تباہی ہی ہوتا ہے جو اس قوم کا مقدر بنا۔

سورۃ نوح کے علاوہ سورۃ الاعراف میں واضح طور پر کہا گیا کہ پوری کی پوری قوم (ماسوا ان لوگوں کے جو ایمان لے آئے تھے) اندھی تھی۔ (۷/۶۴) سورۃ الانبیاء میں کہا گیا کہ وہ بہت بری قوم تھی۔ (۲۱/۷۷) ان میں ایمان لانے کی صلاحیت ختم ہو چکی تھی۔ (۲۶/۱۲۱) خود اللہ تعالیٰ نے تصدیق کی کہ ان میں سے جو ایمان لا چکے تھے ان کے علاوہ کوئی ایمان نہیں لائے گا۔ (۱۱/۳۶)

ظاہر ہے یہ صورتِ حال قوم نوحؑ کی خود اپنی پیدا کردہ تھی اور اس کا انجام بھی انہی کو بھگتنا پڑا اور قیامت میں جو مزید ذلت و رسوائی اور عذاب ہوگا وہ بھی ان کے اپنے اعمال کی وجہ سے ہوگا۔ یقیناً خدا کسی پر ظلم نہیں کرتا (۳/۱۸۲)۔

Marfat.com

یہی صورتِ حال حضرت ھود علیہ السلام کی قوم، قوم عاد کے ساتھ بھی تھی۔

اور جن لوگوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی تھی اور ایمان نہیں لائے تھے ان کی جڑ کاٹ دی گئی۔ (۷/۷۲)

انہوں نے مجرم بن کر خدا سے منہ پھیر لیا تھا۔ (۱۱/۵۲)

انہوں نے حضرت ھود علیہ السلام کی تکذیب کی۔ (۱۱/۵۳)

انہوں نے (دیدہ دانستہ) اپنے رب کی آیات سے انکار کیا تھا اور اس کے رسولوں کی نافرمانی کی تھی اور حق کے دشمن شخص کی اطاعت کی تھی۔ (۱۱/۵۹)

یہ قوم اپنے رب کی ناشکر گذار تھی۔ (۱۱/۶۰)

انہوں نے پیغمبروں کو جھٹلایا تھا۔ (۲۶/۱۲۳)

ان میں ایمان قبول کرنے کی صلاحیت ختم ہو گئی تھی۔ (۲۶/۱۴۰)

انہوں نے زمین میں ناحق تکبر کیا تھا۔ (۴۱/۱۵)

ان کے انہی اعمال کا نتیجہ یہ نکلا کہ:

اس دنیا میں اور آخرت میں دونوں جگہ ان کے پیچھے لعنت لگا دی گئی ان کے لیے لعنت مقدر ہو گئی۔ (۱۱/۶۰)

انہیں ہلاک کر دیا گیا۔ (۲۶/۱۳۹)

انہیں اس دنیا میں بھی رسوائی کا عذاب ملا اور اخروی رسوائی کا عذاب اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ (۴۱/۱۶)

انہیں دردناک عذاب ملا۔ (۴۶/۲۴)

انہیں ایک ایسی ہوا نے ہلاک کیا جو ہر چیز کو تباہ کر رہی تھی۔ (۴۶/۲۵)

اسی طرح سے قوم ثمود کا انجام بھی عبرت آموز ہے۔ انہوں نے خود جو جرائم کیئے ان کی تفصیل اس طرح قرآن مجید میں بیان کی گئی ہے۔

Marfat.com

انہوں نے ایمان لانے سے انکار کیا۔ (۷/۷۶)

وہ زمین میں فساد پھیلاتے تھے۔ (۷/۷۴)

انہوں نے اللہ کے حکم کی نافرمانی کی۔ (۷/۷۷)

انہوں نے حضرت ھود علیہ السلام کی تکذیب کی۔ (۲۶/۱۵۷)

حد سے بڑھ جانے والوں کی اطاعت کی۔ (۲۶/۱۵۱)

انہوں نے رسولوں کو جھٹلایا تھا۔ (۲۶/۱۴۱)

وہ بھلائی سے پہلے برائی میں جلد باز تھے۔ (۲۷/۴۶)

ان کے اپنے ان افعال کا نتیجہ یہ نکلا کہ:

انہیں ہیبت ناک کڑک سے ہلاک کر دیا گیا۔ (۶۹/۵)

یہ ایسی خوفناک کڑک تھی کہ اس کا مقابلہ ان کے بس میں نہ تھا۔ (۵۱/۴۵)

اس ہیبت ناک کڑک نے انہیں باڑ کے بھوسہ کی مانند کر دیا۔ (۵۴/۳۱)

اسی حوالے سے قوم لوط علیہ السلام کا تذکرہ بھی نمایاں اہمیت کا حامل ہے۔ یہ قوم امرد پرستی کا شکار تھی جو یقیناً انتہائی بُرے افعال میں سے ایک ہے۔ قرآن مجید نے ان کے اس فعلِ بد کی گواہی دی:

یہ ایسی بے حیائی تھی جو اس سے قبل کسی قوم نے نہیں کی۔ (۷/۸۰)

وہ عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کے پاس شہوت کے ارادے سے آتے تھے اور یہ حدود فراموشی ہے۔ (۷/۸۱)

وہ اپنی مستی میں مدہوش تھے۔ (۱۵/۷۲)

انہوں نے پیغمبروں کو جھٹلایا۔ (۲۶/۱۶۰)

وہ راستوں پر ڈاکے ڈالتے تھے اور مجالس میں ناپسندیدہ حرکتیں کرتے تھے۔ (۲۹/۲۹)

Marfat.com

ان کے اپنے ان افعالِ بد کا نتیجہ یہ نکلا کہ:

ان پر پتھروں کا مینہ برسا کر انہیں ہلاک کر دیا گیا۔ (۷/۸۴)

ایسے پتھر جو نشان زدہ تھے ان کی بارش کی گئی اور ان کی بستیاں الٹ دی گئیں۔ (۱۱/۸۳)

اسی طرح قوم مدین جس کی طرف حضرت شعیب علیہ السلام مبعوث کیئے گئے تھے وہ بھی مختلف قسم کے افعالِ بد میں مبتلا تھی اور یہ تمام افعال وہ خود اپنی مرضی سے بالارادہ انجام دیتے تھے۔ از روئے قرآن ان کے افعال قبیح مندرجہ ذیل تھے۔

ناپ تول میں ڈنڈی مارتے تھے لوگوں کو ان کے حق سے کم اشیاء دیا کرتے تھے اور اصلاح کے بعد زمین میں فساد کیا کرتے تھے۔ (۷/۸۵)

مختلف راستوں پر بیٹھ کر ان لوگوں کو ڈراتے اور روکتے تھے جو اللہ پر ایمان لے آئے تھے اور دین میں ٹیڑھ پن تلاش کرتے تھے۔ (۷/۸۶)

یہ لوگ ظالم تھے۔ (۱۵/۷۸)

یہ لوگ بستیوں میں فساد مچانے کے لیے پھرا کرتے تھے۔ (۲۶/۱۸۳)

ان کے ان افعال کا نتیجہ یہ نکلا کہ:

ان کو ایک خوفناک زلزلے نے آلیا اور وہ اپنے گھروں میں لاشوں کے ڈھیر بن گئے۔ (۲۹/۳۷)

ان پر لعنت مقدر کر دی گئی جیسے کہ اہل ثمود پر تھی۔ (۱۱/۹۵)

وہ ایک خوفناک دن عذاب میں گھر گئے۔ (۲۶/۱۸۹)

یہی صورتِ حال بنی اسرائیل کے ساتھ بھی تھی اللہ نے ان پر ذلت و مسکنت لازم کر دی کیونکہ وہ اللہ کے احکامات کو ماننے سے انکاری تھے، انبیاء کرام کو ناحق قتل کر دیا کرتے تھے، عصیان کے عادی تھے اور حدود الٰہی

Marfat.com

سے تجاوز کرنے والے تھے۔ (۲/۶۱)

ان پر محتاجی لازم کردی گئی۔ (۳/۱۱۲)

ان کی عہد شکنی کی وجہ سے ان پر لعنت کی گئی اور ان کے دلوں کو سخت کر دیا گیا وہ اس نصیحت سے فائدہ اٹھانا بھول گئے جو انہیں کی گئی تھی۔ (۵/۱۲-۱۳)

کلام الٰہی میں تحریف کی جس کے نتیجے میں ان پر آسمان سے عذاب نازل ہوا۔ (۷/۱۶۲)

مندرجہ بالا تمام مثالیں اس حقیقت کا بین ثبوت ہیں کہ ان تمام مثالوں میں اقوام نے اپنی مرضی و ارادہ سے ایسی راہیں منتخب کیں جو انہیں نہیں کرنی چاہیے تھیں نتیجے کے طور پر انہوں نے اپنے افعال کی سزا بھی پائی۔ اگر انسان کو ارادہ اور اختیار حاصل نہ ہو تو سزا اور جزا کے معنی ہی نہیں رہ جاتے۔ سزا اور جزا ارادہ و اختیار سے مشروط ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے قرآن مجید نے واضح طور پر مجبور اور صاحبِ ارادہ کو مساوی تسلیم نہیں کیا ہے۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّ مَنْ رَّزَقْنٰهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا فَهُوَ يُنْفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَّ جَهْرًا ؕ هَلْ يَسْتَوٗنَ ؕ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (۱۶/۷۵)

اللہ ایک اور مثال بیان فرماتا ہے کہ ایک غلام ہے جو دوسرے کے اختیار میں ہے اور کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتا اور ایک ایسا شخص ہے جس کو ہم نے اپنے ہاں سے مال طیب عطا فرمایا ہے وہ اس میں سے پوشیدہ اور ظاہر خرچ کرتا رہتا ہے تو کیا یہ دونوں اشخاص برابر ہیں؟ (ہرگز نہیں) الحمد للہ لیکن ان میں سے اکثر لوگ سمجھ نہیں رکھتے۔

بالفاظِ دیگر صاحب قدرت اور محکوم کسی صورت برابر نہیں ہو سکتے ہیں۔ اس امر کو اس سے اگلی آیت میں اس مثال سے واضح کیا گیا ہے۔

Marfat.com

وَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ اَحَدُ هُمَآ اَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّ هُوَ كَلٌّ عَلٰى مَوْلٰهُ اَيْنَمَا يُوَجِّهْهُّ لَا يَاْتِ بِخَيْرٍ هَلْ يَسْتَوِيْ هُوَ وَمَنْ يَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَهُوَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۱۶/۷۶)

اور خدا ایک اور مثال بیان فرماتا ہے کہ دو آدمی ہیں جن میں سے ایک تو گونگا ہو جو کسی بات کی طاقت نہ رکھتا ہو وہ اپنے مالک پر بے فائدہ بوجھ ہو جدھر بھی (اس کا آقا) بھیجے (وہ) کوئی بھلائی نہ لائے پس کیا وہ شخص اور وہ شخص جو انصاف کرنے کا حکم دیتا ہو اور وہ خود بھی سیدھی راہ پر قائم ہو (کیا) باہم برابر ہو سکتے ہیں؟

اس آیت سے واضح ہے کہ دو اشخاص جو ایک دوسرے سے اختیار وعمل میں تفاوت رکھتے ہوں ایک بالکل گیا گذرا ہو اور دوسرا صاحب اختیار ہو دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ بالجبر کروائے جانے والے کسی بھی کام کا خواہ وہ کفر کا ہی کیوں نہ ہو اس کا کوئی مواخذہ نہیں۔ مواخذہ صرف اس عمل کا ہوگا جو انسان نے اپنے ارادہ اور اختیار سے کیا ہو۔

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَ لٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (۱۶/۱۰۶)

جو شخص ایمان لانے کے بعد خدا کے ساتھ کفر کرے وہ نہیں جو مجبور کیا جائے اور اس کا دل ایمان کے ساتھ مضبوط ہو بلکہ وہ جو دل کھول کر کفر کرے تو ایسوں پر اللہ کا غضب ہے اور ان کو بہت سخت عذاب ہوگا۔

اس بنیاد پر بھول چوک سے ہونے والی غلطی کو نظر انداز کر دیا گیا ہے اور اسی غلطی کو قابل گرفت مانا گیا ہے جو بالا ارادہ ہو۔

Marfat.com

وَ لَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ فِیْمَآ اَخْطَاْتُمْ بِہٖ وَ لٰکِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُکُمْ ؕ وَ کَانَ اللّٰہُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا (۳۳/۵)

جو بات تم سے غلطی سے ہوگئی ہو اس میں تم پر کچھ گناہ نہیں لیکن جو قصد دل سے کیا جائے (اس پر مواخذہ ہے) اور اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔

یہی وہ بنیادی وجہ ہے جس کی بنا پر قتلِ عمد اور قتلِ خطا کی سزا الگ الگ رکھی گئی ہے۔ اوّل الذکر کی سزا سخت اور ثانی الذکر کی نرم ہے۔

قران مجید واضح انداز میں اس امر کی صریح وضاحت کرتا ہے کہ انسان کو اختیار و ارادہ کی قوت دی گئی ہے اور وہ اس قوت کو استعمال کرنے میں آزاد ہے۔ اس حوالے سے مندرجہ ذیل آیات پر تدبر لازمی ہے۔

وَ ھَدَیْنٰہُ النَّجْدَیْنِ (۹۰/۱۰)

ہم نے اسے (انسان کو) دو راستے دکھادیئے۔

یعنی انسان کو خیر اور شر کے دونوں راستے دکھادیئے گئے ہیں اب یہ انسان کی اپنی مرضی ہے کہ وہ جو چاہے راہ اختیار کرے۔

اِنَّا ھَدَیْنٰہُ السَّبِیْلَ اِمَّا شَاکِرًا وَّ اِمَّا کَفُوْرًا (۷۶/۳)

ہم نے اسے زندگی کا صحیح راستہ دکھادیا (اب اس کی مرضی) خواہ وہ شکر کرے یا نافرمان ہوجائے۔

یہاں واضح رہے کہ انسان کی اپنی خود کوئی تقدیر نہیں ہوتی انسان کو ارادہ و اختیار دیا گیا ہے اسے نیک و بد میں تمیز کا شعور دے کر اس کے سامنے لامحدود تقدیرات پیش کردی گئی ہیں ان میں سے وہ جس تقدیر کو چاہے منتخب کرسکتا ہے۔ تاہم ایک دفعہ تقدیر کے انتخاب کے بعد اس کے نتائج کی تبدیلی اس کے اختیار سے باہر ہے۔ اس حقیقت کو اقبال کی زبان میں اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ:

Marfat.com

تو اپنی تقدیر خود اپنے ہاتھ سے لکھ
خالی رکھی ہے خامۂ حق نے تیری جبیں

حق و باطل میں انتخاب کا حق بہر حال انسان کو حاصل ہے۔ اس کی وضاحت قرآن مجید میں ان الفاظ میں کر دی گئی ہے۔

وَ قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ
(۱۸/۲۹)

ان سے کہہ دیجیے کہ حق تمہارے ربّ کی طرف سے آ گیا ہے پس جو چاہے اس پر ایمان لائے اور جو چاہے انکار کر دے۔

سورۃ النجم میں قطعی واضح اور دوٹوک الفاظ میں کہہ دیا گیا کہ:

لَّيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعٰى (۵۳/۳۹)

انسان کے لیے اس کی سعی سے ماسوا کچھ بھی نہیں۔

اس آیت میں استعمال کیے جانے والے لفظ سعی پر تدبر لازم ہے۔ اس لفظ کا مادہ س ع ی ہے۔ جس کے معنی قصد کرنے اور ارادہ کرنے کے ہیں اس کے علاوہ کسی کام کے لیے کوشش، دوڑ دھوپ اور جدوجہد کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ انسان اسی شے کے لیے سعی کرتا ہے جس کے لیے ارادہ کرتا ہے بالفاظِ دیگر ارادہ اور جدوجہد دونوں انسانی اختیار میں ہیں۔

جیسے کہ پیچھے عرض کیا جا چکا ہے کہ انسانی زندگی کا مقصد اپنے نفس کے توازن کو برقرار رکھنا ہے۔ یہ انسانی اعمال ہی ہیں جس سے یہ توازن بنتا یا بگڑتا ہے۔ اس حوالے سے بنیادی اصول یہ ہے۔

نَصِيبٌ مِّمَّا كَسَبُوا (۲/۲۰۲)

تمہارا توازن تمہارے اعمال سے متعین ہوتا ہے۔

Marfat.com

اس آیت میں استعمال کیئے جانے والے لفظ ''نصیب'' کا مادہ ن ص ب ہے جس کے بنیادی معنی کسی چیز کو کھڑا کر کے رکھنے کے یا ابھار کر رکھنے کے آتے ہیں۔ اس بنیاد پر اس کا ترجمہ توازن کیا گیا ہے۔ بالفاظِ دیگر وہ توازن جس پر اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا ہے اور جس توازن کی برقراری انسان کی دنیاوی اور اخروی کامیابی کا پہلا اور آخری معیار ہے اس کا تعین خود انسان اپنے اعمال سے کرتا ہے۔ یہ توازن دنیا اور آخرت میں دونوں جگہ انسانی اعمال سے ہی بنتا اور بگڑتا ہے۔ اس کی وجہ یہ بنیادی اصول ہے کہ:

كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ ۙ (۷۴/۳۸)

ہر شخص اپنے اعمال کے عوض گروی ہے۔

یا یہ کہ:

جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ (۹/۸۲)

جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔

یہ ہماری عام زندگی کا مشاہدہ ہے اور کوئی ایک مثال بھی اس سے رتی بھر انحراف کی پیش نہیں کی جا سکتی۔ یہ عام انسانی زندگی کا سب سے پہلا اور بنیادی اصول ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو کچھ بھی انسان کے سامنے آتا ہے وہ اس کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے۔

هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ، (۳۴/۳۳)

پس جو عمل وہ کرتے تھے انہی کا ان کو بدلہ ملے گا۔

مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ ۙ (۴/۱۲۳)

جو کوئی بدی کرے گا اسے اس کے مطابق بدلہ دیا جائے گا۔

ان آیات کریمہ کے علاوہ اس حوالے سے کئی دیگر آیات پیش کی جا سکتی ہیں جہاں واضح اور دو ٹوک انداز میں انسانوں کو ان کے اعمال کا مکلف ٹھہرایا گیا ہے مثلاً (۹/۵۵)، (۱۴/۵۱)، (۱۶/۹۶-۹۷)، (۴۰/۱۷)، (۷/۱۴۷)، (۵۲/۱۶)، (۵۶/۲۴) اور

(۸۳/۳۶) وغیرہ۔

انسان کس طرح اپنے اعمال کا خود مکلف ہے اس کا ایک بین ثبوت سورۃ البقرہ کی آیت ۲۷۹ کے مندرجہ ذیل الفاظ سے ہوتا ہے۔

لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ (۲/۲۷۹)

نہ تم کسی پر ظلم کرو گے نہ تم پر ظلم ہوگا۔

آیت کے یہ الفاظ جو ایک طرف بنیادی سماجی قوانین میں سے ایک قانون کی طرف انسانیت کی توجہ دلواتے ہیں تو دوسری طرف یہ بالکل سیدھے سادے انداز میں انسانی اختیار و ارادے کی شہادت بھی ہیں۔ کیونکہ اُس آیت میں بنیادی نقطۂ تدبر یہ ہے کہ انسانوں کو یہ کہا جا رہا ہے کہ نہ تم ظلم کرو نہ تم پر ظلم ہوگا۔ یہاں لفظ ظلم کے معنی کا تعین کرنا لازمی ہے۔ ظلم کا مادہ ظ ل م ہے جس کے معنی دوسرے کی ملکیت میں بے جا تصرف کرنا، حد سے تجاوز کرنا، کسی چیز کو اس کے صحیح مقام سے ہٹا دینا ہیں خواہ یہ تبدیلی بلحاظِ وقت ہو یا بہ لحاظِ مقام۔ اس کے معنی اندھیرے اور تاریکی کے بھی ہیں اس جگہ کا روشن نہ ہونا جہاں روشنی کو ہونا چاہیے تھا۔

ان معنوں میں سے کوئی سے بھی معنی لیے جائیں ان میں انسانی اختیار و ارادہ کی نفی ممکن نہیں۔ ملکیت میں بے جا تصرف ہو، حد سے تجاوز کرنا ہو، کسی چیز کو اس کے مقام سے ہٹا دینا ہو یہ تمام افعال انسانی اختیار و ارادہ کی کھلی دلیل ہیں جب انسان یہ افعال کرتا ہے تو اس کے نتیجے میں اس پر ایسا ہی ظلم خدا کی تقدیر کی صورت میں منطبق ہو جاتا ہے یعنی پہل انسان کرتا ہے اس کے بعد اس کے نتائج خود بخود اسی اعتبار سے مرتب ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے اقوام کے بارے میں بھی یہ کہا گیا ہے کہ خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی جب تک وہ خود اپنے نفوس کو تبدیل نہیں کرتی۔

Marfat.com

اِنَّ اللّٰهَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ط (۱۳/۱۱)

اللہ کبھی بھی کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک کہ وہ اپنے نفوس میں تبدیلی پیدا نہ کرے۔

یعنی ابتدا انسان کرتا ہے خواہ وہ انفرادی سطح پر ہو یا اجتماعی سطح پر اس کے بعد ا سی قسم کے نتائج مرتب ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نعمتوں کے حوالے سے بھی یہی کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی نعمت کو دینے کے بعد اس وقت تک اس کا سلسلہ منقطع نہیں کرتا جب تک انسان خود ہی اس کو اس کا نااہل ثابت نہ کر دے اگر انسان اپنے عمل سے خود کو اس نعمت کا اہل ثابت کرتا ہے تو وہ نعمت اللہ تعالیٰ کبھی بھی اس سے واپس نہیں لیتا۔

یہ صورتِ حال پھر انسانی اختیار و ارادے کی کھلی دلیل ہے۔ انسان پر جو بھی مصیبت آتی ہے وہ اس کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے۔

وَ مَآ اَصَابَکُمْ مِّنْ مُّصِیْبَةٍ فَبِمَا کَسَبَتْ اَیْدِیْکُمْ وَ یَعْفُوْا عَنْ کَثِیْرٍ ط (۴۲/۳۰)

اور جو مصیبت تم پر آتی ہے وہ تمہارے اپنے افعال کی وجہ سے ہوتی ہے اور بہت سے گناہوں کو تو وہ معاف کر دیتا ہے۔

بُرے اعمال کے نتائج بھی بُرے ہوتے ہیں بالفاظِ دیگر وہی صورتِ حال یعنی جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔

فَاَصَابَهُمْ سَیِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَ حَاقَ بِهِمْ مَّا کَانُوْا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ ط (۱۶/۳۴)

تو ان کو ان کے اعمال (بد) کے بُرے بدلے ملے اور جس چیز کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے اس نے ان کو گھیر لیا۔

روزِ قیامت منفی نتائج کہیں خارج سے نہیں آئیں گے یہ انسان کے اپنے افعال

Marfat.com

ہوں گے جنہیں انسان نے پہلے سے بھیج رکھا ہوگا۔

ذٰلِکَ بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْکُمْ وَ اَنَّ اللّٰہَ لَیْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ

(۳/۱۸۲)

یہ ان کاموں کی سزا ہے جو تمہارے ہاتھ آگے بھیجتے رہے ہیں اور اللہ اپنے بندوں پر مطلق ظلم نہیں کرتا۔

اس آیت میں استعمال ہونے والے الفاظ بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْکُمْ پر تدبر لازمی ہے یعنی وہ اعمال جنہیں تم نے اپنے ہاتھوں سے پہلے بھیجا ہو۔ یہ انسان کے وہ افعال ہیں جنہیں وہ اختیار و ارادہ سے آگے بھیجتا ہے۔ اس حقیقت کا اعادہ (۱۰/۳۰)؛ (۱۰۔۹/۲۲)، (۳۰/۳۶)، (۴۲/۴۹) اور (۷۳/۲۰) میں بھی کیا گیا ہے۔

یہی وہ وجہ ہے جس کی بنیاد پر اللہ محسنین کے کام کو ضائع نہیں کرتا۔

فَاِنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ (۱۲/۹۰)

اللہ محسنین کا اجر کبھی ضائع نہیں کرتا۔

اس بات کو ایک مختلف پیرائے میں یوں بھی کہا گیا ہے۔

وَ سَیَجْزِی اللّٰہُ الشّٰکِرِیْنَ (۳/۱۴۴)

اللہ شکر گذاروں کو ضرور بدلہ دے گا۔

یہی وجہ ہے کہ روزِ قیامت ہر انسانی عمل کا ذرہ ذرہ تولا جائے گا۔

فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِیْنُہٗ ۙ فَھُوَ فِیْ عِیْشَۃٍ رَّاضِیَۃٍ ؕ وَ اَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِیْنُہٗ ۙ فَاُمُّہٗ ھَاوِیَۃٌ ؕ (۱۰۱/۶۔۹)

اس وقت جس کے (اعمال کے) پلڑے بھاری ہوں گے وہ پسندیدہ حالت میں ہوگا اور جس کے (اعمال کے) پلڑے ہلکے ہوں گے اس کا ٹھکانہ ھاویہ (بھڑکتی ہوئی آگ) ہوگا۔

Marfat.com

اسی وجہ سے تمام انسانی افعال کو لکھ لیا جاتا ہے۔

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ ۚ وَ اِنَّا لَهٗ كٰتِبُوْنَ ط (۲۱/۹۴)

اور جو اعمال صالح کرے گا اور ساتھ مومن بھی ہوگا تو اس کی کوشش کو رد نہیں کیا جائے گا ہم اس کے نیک اعمال کو لکھ رکھیں گے۔

اِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيٰنِ عَنِ الْيَمِيْنِ وَ عَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ (۵۰/۱۷)

جب کہ دائیں اور بائیں بیٹھے ہوئے دو گواہ اس کی تمام حرکات محفوظ کرتے جاتے ہیں۔

یہاں توجہ طلب امر یہ ہے کہ اگر سب کچھ پہلے سے متعین شدہ اور لکھا ہوا ہے تو اس صورت میں اس آیت کے کوئی معنی ہی باقی نہیں رہتے کیونکہ اگر سب کچھ پہلے سے طے شدہ ہے تو ان گواہوں کی جن کا اس آیت میں تذکرہ کیا گیا ہے ان کو انسانی حرکات لکھنے یا محفوظ کرنے کی ضرورت کیا ہے؟ ظاہر ہے ان کی ضرورت اسی پس منظر میں ہے کہ انسان کو ارادہ و اختیار حاصل ہے انسان اپنی مرضی سے جو چاہے کر سکتا ہے تاہم جو افعال انسان انجام دیتا ہے وہ چونکہ پہلے سے متعین نہیں ہوتے لہٰذا یہ دو گواہ انہیں لکھتے چلے جاتے ہیں۔ روزِ قیامت انسان کو اس کا نامۂ اعمال حوالے کر دیا جائے گا اور اس روز انسان اپنا محاسب خود ہوگا یہ نامۂ اعمال ایک کھلی ہوئی واضح کتاب کی صورت میں انسان کے سامنے پیش کر دیا جائے گا۔

وَ كُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ ؕ وَ نُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰهُ مَنْشُوْرًا ۝ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ؕ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ط (۱۷/۱۳-۱۴)

اور ہم نے ہر انسان کی گردن میں اس کے عمل کو باندھ دیا ہے اور ہم قیامت

Marfat.com

کے دن ان کے اعمال کی کتاب نکال کر اس کے سامنے رکھ دیں گے جسے وہ کھلی ہوئی پائے گا (اور اسے کہا جائے گا) اپنی کتاب (خود ہی) پڑھ (کر دیکھ لے) آج تیرا نفس ہی حساب لینے کو کافی ہے۔

یہاں یہ حقیقت بھی ذہن میں رکھیے کہ یہ اعمال کسی صورت دوسرے کو منتقل نہیں ہو سکتے۔ زید، بکر کے یا بکر، زید کے اعمال کا ذمے دار نہیں۔

قُلْ لَّا تُسْئَلُوْنَ عَمَّآ اَجْرَمْنَا وَلَا نُسْئَلُ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ (۳۴/۲۵)

کہہ دیجیے کہ نہ ہمارے گناہوں کی تم سے پرسش ہوگی نہ تمہارے اعمال کے بارے میں ہم سے پوچھا جائے گا۔

وَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّيْ عَمَلِيْ وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ اَنْتُمْ بَرِيْٓـُٔوْنَ مِمَّآ اَعْمَلُ وَاَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ط (۱۰/۴۱)

اگر یہ آپ کی تکذیب کریں تو کہہ دیجیے کہ مجھ کو میرے اعمال (کا بدلہ ملے گا) اور تم کو تمہارے اعمال (کا) تم میرے عملوں کے جوابدہ نہیں ہو اور میں تمہارے افعال کا جوابدہ نہیں ہوں۔

اسی طرح جو لوگ ماضی میں گذر گئے ان کے کسی عمل کی ذمہ داری ان کے بعد آنے والوں پر نہیں۔

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ط (۲/۱۳۴،۱۴۲)

یہ جماعت گذر چکی ان کو ان کے اعمال (کا بدلہ ملے گا) اور تم کو تمہارے اعمال (کا) اور جو عمل وہ کرتے تھے اس کی پرسش تم سے نہیں ہوگی۔

نہ صرف متذکرہ بالا بلکہ اس کے علاوہ بھی کئی آیات قرآنی انسانی اختیار وارادہ پر کھلی کھلی شاہد ہیں۔ اگر انسانی اختیار وارادہ پر قدغن لگاتے ہوئے جبریہ اندازِ فکر تسلیم کر لیا جائے

Marfat.com

تو اس حوالے سے سب سے بنیادی مشکل خود خدا کے بارے میں پیش آ جاتی ہے۔ کیونکہ جبری نقطۂ نگاہ سے سب کچھ پہلے سے متعین ہے انسان کو کوئی اختیار و ارادہ حاصل نہیں ہے اس کے نتیجے میں انسان پر آنے والی تمام مصیبتیں، غم و الم اور دیگر تکالیف بھی خدا کی طرف سے ہی آتی ہیں جبکہ قرآن مجید کا کھلم کھلا واضح اور دوٹوک اعلان ہے کہ اللہ کسی پر ظلم نہیں کرتا۔

وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ (۳/۱۸۲)

اور اللہ اپنے بندوں پر مطلق ظلم نہیں کرتا۔

ظلم تو درکنار وہ تو ظلم کا ارادہ بھی نہیں کرتا۔

وَ مَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ (۴۰/۳۱)

اللہ اپنے بندوں پر ظلم کرنا نہیں چاہتا۔

اور قیامت کے دن بھی کسی پر ظلم نہیں ہوگا۔

ثُمَّ قِيْلَ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ط (۱۰/۵۲)

پھر ظالموں سے کہا جائے گا کہ عذابِ دائمی کا مزا چکھو تم انہی اعمال کا بدلہ پاؤ گے (جو دنیا میں) کرتے رہے ہو۔

لہٰذا ایک ایسے خدا سے جس سے ظلم کا تصور تک منسوب نہ کیا جا سکتا ہو اور یہ اس کی شان سے بہت بعید ہو کہ وہ اپنی مخلوقات پر ظلم کرے یہ کیسے تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ وہ واقعتاً اپنی مخلوقات پر ظلم کرے گا؟ یہ ممکن ہی نہیں جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے انسان پر جو مصیبتیں آتی ہیں وہ اس کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتی ہیں (۴۲/۳۰)۔ خدا کسی پر (کبھی) ظلم نہیں کرتا (۳/۱۸۲)۔

یہ صورت حال صرف انفرادی سطح پر نہیں بلکہ اجتماعی سطح پر بھی ہے کبھی کسی قوم کو ناحق تباہ نہیں کیا جاتا۔

Marfat.com

ذٰلِكَ اَنۡ لَّمۡ يَكُنۡ رَّبُّكَ مُهۡلِكَ الۡقُرٰى بِظُلۡمٍ وَّ اَهۡلُهَا غٰفِلُوۡنَ

(۶/۱۳۲)

تمہارا رب ایسا نہیں کہ بستیوں کو ظلم سے ہلاک کر دے اور وہاں کے رہنے والوں کو خبر نہ ہو۔

لہٰذا نہ انفرادی اور نہ اجتماعی سطح پر خدا سے ظلم کا تصور منسوب کیا جا سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ جتنے بھی افعال خیر ہیں وہ سب قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ سے منسوب کیے ہیں اور کسی بھی ایسے فعل کو جو خیر نہ ہو قرآن مجید میں کہیں بھی اللہ تعالیٰ سے منسوب نہیں کیا گیا ہے، چاہے وہ بیماری ہو یا کوئی اور مصیبت مثلاً:

وَ اِذَا مَرِضۡتُ فَهُوَ يَشۡفِيۡنِ (۲۶/۸۰)

جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہ مجھے شفا دیتا ہے۔

یہاں توجہ طلب امر یہ ہے کہ بیماری کو انسان سے منسوب کیا گیا ہے۔ ''جب میں بیمار ہوتا ہوں''، لیکن شفا کو اللہ سے منسوب کیا گیا ہے ''وہ مجھے شفا دیتا ہے''۔

قرآن مجید خود سر چشمۂ خیر ہے۔

وَ قِيۡلَ لِلَّذِيۡنَ اتَّقَوۡا مَاذَاۤ اَنۡزَلَ رَبُّكُمۡ قَالُوۡا خَيۡرًا (۱۶/۳۰)

یہ پوچھتے ہیں تمہارے رب نے تمہاری طرف کیا نازل کیا ہے کہہ دیجیے اس نے خیر نازل کیا ہے۔

راہ ہدایت کی نسبت بھی خدا سے ہے وہی سیدھا راستہ دکھاتا اور رزق عطا کرتا ہے۔

الَّذِيۡ خَلَقَنِيۡ فَهُوَ يَهۡدِيۡنِۙ۝ وَالَّذِيۡ هُوَ يُطۡعِمُنِيۡ وَ يَسۡقِيۡنِ

(۲۶/۷۸-۷۹)

جس نے مجھے پیدا کیا پھر سیدھا راستہ دکھایا اور وہ مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے۔

خود انسان کو بھی جو صلاحیتیں دی گئی ہیں ان کی نسبت بھی خدا سے ہے مثلاً سورۃ

Marfat.com

الرحمٰن میں ارشادِ خداوندی ہے۔

خَلَقَ الْاِنْسَانَ o عَلَّمَهُ الْبَيَانَ (۵۵/۳۔۴)

خدا نے انسان کو پیدا کیا اور بولنا سکھایا۔

ظاہر ہے ہر انسانی بچے کو خدا آ کر خود بولنا نہیں سکھاتا لیکن یہ صلاحیت چونکہ عطیہ خداوندی ہے اسی وجہ سے کہا گیا کہ خدا نے انسان کو بولنا سکھایا۔ اسی طرح کہا گیا کہ اسے قلم سے لکھنا سکھایا۔

الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ (۹۶/۴)

خدا وہ ہے جس نے انسان کو قلم سے علم دیا۔

یہ صلاحیت بھی اللہ ہی کی ودیعت کردہ ہے لہٰذا اس کی نسبت بھی اللہ کی طرف ہے۔

غزوہ بدر میں مجاہدین کے لشکر جنہیں خدا نے اپنا لشکر کہہ کر پکارا ہے جب کفار کی گردنیں اڑا رہے تھے تو اس کے متعلق کہا گیا کہ انہیں تم قتل نہیں کر رہے تھے بلکہ خدا خود قتل کر رہا تھا۔

فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ (۸/۱۷)

تم انہیں قتل نہیں کر رہے تھے خدا خود قتل کر رہا تھا۔

اسی حوالے سے یہ کہا گیا کہ اس وقت تم تیر نہیں چلا رہے تھے اللہ خود تیر چلا رہا تھا۔

وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (۸/۱۷)

اس وقت تم تیر نہیں چلا رہے تھے خدا چلا رہا تھا۔

بیعت رضوان کے وقت حدیبیہ کے مقام پر جب سرفرشان اسلام نبی اکرمؐ کے دست مبارک پر بیعت کر رہے تھے تو اس معاہدہ کو بھی رسول سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے خود اپنے آپ سے منسوب کیا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ (۴۸/۱۰)

جو لوگ (اے رسول!) آپ سے معاہدہ کر رہے تھے وہ آپ سے نہیں بلکہ

Marfat.com

خدا سے معاہدہ کر رہے تھے۔

یہاں تک کہ بیعت کے وقت جو لوگ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ہاتھ پر بیعت کر رہے تھے وہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ہاتھ پر نہیں بلکہ اللہ کے ہاتھ پر بیعت کر رہے تھے۔

يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ ۚ

(۴۸/۱۰)

ان کے ہاتھ پر تیرا ہاتھ نہیں خود خدا کا ہاتھ تھا۔

نہ صرف یہ کہ متذکرہ بالا چند مقامات جن کا یہاں تذکرہ کیا گیا ہے ان میں خدا سے خیر منسوب کیا گیا ہے بلکہ پورے قرآن مجید میں الحمد سے لے کر والناس تک دیکھ لیجیے جہاں خیر کا تذکرہ ہے اس کی نسبت اللہ تعالیٰ سے ہے اور جہاں بھی کسی برائی یا بدی کا ذکر ہے اس کی نسبت اللہ تعالیٰ سے نہیں ہے کیونکہ یہ ممکن بھی نہیں ہے۔ خدا صرف سرچشمۂ خیر ہے اس سے اس کے علاوہ کسی شے کے ظہور کا تصور بھی ممکن نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ جب زمین کی پیداوار کا تذکرہ ہوتا ہے تو جب اچھی پیداوار کا تذکرہ ہوتا ہے تو اسے قرآن اللہ سے منسوب کرتا ہے اور جب خراب پیداوار کا تذکرہ ہوتا ہے تو اسے اللہ سے منسوب نہیں کیا گیا۔

وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۚ وَالَّذِيْ خَبُثَ لَا يَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا ؕ

(۷/۵۸)

اچھی زمین اپنے رب کے اذن (حکم) سے اچھی پیداوار دیتی ہے۔ جب کہ بری زمین سے خراب پیداوار حاصل ہوتی ہے۔

اس آیت میں توجہ طلب امر یہ ہے کہ اچھی پیداوار کی نسبت اللہ سے ہے جبکہ خراب پیداوار کے لیے کہا گیا ہے کہ وہ خراب زمین سے حاصل ہوتی ہے۔

اس بنیاد پر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ خدا کی جانب سے کوئی شر یا کوئی مصیبت آ سکتی ہے جو کہ عقیدۂ جبر کا لازمی عنصر ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے۔ شر صرف انسان کا اپنا پیدا کردہ ہوتا

Marfat.com

ہے جو اس کے اپنے اعمال بد کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی مشیت سے قوانین متعین کردیئے ہیں جو ان کے مطابق چلے گا وہ بہتر نتائج حاصل کرے گا خواہ نتائج عزت واکرام کی شکل میں ہوں یا افراطِ رزق کی شکل میں یا کسی بھی دیگر خیر کی شکل میں اور جو فرد یا قوم ان قوانین کی پاسداری نہیں کرے گی ذلت و مسکنت اور تباہی و بربادی اس کا حتمی انجام ہوگی۔

یہی باذن اللہ کا حقیقی مفہوم ہے۔ اذن کے بنیادی معنی اعلان کرنے یا اجازت کے ہیں۔ اللہ کی طرف سے ایک اجازت اگر مستقل طور پر دے دی جائے تو وہ قانون کا درجہ ختیار کرلیتی ہے قرآن میں اذن اللہ کی اصطلاح انہی معنی میں استعمال کی گئی ہے۔

وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهُ بِإِذْنِ رَبِّهِ (۷/۵۸)

زرخیز زمین اپنے رب کے اذن سے اچھی فصل دیتی ہے۔

یہاں اذن سے مراد ظاہر ہے وہ قوانین زراعت ہیں جن سے اچھی فصل حاصل ہوتی ہے۔

وَيُمْسِكُ السَّمَاءَ أَنْ تَقَعَ عَلَى الْأَرْضِ إِلَّا بِإِذْنِهِ ط (۲۲/۶۵)

اور وہ بادلوں کو فضاؤں میں معلق رکھتا ہے کہ وہ اس کے اذن کے بغیر زمین پر نہ برسیں۔

ظاہر ہے یہاں اذن سے مراد وہ قوانین خداوندی ہیں جن کے تحت بارش کا پورا عمل بجام پاتا ہے لہٰذا بارش جب خدا کے اذن سے برستی ہے تو اس سے مراد یہ ہوگی کہ بارش انہی قوانین کے تحت برستی ہے۔ اسی بنیاد پر جب قرآن مجید یہ کہتا ہے کہ:

مَا أَصَابَ مِنْ مُّصِيبَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ط (۶۴/۱۱)

تم پر کوئی مصیبت اللہ کے حکم (اذن) کے بغیر نہیں آتی۔

تو اس سے مراد اللہ کا وہ حکم ہے جو اس حوالے سے اس نے متعین کردیا ہے اور حکم یہ

وَمَآ اَصَابَکُمۡ مِّنۡ مُّصِیۡبَۃٍ فَبِمَا کَسَبَتۡ اَیۡدِیۡکُمۡ (۴۲/۳۰)

تم پر جو بھی مصیبت آتی ہے وہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوتی ہے۔

اسی بنیاد پر جب یہ کہا گیا کہ:

وَمَا کَانَ لِنَفۡسٍ اَنۡ تُؤۡمِنَ اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰہِ (۱۰/۱۰۰)

کوئی شخص بھی خدا کے اذن کے بغیر ایمان نہیں لاسکتا۔

تو یہاں پھر اذن سے مراد خدائی حکم ہے یعنی ایمان لانے سے متعلق خدائی حکم اور اس حوالے سے اسی آیت کے باقی حصے میں وضاحت کردی کہ اس حوالے سے خدائی حکم عقل اور بصیرت کا استعمال ہے یعنی جو شخص عقل اور بصیرت استعمال کرے گا وہ ایمان لاسکتا ہے اور جو ایسا کرنا ہی نہیں چاہے اس کے لیے کیا کیا جاسکتا ہے۔ اس حوالے سے پوری آیت مندرجہ ذیل ہے۔

وَمَا کَانَ لِنَفۡسٍ اَنۡ تُؤۡمِنَ اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰہِ وَیَجۡعَلُ الرِّجۡسَ عَلَی الَّذِیۡنَ لَا یَعۡقِلُوۡنَ ط (۱۰/۱۰۰)

کوئی شخص بھی خدا کے اذن کے بغیر ایمان نہیں لاسکتا وہ اپنا غضب ان لوگوں پر نازل کرتا ہے جو عقل وفکر سے کام نہیں لیتے۔

اسی طرح سے سورۃ مجادلہ میں ارشاد ربانی ہے:

اِنَّمَا النَّجۡوٰی مِنَ الشَّیۡطٰنِ لِیَحۡزُنَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَلَیۡسَ بِضَآرِّہِمۡ شَیۡـًٔا اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰہِ ؕ وَعَلَی اللّٰہِ فَلۡیَتَوَکَّلِ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ (۵۸/۱۰)

خفیہ مشورہ کرنے کا طریق شیطان کی طرف سے آیا ہے اور اسکی غرض یہ ہے کہ مومنوں کو افسردہ خاطر کرے اور وہ ان کو اللہ کے حکم کے بغیر کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا سکتا اور مومنوں کو صرف اللہ پر توکل کرنا چاہیئے۔

Marfat.com

شیطان انسان کا کھلا ہوا دشمن ہے (۲/۱۶۸) اس حقیقت کا اعادہ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر ہوا ہے یہاں اذن کے معنی پھر اسی طرح سے اس قانون کے ہیں جس کے تحت شیطان انسان کو نقصان پہنچا سکتا ہے اگر انسان ایسے افعال انجام دیتا ہے جس سے شیطان انسان کو ورغلانے میں کامیاب ہو جائے اور اس طرح انسان کو نقصان پہنچا دے ظاہر ہے ان افعال سے اجتناب ضروری ہے۔ یہاں پھر ذمے داری انسان کی ہے کسی اور کی نہیں شیطان تو ہر وقت انسان کو گرانے کی طاق میں ہے اگر انسان خود ایسے افعال انجام دے جس سے شیطان کو یہ موقع مل جائے تو اس میں غلطی ظاہر ہے انسان کی ہے۔ اس کی وضاحت سورۃ آل عمران کی مندرجہ ذیل آیت میں کر دی گئی ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا ۚ (۳/۱۵۵)

جس دن دونوں لشکر ایک دوسرے کے مقابل ہوئے تھے اس دن تم میں سے جنہوں نے پیٹھ پھیر لی تھی انہیں صرف ان کے بعض اعمال کی وجہ سے شیطان گرانا چاہتا تھا۔

اس آیت کریمہ میں غزوہ احد کے حوالے سے بعض مسلمانوں سے جو غلطیاں ہوئیں تھیں ان کا تذکرہ کر کے کہا جا رہا ہے کہ ان کی غلطیوں کی وجہ سے شیطان نے انہیں گرانا چاہا۔ یہاں بھی ظاہر ہے غلطی انسانوں ہی کی تھی جن کی ان غلطیوں کی وجہ سے شیطان ان پر غالب آ گیا اور مومنین افسردہ خاطر ہو گئے یہاں بھی صورتِ حال بدستور وہی ہے یعنی اللہ نے ایسے قوانین متعین کر دیئے ہیں کہ اگر اس قسم کے افعال انسان انجام دے گا تو شیطان ں پر غالب آ جائے گا اور اسے نقصان پہنچا دے گا اسی وجہ سے متذکرہ بالا آیت ۵۸/۱۰) کے آخر میں واضح طور پر کہا گیا کہ مومنین کو صرف اللہ پر بھروسہ کرنا چاہیئے۔ ہر ہے جب مومن صرف اور صرف اللہ پر بھروسہ کرے گا تو اس سے وہ افعال بھی سرزد

Marfat.com

نہیں ہوں گے جن سے شیطان کو اس پر غالب آنے اور پھر اسے نقصان پہنچانے کا موقع مل جائے۔

اس بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اذن اللہ سے مراد وہ خدائی قوانین ہیں جو مختلف حوالوں سے طبعی اور سماجی دنیا میں اللہ نے اپنی مشیت سے متعین کیے ہیں۔ اور پورا کائناتی نظام انہی قوانین کے تحت چل رہا ہے۔ چونکہ ایک ایک چیز قوائد وضوابط کی پابند ہے اور قوائد وضوابط اللہ تعالیٰ کی مشیت سے متعین کردہ ہیں اور وہ مکمل قدرت رکھتے ہوئے بھی ان کی خود خلاف ورزی نہیں کرتا۔ بالفاظِ دیگر ایسا نہ کرنا اس نے اوپر فرض کر لیا ہے لہٰذا قرآن مجید کی ایسی تمام آیات جہاں اللہ کے متعلق شاء یا یشآء کے الفاظ آئیں ان کا ترجمہ بھی ممکن ہے جو عام طور پر کیا جاتا ہے کہ "خدا جو چاہتا ہے کرتا ہے" تاہم اسے یوں کیا جانا چاہیئے کہ "سب کچھ اللہ کے قانون مشیت کے مطابق ہوتا ہے"۔ اوّل الذکر صورت میں اللہ کا تصور ایک مطلق العنان بادشاہ کا ابھرتا ہے جو دورِ ملوکیت میں تو سیاسی مجبوری اور ضرورت تھا تاہم آج کے دور میں جب کائنات میں مکمل قانون کی حکمرانی کا تصوّر راسخ ہو کر سامنے آ چکا ہے خدا کا وہ حقیقی تصوّر سامنے لانا ضروری ہے جو قرآن اور کائنات دونوں پیش کرتے ہیں۔

اسی طرح "لو شاء اللّٰہ" کی قرآنی اصطلاح کا ترجمہ عام طور پر یوں کیا جاتا ہے کہ "اگر اللہ چاہتا تو" اس کی بجائے متذکرہ بالا تناظر میں اس کا ترجمہ اس طرح کیا جانا چاہیئے کہ "اگر اللہ اس قسم کا قانون مقرر کر دیتا تو ایسا ہو جاتا"۔ مثلاً اگر یہ کہا جائے کہ پانی ۱۰۰ درجے سنٹی گریڈ پر کیوں اُبلتا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ یہ خدا کا قانون مشیت ہے کہ پانی اس مخصوص درجۂ حرارت پر ابل جاتا ہے اگر اس کی مشیت کا تقاضا کچھ اور ہوتا تو یہ کسی اور درجۂ حرارت پر بھی ابل سکتا تھا۔ اگر خدا چاہے تو اب بھی اپنی مشیت سے اسے تبدیل کر سکتا ہے وہ ایسا کرنے کی مکمل قدرت رکھتا ہے لیکن اب وہ ایسا ہرگز نہیں کرے

کیونکہ اس نے قوانین مشیت متعین کرنے کے بعد خود کہا ہے کہ وہ ان قوانین کو کبھی تبدیل نہیں کرے گا (۴۸/۲۳)۔ ایسا کرنا اس نے اوپر واجب کر لیا ہے اور وہ اپنے وعدوں کی کبھی خلاف ورزی نہیں کرتا (۳/۱۹۴)۔

اسی طرح ماشآء اللہ کی قرآنی اصطلاح کا ترجمہ ''جو اللہ چاہے گا'' کیا جاتا ہے یعنی انسان کے بس میں کچھ بھی نہیں اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ یہ بھی خلافِ قرآن تصور ہے۔ قانون کی حکمرانی کے متذکرہ بالا تصور کے تحت اس کا صحیح مفہوم ہے کہ ''سب کچھ خدا کے قانون مشیت کے مطابق ہوتا ہے'' لہٰذا جو اس قانون مشیت سے ہم آہنگ ہو جائے گا وہ کامیاب ہوگا اور جو اس کی مخالفت کرے گا وہ خسارے میں رہے گا۔

اسی طرح انشاء اللہ کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ ''اگر اللہ نے چاہا تو۔۔۔'' اللہ کے قانون کی مکمل حکمرانی کے تصور کے حوالے سے اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ ''چونکہ (کوئی بھی) کام جو اللہ کے قانون مشیت کے مطابق ہو لہٰذا اس کا وہی نتیجہ ہوگا جو اس قانون مشیت کی رو سے طے ہے''۔ مثال کے طور پر سورۃ فتح میں ارشاد ربانی ہے:

لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ (۴۸/۲۷)

آپ خدا کے قانون مشیت کے مطابق امن کے ساتھ داخل ہوں گے۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ مسجد الحرام (کعبہ یا مکہ) میں داخلے کے لیے خدا کی مشیت کے مطابق جو تقاضے پورے کیئے جانے تھے وہ تمام پورے ہو چکے تھے لہٰذا اسی قانون کے مطابق اس کے نتیجے یعنی مکہ میں داخلے کو اب کوئی روک نہیں سکتا تھا۔

حضرت موسیٰؑ کے خسر نے جب حضرت موسیٰؑ سے کارندگی کا معاملہ طے کیا تو کہا:

سَتَجِدُنِیْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ (۲۸/۲۷)

میں چونکہ خدائی قوانین کا پابند ہوں لہٰذا (آپ) مجھے صالحین میں پائیں گے۔

باالفاظِ دیگر کسی خاص کام کے لیے درکار مقتضیات کی تکمیل کے بعد اس کام کا ہونا

Marfat.com

جب یقینی ہو جائے تو اس مقصد کے لیے انشاء اللہ کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔

اسی حوالے سے ایک اور قرآنی اصطلاح من یشاء کا تذکرہ بھی لازمی ہے۔ عربی زبان کے قوائد کی رو سے من یشآء کے دو معنی ہو سکتے ہیں اوّل یہ کہ ''جیسے اللہ چاہے'' اور دوم یہ کہ ''جو شخص ایسا چاہے''۔ اس بنیاد پر قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیت کے دو تراجم ممکن ہو سکتے ہیں:

یُضِلُّ مَنْ یَّشَآءُ وَ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ ط (۱۶/۹۳)

وہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلت دیتا ہے۔ یا
جو شخص ہدایت لینا چاہے اسے ہدایت مل جاتی ہے اور جو گمراہ رہنا چاہے وہ گمراہ رہتا ہے۔

بالعموم اس آیت کا پہلا ترجمہ کیا جاتا ہے کیونکہ اس سے پھر جبر کا تصوّر ابھرتا ہے اور ایک مطلق العنان خدا کا تصوّر پیدا ہوتا ہے۔ لیکن یہ ترجمہ بہرحال اس بنیاد پر درست نہیں ہے کہ اس سے ظلم کا تصوّر خدا سے منسوب ہوتا ہے جو کہ ممکن نہیں ہے خدا خیر مطلق ہے اس سے شر کا کوئی تصوّر منسوب نہیں کیا جا سکتا یہ ممکن ہی نہیں ہے لہٰذا آیت کا دوسرا ترجمہ اس لیے درست ہے کیونکہ اوّل تو اس سے خدا سے کسی قسم کے شر کا تصوّر منسوب نہیں ہوتا اور یہ قرآن کی مجموعی تعلیمات کے مزاج کے عین مطابق ہے۔

اسی بنیاد پر رزق کے حوالے سے قرآن مجید میں جہاں بھی لفظ من یشآء آیا ہے اگر وہاں فائل خود اللہ تعالیٰ کی ذات ہے تو اس سے مراد یہ ہوگی کہ رزق کی بست و کشاد اللہ کی مشیت سے طے شدہ قوانین کے مطابق ہوتی ہے اور جہاں اس کا فائل انسان ہوگا تو اس کا مفہوم یہ ہوگا۔ کہ انسانوں میں سے جو بھی اللہ کے قوانین مشیت کا اتباع کرے گا اس کا رزق فراواں ہو جائے گا اور جو شخص بھی ان سے اعراض برتے گا اس کا رزق کم ہوتا چلا جائے گا۔

اسی طرح اس حوالے سے دیگر آیات جن میں اسی قسم کا مضمون آیا ہے ان کی بھی یہی

Marfat.com

صورتِ حال ہے مثلاً:

فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۤءُ وَ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۤءُ ؕ (۲/۲۸۴)

وہ جسے چاہتا ہے بخش دیتا ہے جسے چاہتا ہے عذاب دیتا ہے۔ یا

يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاۤءُ وَ يَقْدِرُ ؕ (۱۷/۳۰)

وہ جسے چاہتا ہے کشادہ رزق دیتا ہے اور جس کی چاہتا ہے روزی تنگ کر دیتا ہے۔

متذکرہ بالا دونوں آیات یا اس قسم کی دیگر آیات کے ساتھ بھی وہی صورت حال ہے جو پیچھے بیان کردہ آیت (۱۶/۹۳) کے ساتھ ہے۔ متذکرہ بالا تراجم پر وہی اعتراضات وارد ہوتے ہیں جن کا تذکرہ (۱۶/۹۳) کے حوالے سے کیا گیا ہے۔ لہٰذا ان آیات کے بھی تراجم بالترتیب اس طرح ہونے چاہیں۔

جو چاہے بخشش لے لے اور جو چاہے عذاب لے لے۔ (۲/۲۸۴)

جو چاہے رزق میں کشادگی لے لے اور جو چاہے اپنا رزق تنگ کر لے۔ (۱۷/۳۰)

یہاں واضح رہے کہ بعض آیات میں مَنْ يَّشَاۤءُ کی بجائے مَّنْ نَّشَاۤءُ (جیسا ہم چاہیں) یا من اشآء (جیسے میں چاہوں) کے الفاظ آئے ہیں۔ لہٰذا ان آیات میں فائل صرف اور صرف اللہ کی ذات ہی ہو سکتی ہے۔ تاہم ''خدا کے چاہنے'' سے مراد بھی ظاہر ہے ''خدا کی مشیت'' کے مطابق ہی ہے۔ مثلاً:

نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَاۤءُ ؕ (۶/۸۴)

ہم اپنے قانون مشیت کے مطابق درجات بلند کرتے ہیں۔

اور اس حوالے سے اس کا قانون مشیت یہ ہے کہ:

Marfat.com

لِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا (۴۶/۱۹)

ہر ایک کے درجات اس کے اعمال کے مطابق مرتب ہوتے ہیں۔

یہی صورتِ حال اس حوالے سے دیگر آیات کی بھی ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے یہ کہا کہ وہ اپنی مشیت کے مطابق ایسا کرتا ہے تو قرآن مجید میں ہی کسی دوسرے مقام پر اس قانون مشیت کا حوالہ بھی دے دیا جس کے تحت وہ ایسا کرتا ہے۔

اس حوالے سے بعض مقامات پر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اپنی قدرت کاملہ کے بیان کے لیے یہی اندازِ بیان اختیار کیا ہے مثلاً:

يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ ط (۴۲/۴۹)

وہ جو چاہتا ہے خلق کرتا ہے۔ یا

إِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ (۲۲/۱۴)

جو اس کے ارادے میں ہوتا ہے وہ ایسے ہی کرتا ہے۔ یا

لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَ هُمْ يُسْئَلُوْنَ (۲۱/۲۳)

اس کے کام کے متعلق اس سے کوئی نہیں پوچھ سکتا اور (جو کام یہ لوگ کرتے ہیں اس کی) ان سے پرسش ہوگی۔

إِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ (۵/۱)

اللہ جیسا چاہتا ہے حکم دیتا ہے۔

وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ (۲/۲۵۳)

لیکن اللہ جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے۔

یہ یا اس سے ملتے جلتے دیگر مقامات پر اللہ تعالیٰ نے اپنی مکمل قدرتِ کاملہ کو بیان کیا ہے۔ ان مقامات پر یقیناً اللہ سے پوچھنے والا کوئی نہیں کہ اس نے ایسا کیوں کیا یا فلاں شے کی یہ تقدیر کیوں بنائی دوسری کیوں نہیں بنائی۔ یہ اس کا اختیار مطلق ہے جسے کوئی چیلنج کرنے

والا نہیں۔ تاہم یہاں بھی اللہ ہی کے بیان کردہ ایک عمومی کلیئے کے تحت جس کے تحت اس نے رحمت کو اپنے اوپر فرض کرلیا ہے (٦/٥٤) یہ باآسانی کہا جاسکتا ہے کہ وہ جو چاہے مرضی تخلیق کرے یا قوانین متعین کرے ان تمام امور میں اس کی رحمت اس کی اپنی مخلوقات کے لیے حاوی ہوگی۔

اس بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ انسان کو اختیار وارادہ کی قوت حاصل ہے۔ وہ اپنے فیصلے کرنے میں آزاد ہے تاہم فیصلے کے بعد جو اعمال وہ انجام دیتا ہے ان کے نتائج بدلنے پر وہ کسی صورت قادر نہیں ہے۔ جیسے افعال انجام دیئے جائیں گے ویسے نتائج بھگتنا ہوں گے۔ بُرے افعال کے بُرے نتائج اور اچھے افعال کے اچھے نتائج سامنے آتے ہیں۔ اس حوالے سے کسی کے لیے کوئی رعایت نہیں ہے ایک بدترین بے رحم جبریت ہے لیکن افعال کے نتائج کے لیے اس سے پہلے انسان فیصلے کے لیے آزاد ہے۔

یہی تمام قوانین بشمول معاشی قوانین کی اساس ہے انفرادی سطح پر بھی اور اجتماعی سطح پر بھی کسی کے لیے کوئی استثنٰی نہیں ہے۔ من گھڑت روایات کی خوش فہمیوں کا نشہ سر پہ چڑھا ہوا ہو تو بات الگ ہے ورنہ برسرِ زمین حقائق بہر حال یہی ہیں کہ ایسا کرو گے تو ایسا ہوگا اس سے ماسوا کچھ نہیں۔

آئندہ ابواب میں رزق کی بست وکشاد کے جو قوانین بیان کیے جائیں گے ان کی اساس بھی یہی ہے۔ یعنی ایسا کرو گے تو ایسا ہوگا۔ بالفاظِ دیگر جب رزق کے حوالے سے بات کی جاتی ہے تو قرآن چند مخصوص افعال بیان کرتا ہے کہ اگر یہ مخصوص افعال انسان انجام دے تو ان کے نتیجے میں رزق کشادہ ہوجائے گا اور اگر دیگر مخصوص افعال انجام دے گا تو ان کے نتیجے میں رزق کی تنگی کا سامنا کرنا ہوگا۔ یہ صورتِ حال انفرادی سطح پر بھی ہے اور اجتماعی سطح پر بھی اور کسی کے لیے کوئی استثنٰی نہیں ہے۔ جو جیسا کرنا چاہیے اسی قسم کی تقدیر اس پر منطبق ہوجائے گی۔ اور یہ سب کچھ اللہ کی اپنی مشیت سے طے کردہ اس قانون کے تحت

ہوتا ہے۔

اَللّٰہُ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَ یَقْدِرُ ؕ (۱۳/۲۶)

(اللہ کے قانون مشیت سے مشروط) جو رزق فراواں لینا چاہے (تو اس کی محنت سے مشروط) اسے کھلا رزق مل جائے گا اور جو نپا تلا لینا چاہے اسے نپا تلا ملے گا۔

اب یہ انسان کا اپنا اختیار و ارادہ ہے کہ وہ کونسی تقدیر منتخب کرتا ہے جو جس قسم کی تقدیر منتخب کرتا ہے اسے اسی قسم کے نتائج کا سامنا کرنا ہوگا۔

Marfat.com

باب۴

# صفتِ ربوبیت اور رزاقیت

جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے کہ ذات باری تعالیٰ کی نوعیت و ماہیت انسانی عقل سے ماوراء ہے۔ اللہ تعالیٰ کو صرف اس کی صفات سے ہی جانا جاسکتا ہے۔ موضوع زیر بحث کے اعتبار سے اس کی صرف دو (۲) صفات یعنی صفتِ ربوبیت اور صفت رزاقیت کو اس باب میں زیر بحث لایا جارہا ہے۔

## صفتِ ربوبیت

اللہ تعالیٰ کی صفت ربوبیت قرآن مجید میں بیان کردہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے سب سے اہم صفت اس حوالے سے ہے کہ پورے قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی جن جن صفات کا تذکرہ کیا گیا ہے ان میں سب سے زیادہ دفعہ جس صفت کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ صفتِ ربوبیت ہے۔ جسکا تقریباً ۹۳۹ مقامات پر مختلف حوالوں سے تذکرہ کیا گیا ہے۔

اس کی اہمیت کا اندازہ یوں بھی لگایا جاسکتا ہے کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات میں سے جس صفت کا سب سے پہلے تذکرہ کیا ہے وہ صفتِ ربوبیت ہی ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (۱/۱)

تمام حمد اللہ کے لئے ہے جو تمام عالمین کا رب ہے۔

رب کا مادہ ر ب ب ہے جس کے معنی نشو و نما دینے کے ہوتے ہیں یعنی کسی چیز کو نئی نئی تبدیلیوں سے اس لئے گذارنا تاکہ وہ بتدریج نشو و نما پاتی ہوئی اپنی تکمیل تک پہنچ جائے۔ جس طرح فطرت، قطرۂ نیساں کو موتی بنانے کیلئے نئی نئی تبدیلیوں سے گذارتی اور رفتہ رفتہ اس کی نشو و نما کئے جاتی ہے یہ طریق نشو و نما ربوبیت کہلاتا ہے ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں (۱) کسی چیز کی دیکھ بھال کرنا اور سنوارنا ہیں اسی سے الرب۔ مالک، خالق، کسی چیز کی نگرانی اور اصلاح کرنے والے کو کہتے ہیں۔ (۲) کسی چیز کا جمے رہنا

Marfat.com

اور ایک جگہ قائم رہنا۔ (۳) کسی شے کو کسی دوسری شے سے ملا دینا۔ لہٰذا تسلسل کیساتھ نشوونما دیتے چلے جانا اور درست کرتے رہنا ربوبیت ہے۔

اس بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ رب کے معنی نشوونما دینے والے، پرورش کرنے والے، پایہ تکمیل تک پہنچانے والے اور انتظام کرنے والے کے ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب متذکرہ بالا آیت (۱/۱) میں یہ کہا گیا کہ اللہ تمام جہانوں کا رب ہے تو اس سے مراد یہ ہے کہ وہ تمام ارض و سماوات جو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیے ہیں ان کی نشوونما، پرورش انکا انتظام اور انہیں ان کی منزل مقصود تک پہنچانے کی ذمہ داری اللہ نے خود اپنے ذمے لی ہے۔ ایک طرف اس نے تصور سے کہیں زیادہ وسیع کائنات خلق کی اور اس طرح خلق کی کہ اس میں کسی قسم کی کوئی خامی کسی بھی حوالے سے نہیں ہے ایک مکمل اور جامع کائنات۔ اور دوسری طرف اس لا انتہا وسیع کائنات کا مکمل انتظام و انصرام، ان کی مخلوقات کو رزق کی فراہمی اور انہیں ان کی منزل مقصود تک پہنچانے کا ایک جامع مکمل اور ہمہ گیر نظام ترتیب دیا ہے جو حیطۂ ادارک سے باہر ہے۔ اس شہکار کی تخلیق پر وہ بجا طور پر سزاوار حمد ہے۔

یہ نظام ایک مکمل، جامع اور ہمہ گیر نظام ہے جو از خود کار فرما ہے دنیا کی کسی بھی شے پر غور کیجئے اس کی ابتدا سے انتہا تک تمام مراحل، اس دوران اس کی نگہداشت، پرورش اور تکمیل تک کے تمام مراحل کے دوران حسب حال اسباب کی فراہمی جن پر اس شے کی حیات کا انحصار ہو ایک ایسے خودکار نظام کے تحت فراہم ہوتے چلے جاتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ یہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی صفت ربوبیت کا اعجاز ہے۔ یہ نظام دنیا کے تمام جانداروں پر محیط ہے۔

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا (۱۱/۶)

اس زمین پر چلنے والا کوئی جاندار ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمے داری اللہ پر نہ ہو۔

سمندر کی اتاہ گہرائیوں میں موجود جانداروں کو ان کی خوراک کی فراہمی کا معاملہ ہو یا پہاڑوں کی بلندیوں پر موجود جانداروں کی ضروریات کی تکمیل ہو، انسانوں کی ضروریات کی فراہمی ہو یا کوئی بھی دیگر ضرورت یہ تمام ایک مخصوص نظام کے تحت خود بخود پوری ہوتی چلی جاتی ہیں۔ یہ نظام اتنا جامع اور مکمل ہے کہ اس کی کوئی نظیر پیش نہیں کی جاسکتی۔ اسی وجہ سے کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ ہر شے کا رب ہے۔

قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِىْ رَبًّا وَّهُوَ رَبُّ كُلِّ شَیْءٍ ؕ (۶/۱۶۵)

کہہ دیجئے کہ کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور رب تلاش کروں حالانکہ وہ تو ہر شے کا رب ہے۔

یہ اسی کو زیبا ہے یہ اس کی شان ہے کہ وہ تمام کائنات کی تمام اشیاء کی ابتدا سے انتہا تک ان کی زندگی کے ہر ہر مرحلے میں ان کی نشوونما اور پرورش کے سامان مہیا کرتا ہے۔ ربوبیت چونکہ ایک مسلسل عمل ہے لہٰذا اس سے مراد یہ ہے کہ کسی شے کو اس کی زندگی کے مختلف مراحل میں اس کی ضروریات کے مطابق سامان رزق کی اس طرح فراہمی کہ وہ شے اپنے درجۂ کمال تک پہنچ جائے اور یہ پورا عمل محبت وشفقت کے ساتھ ہو۔ اس کی ایک زندہ مثال خود انسان کی پیدائش سے لیکر اس کی موت تک کا دورانیہ ہے۔ ماں کے پیٹ میں حمل قرار پانے سے اس عمل ربوبیت کا آغاز ہوتا ہے۔ ماں کے پیٹ میں بچے کو مختلف مراحل کے لحاظ سے خود بخود غذا پہنچتی رہتی ہے۔ پیدائش کے بعد بالکل ابتدائی دنوں میں ماں کے دودھ میں پانی کا تناسب زیادہ جبکہ دودھ کے اجزاء کم ہوتے ہیں۔ بچہ جوں جوں بڑا ہوتا جاتا ہے یہ تناسب خودکارانہ انداز میں تبدیل ہوتا چلا جاتا ہے۔ حالانکہ ماں کا جسم وہی ہوتا ہے اور جس انداز میں ماں کے جسم میں دودھ بنتا ہے وہ بھی وہی رہتا ہے تو پھر یہ سب کچھ کس طرح ہوتا ہے؟ یہ یقیناً رب العالمین کی صناعی ہے جس نے ایک ایسا نظام وضع کیا ہے جو خودکارانہ انداز میں انسانی بچے کی تمام ضروریات پوری کرتا چلا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ جب بچہ

Marfat.com

دو (۲) سال کا ہو جاتا ہے تو یہ نظام خودکارانہ انداز میں ختم ہو جاتا ہے کیونکہ اب بچے کو اس کی ضرورت نہیں رہی۔ اس کے بعد بچے کی عمر کے لحاظ سے اسے غذا دی جاتی ہے اور یہ سلسلہ تا حیات چلتا رہتا ہے۔ کیا یہ سب کچھ "فطرت کی اندھی قوت" کے بس میں ہے؟ یقیناً نہیں یہ ممکن ہی نہیں یہ سب کچھ رب العالمین کی عطاء ہے۔

یہ تو لاتعداد مظاہر ربوبیت میں سے محض ایک مثال ہے۔ اگر اس پوری زمین کے نظام کو دیکھا جائے تو پوری زمین کا نظام ایک خاص نظم وضبط اور میکانیت کے تحت چل رہا ہے۔ جس کے تحت ہر جاندار کی مخصوص ضرورت کو اس کے مخصوص تناظر میں خود بخود پورا کیا جا رہا ہے اور ہر ایک کو اس کی ضرورت کے مطابق غذا وقت پر ایک مخصوص نظم وضبط کیساتھ مل رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں جہاں صفت ربوبیت کا تذکرہ ہے وہیں نعمائے خداوندی کی قدر اور مقدار کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ بالفاظ دیگر اللہ اپنی نعمتیں اندھا دھند نہیں لٹاتا بلکہ ایک خاص مقدار اور قدر کے اعتبار سے انہیں عطا کرتا ہے بالفاظ دیگر یہ عطاء ایک خاص قانون کے تحت ہے۔

وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُہٗ وَمَا نُنَزِّلُہٗٓ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ (۱۵/۲۱)

اور کوئی شے ایسی نہیں جس کے خزانے ہمارے پاس نہ ہوں لیکن ہمارا طریق کار یہ ہے کہ جو کچھ نازل کرتے ہیں ایک خاص مقدار میں نازل کرتے ہیں۔

یہ ایک عمومی کلیہ ہے اور تمام کائنات پر یکساں محیط کہ ہر شے ایک خاص قاعدے قانون کی پابند ہے۔

وَکُلُّ شَیْءٍ عِنْدَہٗ بِمِقْدَارٍ ؕ (۱۳/۸)

اللہ کے نزدیک ہر شے کا ایک اندازہ مقرر ہے۔

اللہ کی یہ سنت اس کی پیدا کردہ تمام اشیاء پر یکساں انداز میں محیط ہے۔

Marfat.com

اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ (۵۴/۴۹)

ہم نے جتنی بھی چیزیں پیدا کی ہیں ایک اندازے کیساتھ پیدا کی ہیں۔

یہاں ''بقدر معلوم'' (۲۱/۱۵) سے بنیادی طور پر مراد یہ ہے کہ جس کو جتنی ضرورت ہے اس کے مطابق ہر جاندار شے کو مطلوبہ شے مل جاتی ہے۔ اس نظم گہہ کائنات کا بنیادی مقصد تمام ضرورتمندوں کو ان کی ضرورت کی اشیاء کی بروقت فراہمی ہے۔

اس حوالے سے ایک اور توجہ طلب پہلو اس پورے نظام کی یکسانیت اور ہم آہنگی بھی ہے۔ تمام جانداروں کو ایک ہی طریقے سے سامان پرورش فراہم ہوتا ہے چاہے وہ پتھر کی چٹان ہو، پھول ہو، انسانی بچہ ہو یا جانور سب ایک ہی منظم و مربوط نظام میں پروئے ہوئے ہیں سب کا آغاز و انجام ایک ہی جیسا ہوتا ہے۔ جس طرح انسان پیدا ہوتا ہے بچپن، لڑکپن، نوجوانی، ادھیڑ عمری اور بڑھاپے کے مراحل سے گذرتا ہوا مر جاتا ہے یہی صورت حال دیگر تمام چیزوں کے ساتھ بھی ہے۔

اس کے علاوہ اس حوالے سے ایک اور اہم پہلو ہر شے اور اس کے ماحول کی مطابقت بھی ہے۔ ہر شے اپنے ماحول سے قطعی طور پر ہم آہنگ ہوتی ہے۔ گرم مرطوب علاقے کی نباتات و جمادات کی ساخت اپنے ماحول کے اعتبار سے ہوتی ہے جو سرد علاقوں کی صورت حال کے لحاظ سے تبدیل ہو جاتی ہے۔ بالالفاظِ دیگر کوئی بھی شے اپنے ماحول کے لحاظ سے اجنبی نہیں ہوتی۔ یہ بھی صفت ربوبیت کی نمایاں خصوصیت ہے۔ جس کے تحت ہر مخلوق اپنے چاروں طرف وہی ماحول پاتی ہے جس میں اس کے لئے پرورش اور نشوونما کا سامان موجود ہوتا ہے۔ دریاؤں میں پرندے نہیں ہوتے، مچھلیاں خشکی پر نہیں ہوتیں۔ گویا آسمانوں اور زمین کی تمام حیات کو ان کی ضرورت کے مطابق ضروریات کے فراہمی ہی ربوبیت ہے۔

اسی وجہ سے خود قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اپنی اس صفت کا تعارف ان الفاظ میں

Marfat.com

کروایا ہے۔

قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ٥ قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ؕ اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ٥ (۲۶/۲۳۔۲۴)

فرعون نے کہا رب العالمین کیا؟ کہا آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان دونوں میں ہے سب کا رب، بشرطیکہ تم یقین رکھتے ہو۔

ان الفاظ کا اعادہ (۴۴/۷) میں بھی کیا گیا ہے۔ اس کی مزید وضاحت اس حوالے سے اسی سورۃ میں اگلی آیات میں ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

الَّذِيْ خَلَقَنِيْ فَهُوَ يَهْدِيْنِ ٥ وَالَّذِيْ هُوَ يُطْعِمُنِيْ وَيَسْقِيْنِ ٥ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ ٥ وَالَّذِيْ يُمِيْتُنِيْ ثُمَّ يُحْيِيْنِ ٥

(۲۶/۷۸۔۸۱)

جس نے مجھے پیدا کیا اور وہی مجھے راستہ دکھاتا ہے اور جو مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے اور جب بیمار پڑتا ہوں تو مجھے شفا بخشتا ہے وہ جو مجھے موت دے گا (اور) پھر زندہ کرے گا۔

سورۃ المومنین میں اس حوالے سے ارشاد ربانی ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ط (۴۰/۶۴)

اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو ٹھہرنے کی جگہ اور آسمان کو چھت بنایا اور تمہاری صورتیں بنائیں اور بہت اچھی بنائیں اور تمہیں پاکیزہ چیزیں کھانے کو دیں یہی اللہ تمہارا رب ہے پس اللہ بہت برکتوں والا ہے اور تمام جہانوں کا رب ہے۔

Marfat.com

متذکرہ بالا آیت کے تجزیے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفت ربوبیت انسانوں کو سامان نشو ونما کی فراہمی سے لیکر پوری کائنات کی ہر ہر شے کو اس کے لوازماتِ حیات کی فراہمی پر محیط ہے۔ باالفاظ دیگر یہ ایک عمومی صفت ہے اور تمام کائنات کی اشیاء کو حیات تا موت جن جن ضروریات کی احتیاج ہوتی ہے وہ ان کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے فراہم کی جاتی ہیں۔ یہی ربوبیت ہے اور اسی بنیاد پر اللہ تعالیٰ رب العالمین ہے۔

## رزق

اس سے قبل کہ اللہ تعالیٰ کی صفت رزاقیت پر بحث کی جائے رزق کے معنی کا تعین ضروری ہے۔ رزق کا مادہ رزق ہے جس سے مراد ہر وہ شے ہوتی ہے جس سے نفع اٹھایا جائے یا غذا جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ذی حیات کو بطور سامان نشو ونما ملے، بارش کو بھی رزق کہا جاتا ہے اور مقررہ آمدنی کو بھی۔ قرآن مجید میں تمام کھانے پینے کی چیزوں کو رزق اللہ (۲/۶۰) کہا گیا ہے۔ سورۃ حجر میں معایش اور رزق ہم معنی استعمال ہوئے ہیں۔ رزق سے مراد غذائی اجناس لی جاتی ہیں۔ بعض مفسرین کے نزدیک رزق سے مراد وہ تمام اشیاء ہیں جو اللہ تعالیٰ حیوان کو بہم پہنچاتا ہے اور وہ اسے کھاتا ہے۔ بعض مفکرین کے نزدیک رزق میں مباح اور حرام اشیاء دونوں شامل ہیں۔ بعض کے مطابق رزق وہ چیز ہے جس سے نفع اٹھانا شرعاً ممنوع نہ ہو۔ ابن خلدون کے نزدیک انسان کی صرف وہی اشیاء اس کا رزق کہلا سکتی ہیں جو اس کے ذاتی صرف اور استعمال میں آجائیں اور جن سے وہ فائدہ اٹھالے چنانچہ مرنے والا جو نفع بخش اشیاء اپنے پیچھے چھوڑتا ہے وہ اس کی نسبت سے رزق نہیں بلکہ اس کے ورثاء کی نسبت سے رزق کا مصداق ہوتی ہیں۔

ان تعریفات کی رو سے کہا جا سکتا ہے کہ رزق میں عام غذائی اجناس سے لیکر عام استعمال کی تمام اشیاء شامل ہیں چاہے یہ ضروریات، سہولیات یا تعیشات کے زمرے میں ہی

Marfat.com

کیوں نہ آتی ہوں۔

قرآن مجید میں بھی رزق کی اصطلاح عام غذائی اجناس سے لیکر عام ضرویات زندگی، زراور مال ودولت تک محیط ہے۔

## رزق بمعنی غذائی اجناس

فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ وَّاَنْبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا وَّكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ (۳/۳۷)

تب اس کے رب نے اسے بہت اچھی طرح قبول کیا اور اس کی اچھی طرح پرورش کی اور زکریا کو اسکا متکفل بنایا زکریا جب کبھی عبادت گاہ میں اس کے پاس جاتے تو اس کے پاس رزق پاتے (یہ کیفیت دیکھ کر ایک دن مریم سے) پوچھنے لگے یہ رزق تمہارے پاس کہاں سے آتا ہے وہ بولیں یہ اللہ کی جانب سے ہے اور اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے۔

متذکرہ بالا آیت کریمہ (۳/۳۷) میں ان عام غذائی اجناس کو جو عبادت گاہ میں اس وقت کے رواج کے مطابق پہنچائی جاتی تھیں رزق کہا گیا ہے۔

اس کے علاوہ اللہ کی راہ میں مارے جانیوالے لوگوں کو بھی چونکہ وہ زندہ ہیں لہٰذا انہیں ان کے رب کی طرف سے رزق ملتا ہے۔ یہاں بھی رزق غذا کے معنوں میں ہے۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ (۳/۱۶۹)

جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں تم ان کو ہرگز مردہ مت سمجھو وہ اپنے رب کی پاس زندہ ہیں انہیں رزق ملتا ہے۔

Marfat.com

## رزق بمعنی زر یا مال

قرآن مجید میں رزق کی اصطلاح زر یا مال کے حوالے سے بھی استعمال کی گئی ہے مثلاً سورۃ البقرہ میں ارشاد ربانی ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ وَّالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (۲/۲۵۴)

اے اہل ایمان! جو رزق ہم نے تم کو دیا ہے اس میں سے اس دن کے آنے سے پہلے کہ جس میں نہ کسی قسم کی (خرید و) فروخت، نہ دوستی نہ شفاعت ہوگی انفاق کرو اور انکار کرنیوالے (اپنے آپ پر) ظلم کرنے والے ہیں۔

اس آیت کریمہ میں روزِ قیامت سے پہلے اللہ کے دیئے ہوئے رزق میں سے انفاق کا حکم دیا گیا ہے۔ انفاق متعدد شکلوں میں ممکن ہے اس کی ایک شکل غذائی اجناس کو اللہ کی راہ میں دینا ہے تاہم عام مروج شکل زر یا مال کو اللہ کی راہ میں دینا ہے اس لحاظ سے اس آیت میں رزق کو زر یا مال کے مترادف استعمال کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ بھی بعض مقامات پر رزق کو مال و دولت کے مترادف استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً:۔

تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ (۳/۲۷)

تو رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور بے جان سے جاندار نکالتا ہے اور جاندار سے بے جان نکالتا ہے اور (اللہ) جسے چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے۔

اس آیت کریمہ میں ظاہر ہے بے حساب رزق سے مراد غذائی اجناس کی فراوانی سے لیکر عام مال و دولت کی کثرت بھی مراد ہے۔ لہٰذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ قرآنی اصطلاح

Marfat.com

رزق عام غذائی اجناس سے لیکر مال و دولت تک محیط ہے۔

## صفتِ رزاقیت

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ ربوبیت ایک عمومی صفت ہے جسکے تحت اللہ تعالیٰ تمام کائنات کی نشو و نما اور پرورش کر رہا ہے تاہم یہ نشو و نما اور پرورش رزق کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا رب کیلئے لازمی ہے کہ وہ رزق دینے والا یعنی رزاق بھی ہو۔ اس لحاظ سے رزاقیت، ربوبیت کا لازمی نتیجہ ہے۔ یہی وجہ ہے قرآن مجید میں اسی (۸۰) مقامات پر رزق کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے۔ تیرہ مقامات پر رزقناھم، سات مقامات رزقناکم، نو مقامات پر رزقکم اللہ، چار جگہوں پر رزقھم اللہ، پانچ مقامات پر یرزقکم، چار مقامات پر یرزق، ایک مقام پر ترزق، تین جگہوں پر نرزق، ایک جگہ پر یرزقہ، ایک جگہ پر یرزقھا، ایک مقام پر رزقناہ، ایک جگہ پر ارزقنی، ایک جگہ ارزقنا، ایک جگہ ارزقھم، یہ تمام کلمات ماضی، مضارع اور امر کی صورت میں فعلی صیغے ہیں اور سب میں فاعل اللہ تعالیٰ ہے۔ تاہم یہ یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ نے خود کو خیر الرزاقین (۲۲/۵۸) کہا ہے جس کا لامحالہ مطلب ہے کہ خود اللہ تعالیٰ نے اپنے علاوہ بھی رازق تسلیم کیئے ہیں تاہم یہ ایک الگ مسئلہ ہے کہ جو رازق ہیں وہ خود بھی اللہ ہی سے رزق مانگتے ہیں۔ یہاں رازق سے مراد وہ عام انسان ہیں جو دیگر انسانوں کو رزق کی فراہمی کا ذریعہ بن جاتے ہیں مثلاً کسی کارخانے کا مالک کارخانے کے مزدوروں کیلئے رزق کا ذریعہ بن جاتا ہے حکومتیں اپنے ملازمین کو رزق کا سبب بن جاتی ہیں وغیرہ وغیرہ۔

جس طرح ربوبیت بلا تخصیص ہے اسی طرح رزاقیت بھی بلا کسی استثنیٰ کے ہے۔

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا كُلٌّ فِي كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ؕ (۱۱/۶)

اور زمین میں کوئی ایسا جاندار نہیں ہے جس کا رزق اللہ کے ذمے نہ ہو وہ اس کی عارضی رہائش گاہ کو اور اس کی مستقل رہائش گاہ کو جانتا ہے یہ (سب) کچھ (ایک) واضح قانون کے تحت ہے۔

اور رازق حقیقی صرف اور صرف اللہ کی ذات ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ ۝ (۵۱/۵۸)

اللہ ہی سب کا رازق ہے جو قوت والا اور متین ہے۔

اللہ کے سوا کوئی ہستی اس قابل نہیں کہ وہ رزق دے سکے لہٰذا رزق صرف اور صرف اللہ سے ہی طلب کیا جانا چاہیے کیونکہ اس کے علاوہ کوئی اور ہستی یہ اختیار ہی نہیں رکھتی۔

اِنَّمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا وَّتَخْلُقُوْنَ اِفْكًا اِنَّ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوْهُ وَاشْكُرُوْا لَهٗ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ (۲۹/۱۷)

تم اللہ کے سوا دوسری ہستیوں کی عبادت کرتے ہو اور جھوٹی باتیں بناتے ہو اور جن کی تم اللہ کے سوا پرستش کرتے ہو وہ تمہیں رزق نہیں دے سکتیں پس اللہ سے رزق مانگو اور اسی کی عبادت کرو اور اسکا شکر ادا کرو اور تم اسی کی طرف لوٹ کر جاؤ گے۔

یہ نعمت رزق بلا کسی استثنیٰ تمام انسانوں کیلئے ہے اور اس کی جانب سے ہے جو خالق حقیق ہے جس کے سوا کوئی الہ نہیں ہے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ (۳۵/۳)

اے لوگو اللہ کی جو نعمت تم پر نازل ہوئی ہے اس کو یاد کرو کیا اللہ کے سوا کوئی

Marfat.com

اور خالق ہے جو آسمان اور زمین سے تمہیں رزق دیتا ہو؟ اس کے سوا کوئی الہ نہیں پھر تم کدھر بھکے چلے جا رہے ہو؟

سورۃ سبا میں اس حقیقت کا اعادہ اس انداز میں کیا گیا ہے۔

قُلۡ مَنۡ یَّرۡزُقُکُمۡ مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ قُلِ اللّٰہُ ۙ (۳۴/۲۴)

کہہ دیجئے کہ تم کو آسمانوں اور زمین سے کون رزق دیتا ہے کہہ دیجئے (کہ) اللہ۔

اس حوالے سے بے شعور اور باشعور مخلوقات میں بھی کوئی فرق نہیں ہے۔

وَ کَاَیِّنۡ مِّنۡ دَآبَّۃٍ لَّا تَحۡمِلُ رِزۡقَہَا ٭ۖ اَللّٰہُ یَرۡزُقُہَا وَ اِیَّاکُمۡ ۫ۖ وَ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ؕ (۲۹/۶۰)

اور بہت سے جانور ہیں جو اپنا رزق اٹھائے نہیں پھرتے اللہ ہی ان کو رزق دیتا ہے اور تم کو بھی وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

## رزق کا ذریعہ زمین ہے

اللہ رازقِ حقیقی ہے اور انسانوں اور دیگر زمینی مخلوقات کو زمین کے ذریعے رزق فراہم کرتا ہے۔

وَ جَعَلۡنَا لَکُمۡ فِیۡہَا مَعَایِشَ وَ مَنۡ لَّسۡتُمۡ لَہٗ بِرٰزِقِیۡنَ ؕ (۱۵/۲۰)

اور اس میں (زمین میں) ہم نے تمہارے لئے اور ہر اس مخلوق کیلئے جسے تم رزق نہیں دیتے معیشت کے سامان پیدا کیئے ہیں۔

اسی نے زمین کو اس قابل کیا ہے کہ وہ انسانوں کے رہنے کے قابل بن سکے انسان اس پر آسانی سے چل پھر سکیں اور اس سے اپنا رزق حاصل کر سکیں۔

ہُوَ الَّذِیۡ جَعَلَ لَکُمُ الۡاَرۡضَ ذَلُوۡلًا فَامۡشُوۡا فِیۡ مَنَاکِبِہَا وَ کُلُوۡا مِنۡ رِّزۡقِہٖ ؕ (۶۷/۱۵)

Marfat.com

وہی تو ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو نرم کیا اس کی راہوں میں چلو پھرو اور اللہ کا دیا ہوا رزق کھاؤ۔

اس نے زمین پر ایسے اسباب پیدا کیئے ہیں جس سے انسانوں کے لئے رزق کا حصول ممکن ہوسکا ہے۔ بارش کا برسنا، پھلوں کی پیداوار، کشتیوں، جہازوں اور نہروں کو انسانوں کیلئے مسخر کیا تاکہ ان کے ذریعے انسان رزق حاصل کرسکیں۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِیَ فِی الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ (۱۴/۳۲)

اللہ ہی تو ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور آسمان سے مینہ برسایا پھر اس سے تمہارے کھانے کیلئے پھل پیدا کیئے اور کشتیوں کو تمہارے زیر فرمان کیا تاکہ دریا میں اس کے حکم سے چلیں اور نہروں کو بھی تمہارے لئے مسخر کردیا۔

اسی حوالے سے سورۃ البقرہ میں ارشاد ربانی ہے۔

الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۲/۲۲)

وہی ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو بچھونے اور آسمان کو چھت کے طور پر بنایا ہے اور بادلوں سے پانی اتارا ہے پھر اس (پانی) کے ذریعے میوؤں کی قسم کا رزق تمہارے لیئے نکالا ہے پس تم اللہ کے ہمسر نہ بناؤ اور تم جانتے تو ہو۔

## زمین کی تخلیق فراہمیٔ رزق کے لئے ہے

زمین کی تخلیق، پورا موسمیاتی نظام، زرعی اجناس کی پیداوار کی میکانیت اور اس سے متعلقہ تمام چیزوں کی تخلیق کا مقصد بندوں کو رزق کی فراہمی ہے۔

وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّحَبَّ الْحَصِيْدِ ۝ وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ ۝ رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ ۙ وَاَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا ؕ كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ (۵۰/۹-۱۱)

اور ہم نے بادل سے برکت والا پانی اتارا ہے پھر اس کے ذریعے سے ہم باغ اگاتے ہیں اور کاٹی جانے والی کھیتی کے دانے بھی۔ لمبے لمبے کھجوروں کے درخت بھی اگاتے ہیں جن میں پھلوں کے خوشے لگتے ہیں جو خوب ایکدوسرے پر چڑھے ہوئے ہوتے ہیں۔ (ہم نے) بندوں کو رزق دینے کے لئے (ایسا کیا ہے) اور ہم اسی (پانی) کے ذریعے مردہ زمین کو زندہ کرتے ہیں اور اسی طرح سے مرنے کے بعد نکلنا ہوگا۔

## رازق حقیقی صرف اللہ کی ذات ہے

چونکہ بندوں کو رزق کی فراہمی کا یہ تمام نظام اللہ کی تخلیق ہے لہٰذا اس حوالے سے کلی اختیار صرف اور صرف اللہ کی ذات کو حاصل ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ (۵۱/۵۸)

اللہ ہی رزق دینے والا اور قوت والا اور متین ہے۔

اس آیت میں واضح اور دوٹوک انداز میں اس حقیقت کا اظہار کیا گیا ہے کہ رازق صرف اللہ کی ذات ہے۔ اس آیت میں اللہ کی جن صفات کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ قوت اور متین ہیں۔ ذوالقوۃ سے مراد ایسی ذات ہوتی ہے جو خود محکم اور مضبوط ہو۔ اسی کی وضاحت ایک دوسرے مقام پر یہ کہہ کر کی گئی ہے کہ اللہ کی تدبیر بڑی محکم، مضبوط اور شدید

Marfat.com

ہوتی ہے۔

اِنَّ کَیۡدِیۡ مَتِیۡنٌ (۷/۱۸۳)

میری تدبیر (بڑی) مضبوط ہے۔

اللہ کی تدبیر کا کوئی توڑ نہیں ہوسکتا اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی ایک صفت المتین (۵۸/۵۱) ہے یعنی جو خود بھی محکم ہے اور دوسروں کو بھی قوت واستحکام دینے والا ہے۔

یہاں پہلے صفت رزاقیت اور پھر بعد میں صفت قوت اور صفت متین کا تذکرہ بہت اہمیت کا حامل ہے۔ رزق ہمیشہ سے بنی نوع انسان کی بنیادی ضرورت ہے اور تا قیامت رہے گا۔ اگر کوئی فرد یا قوم رزق کیلئے دوسرے افراد یا اقوام کی محتاج ہے تو ظاہر ہے اس کی تمام قوت بے معنی ہے۔ رزق ہی بنیاد ہے اسی سے افراد اور اقوام قوت حاصل کرتی ہیں اور یہ قوت اللہ ہی کی عطا کردہ ہوتی ہے جو خود بھی مستحکم ہے اور دوسروں کو بھی قوت اور استحکام عطا کرنے والا ہے۔ یہ قوت اور استحکام ظاہر ہے رزق ہی کے توسط سے ہوتا ہے۔ اس کی یہ عطا کسی خاص مخلوق کیلئے نہیں ہے جب اس نے یہ پوری کائنات تخلیق کی اس کی ربوبیت کی ذمے داری لی تو ظاہر ہے تمام مخلوق کی رزاقیت کی ذمے داری بھی اسی کی ہے۔

وَجَعَلۡنَا لَكُمۡ فِيۡهَا مَعَايِشَ وَمَنۡ لَّسۡتُمۡ لَهٗ بِرٰزِقِيۡنَ (۱۵/۲۰)

اور ہم نے ہی نے تمہارے لیئے اور ان لوگوں کے لئے جن کو تم رزق نہیں دیتے اس میں (زمین میں) معاش کے سامان پیدا کیئے ہیں۔

اس حوالے سے سورۃ الاعراف میں ارشاد ربانی ہے:۔

وَلَقَدۡ مَكَّنّٰكُمۡ فِى الۡاَرۡضِ وَجَعَلۡنَا لَكُمۡ فِيۡهَا مَعَايِشَ ؕ قَلِيۡلًا مَّا تَشۡكُرُوۡنَ (۷/۱۰)

اور ہم ہی نے زمین میں تمہارے لئے ٹھکانا بنایا اور اس میں تمہارے لئے

Marfat.com

سامان معیشت پیدا کیئے مگر (تم) کم ہی شکر کرتے ہو۔

ارض وسما کی تخلیق ہی اس انداز میں کی گئی ہے کہ وہ انسانوں اور دیگر مخلوقات کو رزق کی فراہمی کا ذریعہ ہیں۔

یَاَیُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ (۳۵/۳)

لوگو! خدا کے جو تم پر احسانات ہیں انکو یاد کرو کیا اللہ کے سوا کوئی اور خالق ہے جو تم کو آسمان اور زمین سے رزق دے اس کے سوا کوئی الہ نہیں پس تم کہاں بھٹکتے پھرتے ہو؟

اس آیت میں جو توجہ طلب امر ہے وہ یہ ہے کہ آسمان اور زمین سے رزق کی فراہمی کا تذکرہ کیا گیا ہے لیکن صفت رزاقیت نہیں بلکہ صفت خالقیت کا تذکرہ کیا گیا ہے باالفاظ دیگر یہ بتانا مقصود ہے کہ آسمان اور زمین کی تخلیق ہی اس طرح کی گئی ہے کہ وہ انسانوں اور دیگر تمام مخلوقات کو رزق کی فراہمی کا ذریعہ ہیں۔ اگر انسان اس کائنات پر تدبر کرے تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آجائے گی کہ صرف اللہ ہی وہ ہستی ہے جس کے سوا کوئی الہ نہیں یعنی صرف اس کے قانون کی اطاعت واجب ہے یا اسی کی محکومی روا ہے اسی وجہ سے آیت کے آخری الفاظ میں یہ کہا گیا کہ "تم کہاں بھٹکتے پھرتے ہو"؟ جب ایک ہی الہ ہے تو ادھر ادھر بھاگنے کا کیا مقصد؟ کیونکہ اللہ کے علاوہ کوئی اور ہستی یہ استطاعت رکھتی ہی نہیں ہے کہ وہ رزق دے سکے۔

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ شَيْئًا وَّلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ (۱۶/۷۳)

اور اللہ کے سوا ایسوں کی عبادت کرتے ہیں جو ان کو آسمانوں اور زمین میں رزق دینے کا ذرا بھی اختیار نہیں رکھتے اور نہ (کوئی اور) استطاعت رکھتے ہیں۔

Marfat.com

اس حقیقت کا اعادہ سورۃ العنکبوت میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

اِنَّمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ اَوْثَانًا وَّتَخْلُقُوْنَ اِفْکًا اِنَّ الَّذِیْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ لَا یَمْلِکُوْنَ لَکُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰہِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوْہُ وَاشْکُرُوْا لَہٗ اِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ (۲۹/۱۷)

تم اللہ کے سوا دوسری ہستیوں کی عبادت کرتے ہو اور جھوٹی باتیں کرتے ہو وہ جنکی تم اللہ کے سوا اطاعت کرتے ہو تمہیں رزق نہیں دے سکتے پس اللہ سے ہی رزق طلب کرو اسی کی عبادت کرو اسکا شکر ادا کرو اسی کی طرف تم کو لوٹ کر جانا ہے۔

اس آیت میں اللہ سے رزق طلب کرنے کیلئے جو لفظ استعمال کیا گیا ہے وہ ابتغو ہے جس کا مادہ ب غ ی ہے اس کے بنیادی معنی کسی شے کا طلب کرنا اور بگڑ جانا ہے۔ ابتغاء کے معنی کسی چیز کو حاصل کرنے کی کوشش کے بھی ہیں۔ اگر شے اچھی ہو تو یہ سعی محمود اور اگر شے خراب ہو تو کوشش مذموم کہلاتی ہے۔ لہٰذا یہاں طلب کرنے سے مراد ہاتھ پہ ہاتھ دھر کر محض طلب کیئے جانا نہیں بلکہ حصول رزق کیلئے جدوجہد ہے۔ اور اس سعی و جدوجہد کا نتیجہ صرف اللہ سے طلب کیا جانا چاہیے۔ کیونکہ اسی کے پاس رزق کی تمام کنجیاں ہیں۔

هُوَ الَّذِیْ یُرِیْکُمْ اٰیٰتِہٖ وَیُنَزِّلُ لَکُمْ مِّنَ السَّمَآءِ رِزْقًا وَمَا یَتَذَکَّرُ اِلَّا مَنْ یُّنِیْبُ (۴۰/۱۳)

وہی تو ہے جو تم کو اپنی نشانیاں دکھاتا ہے اور تم پر آسمان سے رزق اتارتا ہے اور نصیحت تو وہی پکڑتا جو اس کی طرف رجوع کرتا ہے۔

قُلْ مَنْ یَّرْزُقُکُمْ مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ قُلِ اللّٰہُ (۳۴/۲۴)

پوچھئے کہ تم کو آسمانوں اور زمین سے کون رزق دیتا ہے کہہ دیجئے کہ اللہ۔
کیونکہ وہ اگر رزق روک لے تو کوئی دوسرا ایسا نہیں جو روکا گیا رزق بحال کر سکے۔

اَمَّنْ هٰذَا الَّذِیْ یَرْزُقُکُمْ اِنْ اَمْسَکَ رِزْقَہٗ بَلْ لَّجُّوْا فِیْ عُتُوٍّ وَّنُفُوْرٍ

(۶۷/۲۱)

بھلا اگر وہ اپنا رزق روک لے تو کون ہے جو تم کو رزق دے؟ لیکن یہ (کفار) سرکشی اور نفرت میں پھنسے ہوئے ہیں۔

چونکہ رزق پر مکمل اختیار اسی کا ہے لہٰذا وہ انسانوں کو ایسے ذرائع سے بھی رزق دینے پر قادر ہے جو انسانوں کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتے۔

وَّیَرْزُقْہُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ ؕ وَمَنْ یَّتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ فَھُوَ حَسْبُہٗ ؕ

(۶۵/۳)

اور اس کو ایسی جگہ سے رزق دے گا جہاں سے گمان بھی نہ ہو اور جو خدا پر توکل کرے گا تو وہ اس کی کفالت کرے گا۔

## نوعِ انسانی کو پاکیزہ چیزوں میں سے رزق دیا گیا ہے

اللہ تعالیٰ کا نوعِ انسانی پر دیگر لاتعداد احسانات میں سے ایک احسان یہ بھی ہے کہ اس نے اپنی اس نوع کو پاکیزہ چیزوں میں سے رزق دیا ہے۔

اَللّٰہُ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّصَوَّرَکُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَکُمْ وَرَزَقَکُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ ؕ ذٰلِکُمُ اللّٰہُ رَبُّکُمْ ۚۖ فَتَبٰرَکَ اللّٰہُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ

(۶۴/۴۰)

اللہ ہی ہے جس نے زمین کو تمہارے لئے ٹھہرنے کی جگہ اور آسمان کو چھت بنایا ہے اور تمہاری صورتیں بنائیں اور صورتیں بھی اچھی بنائیں اور تمہیں پاکیزہ چیزوں میں سے رزق دیا یہی اللہ تمہارا رب ہے تمام عالمین کا رب بہت برکت والا ہے۔

ان آیت میں مقام تدبر یہ ہے کہ زمین کو ٹھہرنے کی جگہ، آسمان کو چھت اور انسب

Marfat.com

انسانی تخلیق اور تخلیق کے بعد طیب چیزوں سے رزق کی فراہمی کے بعد کہا گیا ہے ذلکم اللہ ربکم یہ اللہ تمہارا رب ہے۔ ذلکم کا مادہ ذا ہے یہ اشارہ قریب کیلئے ہے یعنی ایک ہستی جو قریب ہی نظر آ رہی ہو۔ باالفاظِ دیگر یہ چیزیں جن کا اس آیت کریمہ میں تذکرہ کیا گیا ہے وہ اللہ کی آیات ہیں اور ان آیات سے اللہ کی ہستی اثبات ممکن ہے۔

اس حقیقت کا اعادہ سورۃ النحل میں آیت (۱۶/۷۲) میں بھی کیا گیا ہے۔

## مقدارِ رزق

اللہ خالق کائنات ہے اور اس کے تمام اسرار و رموز سے مکمل واقف ہے وہ اپنی تمام نعمتوں کو انسانوں اور دیگر مخلوقات کیلئے ایک خاص معلوم مقدار کے مطابق اتارتا ہے۔

وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ (۱۵/۲۱)

اور ہمارے ہاں ہر چیز کے خزانے ہیں اور ہم ان کو ایک مناسب مقدار میں اتارتے رہتے ہیں۔

رزق بھی انہی نعمتوں میں شامل ہے اور اس پر بھی اسی سنت الٰہی کا اطلاق ہوتا ہے۔

وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِی الْاَرْضِ وَلٰكِنْ یُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا یَشَآءُ اِنَّهٗ بِعِبَادِهٖ خَبِیْرٌۢ بَصِیْرٌ (۴۲/۲۷)

اور اگر خدا اپنے بندوں کیلئے رزق میں فراخی کر دیتا تو زمین میں فساد کرنے لگتے لیکن وہ جس قدر چاہتا ہے اسی اندازے کے ساتھ نازل کرتا ہے بے شک وہ اپنے بندوں کو جانتا اور دیکھتا ہے۔

## رزق کی تقسیم کی ذمے داری انسانوں پر ہے

جہاں تک وسائل رزق کا تعلق ہے وہ اللہ تعالیٰ نے پیدا کر دیئے ہیں بلکہ جیسا کہ عرض کیا گیا کہ از روئے قرآن زمین کی تخلیق کا مقصد ہی یہ بیان کیا گیا کہ وہ انسانوں کو رزق کی فراہمی کا ذریعہ بنے (۵۰/۹-۱۱) رزق کے خزانوں کی تمام کنجیاں اللہ کے پاس

Marfat.com

ہیں وہ انہیں انسانوں کی ضروریات کے مطابق اتارتا رہتا ہے (۲۱/۱۵) تاہم وسائل رزق کی تقسیم کی ذمے داری اللہ نے اپنے اوپر نہیں لی بلکہ اسے انسانوں پر چھوڑ دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صفت ربوبیت کے حوالے سے اللہ تعالیٰ نے خود اپنے لئے پورے قرآن مجید میں کہیں بھی جمع کا صیغہ استعمال نہیں کیا یعنی ربوبیت کے حوالے سے کہیں بھی اپنے لئے ''ربانین'' کی اصطلاح استعمال نہیں کی کیونکہ یہ ممکن ہی نہیں تھا۔ اللہ کے سوا کوئی ایسی ہستی نہیں ہے جو اس کائنات کی ربوبیت کی ذمے داری لے سکے۔ لیکن رزق کے حوالے سے اللہ تعالیٰ نے دیگر ''رازقین'' کے وجود کو تسلیم کیا ہے۔

وَاللّٰهُ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ (۶۲/۱۱)

اور اللہ سب سے بہتر رزق دینے والا ہے۔

یہ ایک الگ مسئلہ ہے کہ یہ تمام ''رازق'' بھی خود اسی کے محتاج ہیں کیونکہ وہ انسانی دنیا میں دیگر انسانوں کو محض رزق کی فراہمی کا ذریعہ بنتے ہیں جیسا کہ پیچھے مثالیں دی جاچکی ہیں اور اللہ ان سب سے بہتر اور اعلیٰ ترین اور اکمل ترین رازق بلکہ رازق حقیقی ہے۔

رزق کے (اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ) ذرائع کی تقسیم کس طرح انسانوں کے ذریعے ہوتی ہے یا بالفاظ دیگر یہ ذمے داری کس طرح انسانوں پر آتی ہے اس کا اندازہ سورۃ النحل کی مندرجہ ذیل آیت سے ہوتا ہے۔

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِى الرِّزْقِ ۚ فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّىْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ ۚ اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ (۱۶/۷۱)

اللہ نے رزق میں بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے تو جن لوگوں کو فضیلت دی گئی ہے وہ اپنا رزق اپنے مملوکوں کو نہیں پہنچاتے تا کہ وہ رزق میں برابر کے حصے دار ہو جائیں تو کیا یہ لوگ اللہ کی نعمتوں کے منکر ہیں۔

Marfat.com

یہ آیت متعدد حوالوں سے تدبر چاہتی ہے۔ یہ نقاط مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ اس آیت کے حوالے سے پہلا نکتۂ تدبر یہ ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کا خطاب پوری نوع انسانی سے ہے کسی مخصوص گروہ انسانی بالخصوص صرف مسلمان سے نہیں۔ لہٰذا اس آیت پر تدبر کے نتیجے میں جو نتائج حاصل ہوں گے وہ پوری نوع انسانی پر منطبق ہوں گے۔

۲۔ آیت کے ابتدائی الفاظ پر غور کیجئے وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ''اور اللہ نے رزق میں بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے''۔ یہ الفاظ اس امر کی صریح دلیل ہیں کہ تفاوتِ درجات امر ربی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں میں سے بعض کو بعض پر رزق میں فضیلت دی ہے۔ یہاں واضح رہے کہ یہاں رزق کے درجات میں فرق کی بات کی جارہی ہے غربت کو مشیتِ الٰہی نہیں فرض کیا جارہا۔ غربت تو بذات خود اللہ کا عذاب ہے۔ لہٰذا دونوں میں فرق ملحوظ خاطر رہنا چاہیے۔ تفاوت درجات ایک بدیہی حقیقت ہے اور روزمرہ زندگی کا ایک عام مشاہدہ جس سے انکار ممکن نہیں ہے۔

مزید برآں یہاں ''رزق دینے'' اور ''رزق کی تقسیم'' میں بھی فرق ملحوظ خاطر رہنا چاہیئے۔ رزق دینے والی ذات صرف اور صرف اللہ ہی کی ہے اور یہ رزق اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو انہی قوانین کے تحت دیتا ہے جو خود اس نے اپنی مشیت سے طے کیئے ہیں۔ ان قوانین کی اطاعت سے رزق فراواں اور انحراف سے بست ہوجاتا ہے۔ لہٰذا رزق صرف اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس کے قوانین سے مشروط ملتا ہے جبکہ رزق کی تقسیم سے مراد یہ ہے کہ وہ رزق جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے لوگوں کو عطا کیا جاتا ہے اس کی معاشرہ میں تقسیم کس طرح کی گئی ہے؟ اس امر کی ذمے داری بہرحال انسانوں پر ڈالی گئی ہے۔ یہی وہ بنیادی وجہ ہے جس کی وجہ سے قحط اور خشک سالیوں میں دنیا کی تاریخ میں بے شمار اموات ہوئیں ہیں۔ آج بھی دنیا میں کروڑوں افراد بھوکے سوتے ہیں۔ اسی طرح کروڑوں افراد غذائیت کی کمی کا شکار ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے لئے قحط اور خشک سالیوں میں مرنے والوں اور آج کے بھوکے افراد کے

منہ میں غذا ڈالنا کوئی ناممکن عمل نہ تھا اور نہ ہے اور نہ کبھی ہوگا وہ ہر امر ہر شے پر قادر ہے لیکن جب اس نے اپنی مشیت سے ایک فیصلہ کر لیا کہ رزق کی تقسیم میں وہ ''مداخلت'' نہیں کرے گا تو پھر ساری نوع انسانی بھوک سے مر جائے وہ کبھی ایسا نہیں کرے گا کیونکہ وہ کبھی اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا (۳/۹) کیونکہ ایسا کرنا اس نے اوپر فرض کر لیا ہے۔

۳۔ تیسرا اور سب سے اہم ترین نکتہ یہ ہے کہ نوع انسانی کے ان لوگوں کے بارے میں جن کو اللہ نے رزق میں فضیلت دی ہے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے کہ وہ اپنا رزق اپنے زیر دستوں کو نہیں دیتے تا کہ سب رزق کے معاملے میں برابر ہو جائیں۔ باالفاظ دیگر خدا کی رضا یہ ہے کہ بالا دست اپنا رزق زیر دستوں کو دیں تا کہ وہ سب برابر رہیں یا رزق میں سب کا حصہ برابر ہو۔ کسی بھی معاشرے میں کسی بھی وقت اور مقام پر دولت کی تقسیم میں عدم مساوات ختم کرنے کا پہلا اور آخری حل یہی ہوتا ہے کہ دولت کا بہاؤ ملک کے بالائی طبقات سے زیریں طبقات کی طرف ہونے لگے بلا شبہ اس میں حکومت کا کردار بہت اہم ہوتا ہے لیکن تمام تر اہمیت کے باوجود اس کی اپنی کچھ حدود ہیں جن سے باہر حکومت نہیں جا سکتی۔ حکومت ایک عمومی پالیسی تو بنا سکتی ہے لیکن ہر غریب کے پاس فرداً فرداً نہیں جا سکتی یہ ممکن ہی نہیں ہے۔

اس صورت حال کا واحد حل یہ ہے کہ معاشرے کے بالا دست طبقات خود آگے بڑھیں اور رضا کارانہ طور پر معاشرے کے پس ماندہ طبقات کا ہاتھ تھام لیں اس کے علاوہ دولت کی تقسیم میں مساوات کسی صورت ممکن نہیں ہے۔ اس آیت میں قرآن مجید بالائی طبقات کو (قطع نظر مذہب، ملت، نسل، علاقہ، زبان، ثقافت، وقت اور مقام) ان کی یہی ذمے داری یاد دلا رہا ہے۔ تاہم توجہ طلب امر یہ ہے کہ اس پورے عمل میں کہیں کوئی ''خدائی مداخلت'' کی بات نہیں کی گئی ہے یہ ذمے داری انسانوں پر ڈالی گئی ہے اور انسان بہ حیثیت انسان اس ذمے داری کا مکلف ہے۔ یہ ساری صوت حال اس حقیقت کا سادا سا بیان ہے

Marfat.com

کہ اللہ نے وسائل رزق فراہم کرنے کی ذمے داری لی ہے جسے وہ بہ حسن وخوبی نبھاتا آیا ہے اورتا قیامت نبھاتا رہے گا لیکن ان وسائل کی تقسیم بہر حال انسانوں کی ذمے داری ہے۔

یہاں اگر یہ سوال کیا جائے کہ انسان کس طرح اپنی ذمے داری سے عہدہ براہو سکتے ہیں کیا یہ ذمے داری سوشلزم کی شکل میں مرکزی حکومت تقسیم کا سارانظام اپنے ذمے لے کر پورا کرے گی یا ''نظامِ ربوبیت'' کی شکل میں ایک اسلامی حکومت کرے گی تو اسکا سادہ سا جواب نفی کی صورت میں اس آیت کے ابتدائی حصے میں ہی واضح کر دیا گیا ہے۔ تفاوت درجات ایک بدیہی حقیقت ہے اسے سوشلزم یا نظامِ ربوبیت کی طرح نظریاتی طور پر ختم نہیں کیا جاسکتا ایک لاطبقاتی معاشرہ شاعروں کی خیالی جنت میں تو ممکن ہے عملی طور پر نہیں پھر اسکا حل کیا ہے؟

اس کا حل پھر اس آیت میں کھلے کھلے انداز میں موجود ہے بالا دست طبقات اپنا رزق زیردست طبقات کیلئے کھلا رکھیں چاہے یہ عمل وہ حکومت کے توسط سے کریں یا خود براہ راست کریں یا کسی بھی شکل میں۔ یہ عمل بہر حال لازمی ہے اوراس کے مکلّف بہر حال انسانوں کے بالا دست طبقات ہی ہیں۔ اگر وہ اپنی ذمے داری پوری نہیں کرتے اور جیسا کہ یہ آیت بھی شہادت دے رہی ہے کہ وہ ایسا نہیں کرتے تو ان کا یہ عمل جہاں ایک طرف اللہ کی نعمت سے انکار کے مترادف ہے تو دوسری طرف معاشرہ میں بدترین فساد پیدا کرتا ہے۔ دولت کی تقسیم میں عدم مساوات تمام سماجی برائیوں کی ماں یا ام الخبائث ہے کسی بھی سماجی جرم کی تہہ میں بلاواسطہ یا بالواسطہ دولت کی تقسیم میں عدم مساوات ایک بنیادی عنصر کی صورت میں دیکھی جاسکتی ہے۔ اس بنیادی خرابی کی وجہ بالا دست معاشی طبقات کی جانب سے اپنے اسی بنیادی فرض کی عدم ادائیگی ہی ہے۔

## ایک ضمنی بحث

بالعموم خاندانی منصوبہ بندی کے حق میں ایک قرآنی آیت بہت زور و شور سے پیش کی جاتی ہے جو مندرجہ ذیل ہے۔

وَلَا تَقْتُلُوْآ اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ (۶/۱۵۲)

اور مفلسی کے خوف سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرنا کیونکہ ہم تمہیں بھی رزق دیتے ہیں اور انہیں بھی۔

اس آیت کی بنیاد پر یہ دلیل دی جاتی ہے کہ خاندانی منصوبہ بندی ناجائز ہے کیونکہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے خود کہا ہے کہ ''مفلسی کے خوف سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرو ہم تمہیں بھی رزق دیتے ہیں اور تمہاری اولاد کو بھی''۔ لہٰذا خاندانی منصوبہ اس طرح اللہ کی صفتِ رزاقیت پر عدم اعتماد کا اظہار ہے لہٰذا آنکھیں بند کر کے بچے پیدا کرتے چلے جانا چاہیئے یا کم سے کم قدغن عائد نہیں ہونی چاہیئے۔

تاہم یہ دلیل دیتے وقت جس بنیادی حقیقت کو خاموشی سے نظر انداز کر دیا جاتا ہے وہ یہی حقیقت ہے کہ رزق کی تقسیم خدا نے اپنے ہاتھ میں نہیں رکھی اسے انسانوں پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ اس صورت حال میں پاکستان جیسے ممالک میں جہاں پہلے ہی رزق کی تقسیم میں شدید ناہمواری موجود ہے بچوں کی تعداد میں اضافہ جو بالعموم معاشرے کے غریب اور نچلے طبقات میں زیادہ ہوتا ہے اُن کی غربت میں مزید اضافے کا باعث بنتا ہے اور محنت کی رسد میں اضافہ کرتا ہے جس کے نتیجے میں محنت کی اُجرت کی سطح مزید کم ہو جاتی ہے جو غربت میں مزید اضافے کا باعث بنتی ہے۔ اس طرح بچوں کی بلا تحدید پیدائش خود مزید غربت میں اضافے کا باعث بنتی ہے۔ لہٰذا بالخصوص غریب لوگوں میں خاندانی منصوبہ بندی کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیے نہ کہ اس کے خلاف ''فتوے'' جاری کیئے جائیں۔

ہاں البتہ اگر حالات ایسے ہوں کہ معاشرہ مجموعی طور پر خوشحال ہو، لوگوں کا معیار

زندگی اس قابل ہو کہ وہ بچوں کی تعداد میں اضافہ کر سکیں پھر ایسی صورت حال میں خاندانی منصوبہ بندی کی مخالفت میں وزن ہو سکتا ہے۔

موضوع بحث پر واپس آتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں کہ معاشرے کے بالادست طبقات یا جنہیں اللہ نے رزق میں فضیلت دی ہے ان پر یہ ذمے داری بھی ڈالی ہے کہ وہ اپنا رزق اپنے زیردست طبقات دیں تا کہ وہ سب رزق میں برابر ہو سکیں لیکن یہ بالادست طبقات عام طور پر ایسا نہیں کرتے اور اس طرح عملاً خدائی نعمت سے انکار کے مرتکب ہوتے ہیں (۱۶/۷۱) اور اس مقصد کے لئے جواز پھر عقیدۂ جبر سے لایا جاتا ہے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗٓ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ
(۳۶/۴۷)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے تم کو جو رزق دیا ہے اسے (اللہ کی راہ میں) خرچ کرو تو کافر مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ کیا ہم ایسے لوگوں کو کھلائیں جن کو خدا چاہے تو آپ کھلا سکتا ہے (پھر اب تم جو خدا کی مرضی کے خلاف ان کی سفارش کرتے ہو تو) بس تم صریح گمراہی میں پڑ گئے ہو۔

اس آیت کی رو سے جب کفار کو یہ کہا جاتا ہے کہ تمہیں اللہ نے جو رزق دیا ہے اس میں سے خرچ کرو تو کافر مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ بھلا ہم ان کو کھلائیں جن کو اگر اللہ چاہتا تو خود بھی کھلا سکتا تھا۔ بالفاظِ دیگران کو بھوکا رکھنا نعوذ باللہ خود خدائی مصلحت ہے یعنی خدا نے خود معاذ اللہ ان کو بھوکا رکھا ہے چونکہ خود اللہ ایسا چاہتا ہے لہٰذا ہم ''خدائی امور میں مداخلت'' کرنے والے کون ہوتے ہیں اللہ جب چاہے گا انہیں رزق فراہم کر دے گا۔

یہ ایک الگ مسئلہ ہے کہ اس آیت میں مندرجہ بالا مسلک یا نکتۂ نگاہ کو خود قرآن مجید نے کفار کا نکتۂ نگاہ کہہ کر پیش کیا ہے لیکن آج یہ ہمارا بہ حیثیت ''مسلمان'' تقریباً متفقہ

Marfat.com

موقف بھی یہی ہے کہ غربت و ناداری اللہ کی مشیت سے ہوتی ہے جس کا تعلق امور تکوینی سے بتایا جاتا ہے اس کے تحت جو کچھ بھی ہوتا ہے اس کی حکمت و مصلحت کو اللہ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔ لیکن اس کے ساتھ غربا کی مدد کرنے کو بھی اللہ کی رضا کے حصول کا ذریعہ گردانا جاتا ہے۔ رضا کا تعلق امور تشریعی سے ہے یعنی وہ امور جنہیں بجالانے کا ہمیں حکم دیا گیا ہے۔

اندازہ کیجئے اس صورت حال کے نتیجے میں خدا کے متعلق کس قسم کا تصور پیدا ہوتا ہے یعنی ایک طرف وہ کچھ بندوں کو ''اپنی مشیت'' سے غریب کر دیتا ہے کچھ کو امیر کر دیتا ہے۔ وہ جو غریب ہوتے ہیں انہیں خود نہیں معلوم ہوتا کہ وہ کس قصور کے تحت غریب ہیں بس اتنا کہنا کافی ہے کہ خدا کی مشیت ہی ایسی تھی اس کی مصلحت کوئی نہیں جانتا دوسری طرف ایک محدود طبقہ امرا کا ہوتا ہے انہوں نے کونسا کارنامہ انجام دیا ہوتا ہے جس سے وہ امیر ہو جاتے ہیں یہ بھی کسی کو نہیں معلوم۔ انہیں غربا کی مدد کا حکم بھی اللہ کی جانب سے ہے۔ یعنی ایک طرف خدا اپنی مشیت سے غریب پیدا کرتا ہے اور وہی خدا امیر بھی پیدا کرتا ہے۔ امیر اس دنیا میں بھی مزے کرتے ہیں اور غربا کی مدد کر کے ''ثواب'' بھی کماتے ہیں اور غریب کس جرم کی سزا کاٹتا ہے یہ کسی کو نہیں معلوم۔

ظاہر ہے اگر یہ بنیادی حقیقت تسلیم کر لی جائے کہ خدا کی ذات سے شر منسوب نہیں ہو سکتا تو اس قسم کی صورتِ حال سے بچا جا سکتا ہے جس کے تحت خدا سے متذکرہ بالا صورتِ حال منسوب کر دی جاتی ہے جو کہ منسوب نہیں کی جانی چاہیے۔ گویا من حیث القوم (اُمہ) اس وقت ہمارا تصور اس حوالے سے وہی ہے جسے قرآن نے بانگِ دہل کفار کا مسلک قرار دیا ہے۔ متذکرہ بالا آیت (۳۶/۴۷) کی رو سے کفار نہ صرف یہ کہ غربا کی مدد سے عقیدۂ جبر کی آڑ میں انکاری ہیں بلکہ الٹا مسلمانوں کو طعنہ دیتے ہیں کہ تم ہمیں (کفار کو) جو غرباء کی مدد کو کہتے ہو یہ نعوذ باللہ گمراہی کی راہ ہے یعنی کفار خود غربا کی مدد نہ کر کے ''حق پر'' ہیں اور مسلمان انہیں اگر غربا کی مدد کی تلقین کرتے ہیں تو وہ (مسلمان) معاذ اللہ صریح

Marfat.com

گمراہی میں پڑ گئے ہیں۔

یہ عقیدۂ جبر کا ایک مخصوص پہلو ہے جس کے تحت انسان ہر قسم کی ذمے داریوں سے "محفوظ" ہو جاتا ہے اور تمام تر ذمے داری خدا پر ڈال دی جاتی ہے۔ اس ذہنیت کو قرآن میں مختلف مقامات پر مختلف حوالوں سے بے نقاب کیا ہے، مثلاً:۔

سَيَقُولُ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا أَشْرَكْنَا وَلَا آبَاؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِن شَيْءٍ ۚ كَذَٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ حَتَّىٰ ذَاقُوا بَأْسَنَا ۗ قُلْ هَلْ عِندَكُم مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوهُ لَنَا ۖ إِن تَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ أَنتُمْ إِلَّا تَخْرُصُونَ (۶/۱۴۹)

جو لوگ شرک کرتے ہیں وہ کہیں گے کہ اگر خدا چاہتا تو ہم شرک نہ کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا (شرک کرتے) اور نہ ہم کسی چیز کو حرام ٹھہراتے۔ اسی طرح ان لوگوں نے تکذیب کی تھی جو ان سے پہلے تھے یہاں تک کہ ہمارے عذاب کا مزا چکھ کر رہے کہہ دیجئے اگر تمہارے پاس کوئی علم ہے تو اسے پیش کرو تم گمان کے سوا کسی چیز کی پیروی نہیں کرتے اور تم صرف اٹکل کے تیر چلاتے ہو۔

یہاں بھی عقدیہ جبر کے تحت تمام ذمے داری مشرکین نے خدا پر ڈال دی ہے یعنی ان کا اور ان کے آبا و اجداد کا شرک کرنا نعوذ باللہ خود خدا کی وجہ سے ہے اور انہوں نے جو بھی خطائیں یا گناہ کیئے وہ بھی ان سے معاذ اللہ، اللہ ہی نے کروائے نتیجہ صاف ظاہر ہے اللہ کے عذاب نے ان کے آباؤ جداد کو ہر طرف سے گھیر لیا یہی صورت حال موجودہ مشرکین کیساتھ بھی ہے ان کے پاس بھی ان کے موقف کے اثبات کیلئے کوئی دلیل نہیں ہے وہ صرف ہواؤں میں تیر چلا رہے ہیں کیونکہ عقیدۂ جبر ہر قسم کے استدلال سے مکمل طور پر عاری ہے۔

مشرکین کے اسی بے بنیاد دعویٰ کا اعادہ (۱۶/۳۵) اور (۲۰/۴۳) میں بھی کیا گیا

Marfat.com

ہے توجہ طلب امر یہ ہے کہ متذکرہ بالا تینوں آیات یعنی (۶/۱۴۹) ، (۱۶/۳۵) اور (۴۳/۲۰) میں مشرکین کے جبریہ استدلال کے حوالے سے اللہ تعالیٰ نے یہ کہا ہے کہ اس قسم کا دعویٰ محض ہوائیں تیراندازی ہے اور لاعلمی کی بنیاد پر ہے۔

لہٰذا یہ امر واضح ہے کہ عقیدہ جبر کی بنیاد پر یہ کہنا کہ غربت مشیت خداوندی ہے اور خود خدا ہی غربا کو غریب رکھنا چاہتا ہے صریحاً غلط ہے۔ یہ انسانوں کی ذمہ داری ہے بالخصوص ان لوگوں کی ذمے داری جنہیں اللہ نے رزق میں فضیلت دی ہے کہ وہ رزق کو اللہ کی راہ میں کھلا رکھیں اور عقیدۂ جبر کی بنیاد پر اس ذمے داری سے فرار حاصل نہ کریں۔

Marfat.com

باب ۴

# رزق کی اہمیت

انسانی زندگی میں رزق کی کیا اہمیت ہے اس کو سمجھنے سے قبل یہ نکتہ ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ از روئے قرآن اللہ تعالیٰ نے انسان کو انسب توازن کے ساتھ پیدا کیا ہے۔

الَّذِیْ خَلَقَکَ فَسَوّٰکَ فَعَدَلَکَ (۸۲/۷)

(وہی تو ہے) جس نے تجھے پیدا کیا اور (تیرے اعضاء کو) ٹھیک کیا اور (تم میں) اعتدال و توازن پیدا کیا۔

اس مضمون کو سورۃ التین میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ (۹۵/۴)

ہم نے انسان کو انسب توازن کے ساتھ پیدا کیا۔

اس توازن میں ظاہر ہے جسمانی اور نفسیاتی توازن دونوں شامل ہیں۔ اس توازن کو برقرار رکھنے یا بگاڑنے کا اختیار بھی انسان کو دے دیا۔ انسان کو عقل و شعور کی نعمتیں دی گئی ہیں ان کو استعمال کرتے ہوئے وہ جو چاہے راہ اختیار کر سکتا ہے۔

اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَیْنَیْنِ o وَلِسَانًا وَّشَفَتَیْنِ o وَهَدَیْنٰهُ النَّجْدَیْنِ (۹۰/۸-۱۰)

بھلا ہم نے اس کو دو آنکھیں نہیں دیں اور زبان اور دو ہونٹ (نہیں دیئے) اور اس کو (خیر و شر کے) دونوں راستے بھی دکھا دیئے۔

ان دونوں راستوں سے مراد خیر اور شر کے راستے ہیں اول الذکر یعنی خیر کی راہ سے انسانی شخصیت کا توازن برقرار رہتا ہے جبکہ ثانی الذکر سے یہ توازن برباد ہو جاتا ہے۔ انسانی زندگی کا مقصود و منتہا یا اس کی کامیابی یہی ہے کہ وہ اپنی شخصیت (نفس) کے اس توازن کو برقرار رکھے جو ایسا کرنے میں کامیاب ہو گیا وہی روز قیامت کامیاب ہوگا

Marfat.com

اور جس نے اس توازن کو برباد کر دیا وہ روز حشر خسارہ پانے والوں میں سے ہوگا اس حقیقت کی صراحت ان الفاظ میں قرآن مجید میں کی گئی ہے۔

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝ (۹۱/۷۔۱۰)

اور انسان کی اور (اس ذات کی قسم) جس نے اس کو (ایسا) درست بنایا پھر اس کو بدکاری اور تقویٰ (دونوں باتوں کی) سمجھ دی کہ جس نے (اپنے) نفس کو پاک رکھا وہ مراد کو پہنچا اور جس نے اس کو خاک میں ملا دیا وہ خسارے میں رہا۔

متذکرہ بالا آیت (۹۱/۹) میں استعمال کیا جانے والا لفظ زکھا یہاں خصوصی توجہ کا مستحق ہے۔ اس لفظ کا مادہ زک و ہے جس کے بنیادی معنی پھلنا، پھولنا، بڑھنا اور نشو ونما پانے کے ہیں۔ انسانی حوالے سے جب بات کی جائے گی تو اس سے مراد انسانی نفس کی نشو ونما اور بالیدگی ہوگی۔ یہ نشو ونما اور بالیدگی انسانی نفس کے توازن کی برقراری سے ہی ممکن ہے اور اگر اس کے برعکس جیسا کہ اگلی آیت (۹۱/۱۰) میں کہا گیا جس نے اپنے نفس کو دبا دیا اس کی نشو ونما روک دی وہ خسارے میں رہے گا۔ لہٰذا انسانی زندگی کی کامیابی کا معیار ازروئے قرآن یہی ہے کہ کس شخص نے اپنی ذات (نفس) کی کس حد تک نشو ونما کی بالفاظ دیگر کس حد تک اس کے توازن کو برقرار رکھا۔

جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ یہ توازن کس طرح برقرار رکھا جا سکتا ہے قرآن مجید نے اس کی وضاحت ایک دوسرے مقام پر یہ کہہ کر کر دی کہ "مال" اس توازن کے قائم رکھنے کا ذریعہ ہے۔

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاۗءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِىْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا (۴/۵)

اور ناسمجھوں کو اپنے مال جنہیں اللہ نے تمہارے لئے قیام (توازن) کا ذریعہ بنایا ہے نہ دو۔

Marfat.com

اس آیت میں لفظ "قیمًا" انتہائی توجہ کا طالب ہے اسکا مادہ ق وم ہے جس کے بنیادی معنی کھڑا ہونا، متوازن ہونا، کسی معاملے کا اعتدال و توازن پر ہونا، محکم اور استوار ہونا، ثابت اور دائم وغیرہ رہنے کے آتے ہیں۔

**قَوَامٌ** عدل و توازن وہ سامان جس کے ذریعے زندگی گذاری جائے، اتنا کچھ جس سے صرف ضروریات زندگی پوری ہو سکیں۔

**قِوَامٌ** وہ چیز جس پر کسی معاملے کا دارومدار ہو، وہ شے جس کے سہارے کوئی کھڑا رہ سکے، اتنی روزی جو انسان کو کھڑا رکھ سکے۔

اسی سے مستقیم ہے جس کے معنی معتدل و متوازن، ٹھیک ٹھاک توازن و تناسب لئے ہونے کے ہوتے ہیں، اسی طرح تقویم سے مراد عدل و توازن کو برقرار رکھنا ہے، مقام سے مراد کھڑا ہونے کی جگہ لی جاتی ہے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ اس لفظ کے بنیادی معنی توازن قائم رکھنے کے ہیں لہٰذا اس مادہ سے جتنے الفاظ آئیں گے ان میں یہ بنیادی مفہوم ضرور موجود رہے گا خواہ یہ توازن جسمانی ہیئت و پیکر کا ہو یا معاشرتی اور تمدنی توازن ہو یا نفسیاتی توازن چنانچہ جس چیز کا توازن بگڑ جائے وہ شے کھڑی نہیں رہ سکتی۔

اس پس منظر میں اس آیت سے جو عظیم نکتہ مستنبط ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اموال "قیام" کا ذریعہ ہیں۔ بالفاظِ دیگر تمام معاشی افعال جو ایک انسان انجام دیتا ہے وہ براہِ راست اس کی شخصیت کے توازن پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس آیت کی رو سے ایک انسان وہ ہوگا جو وہ کماتا ہوگا یعنی انسان کا ذریعۂ آمدنی ہی اس کی شخصیت کا متعین کنندہ ہوتا ہے۔ بالعموم یہ کہا جاتا ہے کہ "آپ وہ ہیں جو آپ سوچتے ہیں" لیکن اس قرآنی آیت کی روشنی میں اسے اس طرح بیان کیا جائے گا کہ "آپ وہ ہیں جو آپ کماتے ہیں" بالفاظ دیگر انسان کی معاشی سرگرمیاں ہی اس کی شخصیت کا تعین کرتی ہیں۔

Marfat.com

دوسری طرف اگر انسان جائز یا حلال ذرائع سے رزق حاصل نہیں کرتا بلکہ ناجائز اور غیر قانونی یا حرام ذرائع رزق سے آمدنی حاصل کرتا ہے تو اس کے نتیجے میں انسانی شخصیت کا یہ توازن نہ صرف بگڑ جاتا ہے بلکہ اس حد تک نوبت پہنچ سکتی ہے کہ نفس کی ہلاکت واقع ہو جائے۔ اگر نوبت نفس کی ہلاکت تک جا پہنچے تو بھی ذریعۂ رزق/ ذریعۂ آمدنی میں تبدیلی ہی سے نفس کو اس ہلاکت کے بعد زندگی مل جاتی ہے۔ یعنی اگر انسان باطل ذرائع رزق چھوڑ کر جائز اور برحق ذرائع رزق اختیار کر لے تو نفس کی ہلاکت جو اول الذکر کی وجہ سے ہوتی ہے ثانی الذکر اسے حیات نو بخش دیتا ہے۔ اس امر کی تصدیق قرآن مجید سے اس طرح ہوتی ہے۔

وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ رِّزْقٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ

(۴۵/۵)

اور رات اور دن کے آگے پیچھے آنے جانے میں جو خدا نے آسمان سے رزق نازل فرمایا پھر اس سے زمین کو اس کے مرجانے کے بعد زندہ کیا اس میں اور ہواؤں کے بدلنے میں عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔

اس آیت کریمہ میں منجملہ تین (۳) امور کو اللہ تعالیٰ نے اپنی آیات (نشانیاں) قرار دیا ہے اول رات اور دن کے آگے پیچھے آنے جانے میں۔ دوم اس پانی کو جسے ''زمین کا رزق'' قرار دیا گیا ہے جس کے وجہ سے مردہ زمین کو زندگی مل جاتی ہے اور سوم ہواؤں کے بدلنے کو اللہ کی آیات قرار دیا گیا ہے۔

ان تینوں نشانیوں میں سے فی الوقت موضوع بحث کے لحاظ سے دوسری نشانی کو زیر بحث لایا جا رہا ہے۔

یہ ہمارا ایک عام مشاہدہ ہے کہ ایک ایسی زمین جو مردہ ہو، یعنی بنجر ہو اس سے کوئی

Marfat.com

زرعی پیداوار حاصل نہیں ہوتی۔ لیکن اگر اسی مردہ یا بنجر زمین کو مناسب مقدار میں پانی فراہم کر دیا جائے تو وہی مردہ زمین زندہ ہو جاتی ہے اور پیداوار دینے لگتی ہے۔ اس ایک سادہ اور آسان فہم مثال کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے زندگی کے چند اہم بنیادی حقائق میں سے ایک حقیقت انسانوں تک پہنچا دی ہے۔

اس آیت پر اگر تدبر کیا جائے تو اللہ تعالیٰ نے پانی کو زمین کا رزق قرار دیا ہے جس سے وہ مردہ حالت سے زندہ حالت میں تبدیل ہو جاتی ہے با الفاظ دیگر رزق میں اتنی صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ موت کو حیات میں تبدیل کر دیتا ہے۔ یہ حقیقت بھی ذہن میں رکھئے کہ باطل ذرائع رزق انسانی نفس کی ہلاکت پر منتج ہوتے ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ۣ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا (۴/۲۹)

اے اہل ایمان! ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ ہاں مگر آپس کی رضامندی سے تجارت (جائز ہے) اور اپنے نفوس کو ھلاک نہ کرو بے شک اللہ تم پر (بہت) مہربان ہے۔

اس آیت میں اس امر کی صریحاً وضاحت کر دی گئی ہے کہ باطل ذرائع رزق کے نتیجے میں نفس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ اس صورت میں انسان بظاہر زندہ ہوتا ہے اور وہ تمام افعال انجام دے رہا ہوتا ہے جو زندگی کی علامت متصور ہوتے ہیں لیکن اس کی شخصیت (نفس) ختم ہو چکی ہوتی ہے۔ باالفاظ دیگر ظاہری آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ سینوں میں موجود دل اندھے ہو جاتے ہیں۔

فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ

Marfat.com

(۲۲/۴۶)

بات یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ دل جو سینوں میں ہیں (وہ) اندھے ہو جاتے ہیں۔

اس صورت حال میں تبدیلی ذر ۔ ہ رزق میں تبدیلی کے ذریعے ممکن ہے۔ باالفاظ دیگر رزق پر نفس انسانی کی حیات وموت کا انحصار ہوتا ہے باطل ذرائع سے حاصل کیا جانے والا رزق نفس انسانی کی موت پر منتج ہوتا ہے لیکن اس موت کے بعد بھی مردہ زمین کی طرح اس میں حیاتِ نو کے امکانات موجود ہوتے ہیں اور یہ حیات نو بھی رزق ہی کی مرہون منت ہوتی ہے جس طرح پانی مردہ زمین کو زندگی بخش دیتا ہے بالکل اسی طرح حلال رزق نفس انسانی کو حیات عطا کر دیتا ہے۔

اگر قرآن مجید کی اس آیت (۴۵/۵) پر تدبر کیا جائے تو بظاہر ایسا لگتا ہے کہ یہ سادہ اور عام سی حقیقت کا بیان ہے کہ مردہ زمین کو پانی دیا جائے تو وہ زندہ ہو جاتی ہے اور پیداوار دینے لگتی ہے لیکن اس آیت میں قرآن مجید نے پانی کو ''زمین کا رزق'' قرار دے کر علوم کی ایک مکمل نئی دنیا آباد کر دی ہے۔ اگر غور کیا جائے تو اس آیت میں اگر ''رزق'' کا لفظ استعمال نہ بھی کیا جاتا تو بھی مفہوم قطعی واضح تھا لیکن لفظ ''رزق'' کا اس آیت میں استعمال زندگی کی ایک انتہائی اہم حقیقت کی نقاب کشائی کیلئے کیا گیا ہے اور وہ حقیقت یہ ہے کہ رزق اور نفس آپس میں براہ راست گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ انسان جس قسم کا رزق حاصل کرتا ہے وہ اس کے نفس پر براہ راست اثر انداز ہوتا ہے۔ مسلسل حرام رزق ایک مرحلے پر نفس انسانی کو موت سے ہمکنار کر دیتا ہے جبکہ رزق حلال نفس انسانی کی بقاء، ترقی اور نشوونما کا ذریعہ ثابت ہوتا ہے۔

اگر متذکرہ بالا آیت (۴۵/۵) پر مزید تدبر کیا جائے تو یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ وقت کے کسی بھی لمحے میں جس وقت انسان چاہے اپنی تقدیر تبدیل کر سکتا ہے۔ اگر ماضی

Marfat.com

میں وہ باطل ذرائع آمدنی سے اپنے نفس کو ھلاک کر چکا ہے تو حلال ذرائع رزق کی تقدیر منتخب کرنے کی صورت میں وہ صورت حال مکمل تبدیل بھی کر سکتا ہے۔ جس طرح مردہ زمین کسی بھی وقت پانی کی دستیابی سے زندہ ہو سکتی ہے۔ بعینہ یہی صورت حال نفس انسانی کے ساتھ بھی ہے۔ اس حوالے سے سورۃ النساء کی متذکرہ بالا آیت (۴/۲۹) خاص طور پر تدبر کی مستحق ہے جس میں واضح طور پر باطل ذرائع رزق کا نتیجہ نفس کی ہلاکت بیان کیا گیا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ آیت کے آخری حصے میں اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کا تذکرہ کیا ہے کہ وہ بار بار رحم کرنیوالا ہے۔ اگر ان دونوں آیات یعنی (۴/۲۹) اور (۵/۴۵) پر بیک وقت تدبر کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ باطل ذرائع رزق کے نتیجے میں نفس کی موت کے بعد بھی اللہ کی رحمت کا مسلسل امکان رہتا ہے جس طرح مردہ زمین کبھی بھی پانی کی دستیابی سے زندہ ہو سکتی ہے بالکل اسی طرح اللہ کی رحمت سے مردہ نفس بھی رزق حلال سے کسی بھی وقت زندہ ہو سکتا ہے بشرطیکہ انسان خود ایسا کرنا چاہے کیونکہ یہی اس کیلئے خیر اور بقاء کی راہ ہے۔

وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى (۲۰/۱۳۱)

اور تیرے رب کا رزق سب سے اچھا اور باقی رہنے والا ہے۔

اس آیت کا مضمون (۵/۴۵) ہی سے منسلک ہے۔ اس آیت میں ارشاد ربانی ہے کہ تیرے رب کا رزق مبنی بر خیر اور باقی رہنے والا ہے۔ اب اگر رزق کی نوعیت پر غور کیا جائے تو ظاہر ہے اس کی بقاء کا کوئی تصور نہیں ہے عام کھانے پینے کی چیزوں کی بقا چہ معنی دارد؟ لیکن ظاہر ہے اس سے مراد عام اشیاء رزق نہیں ہیں بلکہ انسانی نفس کی بقا ہے جو رزق کی مرھون منت ہوتی ہے بشرطیکہ اسے جائز اور حلال ذرائع سے حاصل کیا گیا ہو صرف اسی صورت میں رزق انسانی نفس کیلئے توازن کا ذریعہ ثابت ہوتا ہے جس کی طرف (۴/۵) میں اشارہ کیا گیا اور اسی توازن کی برقراری میں نفس انسانی کی بقا ہے (۹۱/۷۔۱۰) یعنی متوازن

Marfat.com

نفس انسانی ہی کو قیامت کے بعد بقا حاصل ہوگی جس کا ذریعہ صرف اور صرف حلال ذریعہ رزق ہے۔ جسے قرآن مجید میں مردہ زمین اور پانی کی مثال سے بیان کیا گیا ہے۔

وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۚ وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعَالِمُوْنَ
(۲۹/۴۳)

اللہ مثالوں کے ذریعے بات واضح کرتا ہے جسے صرف اہل علم ہی سمجھ سکتے ہیں۔

## رزق کے ذریعے اقوام کی حیات وموت کا تعین

جس طرح انفرادی لحاظ سے رزق افراد کے نفوس کی حیات و موت کا متعین کنندہ ہوتا ہے بعینہ یہی صورت حال اجتماعی سطح پر یعنی قوموں کیساتھ بھی ہے کیونکہ ظاہر ہے قومیں افراد ہی سے ترتیب پاتی ہیں جیسے افراد ہوں گے ویسی ہی اقوام بھی ہوں گی۔ رزق سے کس طرح قوموں کی حیات وموت تعین ہوتا ہے اس حوالے سے بنیادی قرآنی قانون یہ ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (۸/۵۳)

اللہ جب کسی قوم کو کوئی نعمت دیتا ہے تو اس نعمت کو اس وقت تک تبدیل نہیں کرتا جب تک کہ وہ قوم اپنے نفوس کو نہ بدل لے اور اللہ یقیناً بہت سننے والا اور جاننے والا ہے۔

جہاں تک نعمت کا تعلق ہے تو اس سے مراد اللہ کی لاتعداد نعمتوں میں سے کوئی بھی نعمت ہوسکتی ہے مثلاً مسرت، مال و دولت، آسودگی و خوشحالی یا سیاسی طاقت وفوجی غلبہ وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کو کسی بھی نعمت سے سرفراز کرتا ہے تو اپنی مشیت سے طے شدہ قانون کے مطابق اس نعمت کو اس قوم سے اس وقت تک واپس نہیں لیتا جب تک وہ قوم خود

اس نعمت کی اہل نہ رہے۔ بالفاظ دیگر اس نعمت کیساتھ جو شرائط عائد ہوتی ہیں انہیں پوری کرتی رہے جب تک یہ شرائط پوری ہوتی رہیں گی وہ نعمت اس قوم سے نہیں چھینی جاتی۔ مثال کے طور پر موضوع زیر بحث کے حوالے سے رزق کی فراوانی ایک نعمت خداوندی ہے اوراس کی برقراری کی لازمی شرط ''شکر'' ہے۔ شکر سے کیا مراد ہے؟ اس پر تفصیلی بحث چھٹے باب میں کی گئی ہے۔ مختصراً از روئے قرآن شکر سے مراد اعمال صالح ہیں یعنی ایسے اعمال جن سے اللہ کی رضا حاصل ہو۔ اب اگر ایک قوم کو افراط رزق کی نعمت حاصل ہو اور وہ اعمال صالحہ بھی کرتی رہے تو ظاہر ہے اس سے وہ نعمت چھینی نہیں جائے گی لیکن اگر اس کے برعکس وہ اس نعمت کے حصول کے بعد بدمستی پر اتر آئے اور باطل ذرائع سے آمدنی حاصل کرنا شروع کردے تو اس عمل کے نتیجے میں قوم کے اجتماعی نفس کی ہلاکت واقع ہو جائے گی نتیجے کے طور پر قوم مردہ ہو جائے گی اور لامحالہ فراوانی رزق کی نعمت اس قوم سے چھین لی جائے گی کیونکہ نعمتوں کے حقدار زندہ افراد یا قومیں ہوتی ہیں مردہ افراد یا قومیں نہیں۔

اس طرح باطل ذرائع رزق قوموں کی اجتماعی ہلاکت کا سبب بھی بنتے ہیں۔ تاہم اسے موت کی بجائے خودکشی کہنا زیادہ مناسب ہوگا کیونکہ اس ہلاکت کی ذمے دار کوئی اور نہیں بلکہ خود وہ قومیں ہوتی ہیں جو اس قسم کی تقدیر کا انتخاب کرتی ہیں لہٰذا یہ تاریخی حقیقت درست ثابت ہوتی ہے کہ قومیں مرتی نہیں بلکہ خودکشی کرتی ہیں اور اس کی بنیادی وجوہ میں معاشی عوامل سرفہرست ہوتے ہیں۔

اس بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اقوام کی حیات و موت کے عوامل میں رزق کو بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ خود انبیاء کرام نے اللہ تعالیٰ سے معزز رزق کیلئے دعائیں کی ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کیلئے اس مقصد کیلئے ان الفاظ میں دعا کی:۔

رَبَّنَآ اِنِّیۡۤ اَسۡکَنۡتُ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ بِوَادٍ غَیۡرِ ذِیۡ زَرۡعٍ عِنۡدَ بَیۡتِکَ

الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِیْ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ (۱۴/۳۷)

اے ہمارے رب میں نے اپنی اولاد میں سے بعض کو تیرے معزز گھر کے پاس ایک ایسی وادی میں جس میں کوئی کھیتی نہیں ہوتی لا بسایا ہے اے میرے رب (میں نے ایسا اس لئے کیا ہے) تا کہ وہ عمدگی سے نماز ادا کریں پس تو لوگوں کے دل ان کی طرف جھکا دے اور انہیں رزق دیتا رہ تا کہ وہ تیرا شکرادا کرتے رہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی اسی رزق کیلئے رب العالمین سے دعا کی تھی۔

قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا وَاٰيَةً مِّنْكَ وَارْزُقْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ (۵/۱۱۴)

(تب) عیسیٰ ابن مریم نے دعا کی کہ ہمارے رب ہم پر آسمان سے خوان نازل فرما کہ وہ ہمارے لئے یعنی ہم میں جو اول ہیں اور جو بعد کے ہیں سب کیلئے ایک خوشی کی بات ہو جائے اور تیری طرف سے ایک نشانی ہو جائے اور تو ہم کو رزق عطا فرما دے اور تو تمام رازقین میں سے بہترین رازق ہے۔

مندرجہ بالا تصریحات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ انفرادی اور اجتماعی لحاظ سے رزق کی کیا اہمیت ہے اور یہ کس طرح افراد اور اقوام کی حیات و موت کے عوامل میں سب سے بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔

Marfat.com

باب ۵

# تکمیل نعمت اور اس کی شرائط

جہاں تک رزق اور اللہ کی دیگر نعمتوں کا تعلق ہے، از روئے قرآن اللہ تعالیٰ اپنی یہ تمام نعمتیں انسانوں کو عطا کرنا چاہتا ہے یہی اس کی مشیت ہے تاہم ان نعمتوں کو وہ اندھا دھند نہیں لٹاتا۔ اس ضمن میں بھی عطاء ربانی خود اپنی مشیت سے متعین کردہ چند اصول و قوانین کی پابند ہے۔

جہاں تک اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا تعلق ہے یہ روئے زمین پر بسنے والے تمام انسانوں کے لیے ہیں۔ کوئی بھی شخص خواہ وہ کسی بھی نظریہ حیات کا حامل ہو، قوانین خداوندی کی مدد سے اور اپنی محنت کے ذریعے اس عطاء ربانی سے مستفید ہو سکتا ہے۔

كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا (۱۷/۲۰)

ہم سبھی کو مدد دیتے ہیں ان کو بھی (یعنی دین والوں کو بھی) اور ان کو بھی (یعنی دنیا والوں کو بھی) اور (یہ مدد) تیرے رب کی عطاء میں سے ہے اور تیرے رب کی عطا کسی سے روکی نہیں جاتی۔

## عطاء ربانی کا مقصد نعمتوں کی تکمیل ہے

اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس عطا کا مقصد انسانوں پر اپنی نعمتوں کی تکمیل ہے۔

مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (۵/۶)

اللہ تم پر تنگی نہیں کرنا چاہتا بلکہ یہ چاہتا ہے کہ تمہیں پاک کرے اور اپنی نعمتیں تم پر پوری کرے تاکہ تم شکر کرو۔

اس آیت کریمہ میں دو (۲) نقاط پر تدبر لازمی ہے اول نعمتوں کی تکمیل اور دوم شکر۔

Marfat.com

ان دونوں نقاط کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

## ا۔ نعمتوں کی تکمیل

جہاں تک لفظ نعمت کا تعلق ہے یہ ایک کثیر المعانی لفظ ہے۔ بنیادی طور پر اس کے معنی مسرت، مال و دولت، آسودگی اور خوشحالی کے ہوتے ہیں یعنی ایسی حالت جس میں انسان لذت محسوس کرے۔ اس کے علاوہ احسان کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

ان معانی سے واضح ہے کہ معاشرتی زندگی کا ہر خوشگوار پہلو، کشادگی، آسودگی اور اذیت و تکلیف سے دوری نعمت ہے۔ چنانچہ سورۃ نحل میں دنیاوی زندگی کے مختلف ساز و سامان کے تذکرہ کے بعد کہا، كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ (۱۶/۸۱) اس سے نعمت کے معنی واضح ہیں۔ سورۂ لقمٰن میں اس سامان کو نعمۃ اللہ کہا گیا ہے جو کشتیوں کے ذریعے ادھر سے ادھر منتقل کیا جاتا ہے (۳۱/۳۱)۔ سورۃ آل عمران میں میدان جنگ کی فتوحات اور مال غنیمت کو بھی نعمت کہا گیا ہے (۳/۱۷۳) سورۃ دخان میں زندگی کی تمام آسودگیوں اور خوشحالیوں کو نعمت کہا گیا ہے (۴۴/۲۷) کائنات کی ہر شے جسے انسان کے لئے مسخر کر دیا گیا ہے نعمت ہے (۳۴-۱۴/۳۲) نیز اقوام عالم پر فضیلت مل جانا نعمت ہے (۲/۴۷) طبعی آسائشوں کے علاوہ عمدہ ذہنی صلاحیتوں کیلئے بھی نعمت کا لفظ آیا ہے مثلاً (۵۲/۲۹)، (۶۸/۲) اور جسمانی صفائی اور تندرستی کو بھی نعمت کہا گیا ہے (۵/۶)۔

بالفاظ دیگر زندگی کی ہمہ اقسام کی سہولیات، خوشگواریوں، خوشحالی، اور زندگی کا ہر ہر خوشگوار پہلو نعمت میں شامل ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی یہ تمام نعمتیں انسانوں کو بدرجہ کمال عطا کرنا چاہتا ہے تاکہ مسلمان بالخصوص اور دیگر انسان بالعموم اسکا شکر ادا کریں۔

یہ تصور موجود معاشی اساس کے بالکل برعکس ہے۔ جس کے تحت یہ فرض کیا جاتا ہے کہ انسانی خواہشات لامحدود ہیں جبکہ اُن کو پورا کرنے کیلئے وسائل محدود ہیں لہٰذا محدود وسائل کو جنکے متبادل استعمالات ممکن ہو سکتے ہیں اس طرح استعمال کیا جانا چاہیئے کہ ان سے زیادہ

Marfat.com

سے زیادہ استفادہ ممکن ہو سکے۔ یہ مفروضہ نہ صرف یہ کہ معاشی معاملات سے خدا کو باہر نکال دیتا ہے بلکہ بذات خود فساد کی بنا بن جاتا ہے کیونکہ اس مفروضے کے تحت یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ وسائل محدود ہیں اور انسانی خواہشات لامحدود لہٰذا انفرادی اور اجتماعی سطح پر ان وسائل پر زیادہ سے زیادہ قبضے کی ایک اندھی دوڑ شروع ہو جاتی ہے جس کا مقصود و منتہا بھی محض ایک حیوانی سطح کے مقصد کا حصول ہے یعنی زیادہ سے زیادہ تسکین بالفاظ دیگر

بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

اس زیادہ سے زیادہ تسکین یا بالفاظ دیگر انتہائی لذت کے حصول کے لئے تمام معاشی سرگرمیاں انجام دی جاتی ہیں جو محض حیوانیت ہے۔

اس کے برعکس اگر اللہ تعالیٰ پر یقین کامل ہو اور انسان اس کی بتائی ہوئی راہ پر چلے تو اللہ تعالیٰ خود انسانوں پر بالعموم اور مسلمانوں پر بالخصوص اپنی نعمتوں کے دروازے کھولتا چلا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بتائی ہوئی راہ تقویٰ کی راہ ہے جو زیادہ سے زیادہ نیکیوں کے حصول سے عبارت ہے یہ انسانیت کی اعلیٰ ترین منزل ہے۔ یہی دونوں اقسام کی سوچ کا بنیادی فرق ہے۔ اول الذکر محض شیطانیت ہے ثانی الذکر اللہ کی راہ ہے۔ اب یہ انسان کی اپنی مرضی ہے کہ وہ جو راہ چاہے منتخب کر لے جو جس قسم کی راہ منتخب کرے گا اسی قسم کی تقدیر اس پر منطبق ہو جائے گی۔

## اللہ کی نعمتوں کا حصول مشروط ہے

اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس کی نعمتوں کی اپنے بندوں پر تکمیل مشروط ہے بالفاظ دیگر اللہ کی نعمتوں کا حصول ان قوانین کی اطاعت سے مشروط ہے جو اس ضمن میں مشیت ایزدی نے متعین کر دیئے ہیں۔ اس حوالے سے سب سے بنیادی شرط اللہ کی اطاعت ہے۔

وَاخْشَوْنِيْ وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِيْ عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ (۲/۱۵۰)

اور مجھ ہی سے ڈرو تاکہ میں اپنی نعمت تم پر پوری کر دوں اور اس لئے بھی کہ تم راہ راست پاؤ۔

Marfat.com

اللہ سے ڈرنے کا مطلب تقویٰ کی راہ اختیار کرنا ہے بالفاظ دیگر ان احکام و قوانین کی مکمل اور غیر مشروط اطاعت جو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بیان کیئے ہیں۔ ان احکام و قوانین کی اطاعت سے نہ صرف یہ کہ نعمتوں کا حصول ممکن ہوتا ہے بلکہ راہ ہدایت بھی ملتی ہے۔ اس حقیقت کا اظہار قرآن مجید میں متعدد مقامات پر واشگاف الفاظ میں کیا گیا ہے۔

اَللّٰہُ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیَقْدِرُ ؕ (۱۳/۲۶)

(اللہ کے قانون مشیت سے مشروط) جو رزق فراواں لینا چاہے (تو اس کی محنت سے مشروط) اسے کھلا رزق مل جائے گا اور جو نپا تلا لینا چاہے اسے نپا تلا ملے گا۔

اس حقیقت کو سورۃ العنکبوت میں ان الفاظ میں دھرایا گیا ہے۔

اَللّٰہُ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِہٖ وَیَقْدِرُ لَہٗ (۲۹/۶۲)

میرے بندوں میں سے جو چاہے (میرے قانون مشیت کی رو سے) کھلا رزق لے لے اور جو چاہے نپا تلا لے لے۔

متذکرہ بالا آیت (۲۹/۶۲) میں واضح طور پر تمام انسانوں کے لئے واضح انداز میں کہہ دیا گیا کہ رزق کی بست و کشاد کے قوانین سب کے لئے ایک ہیں۔ جس طرح طبیعی قوانین یا قوموں کے عروج و زوال کے قوانین یا کسی بھی نوعیت کے قوانین تمام انسانوں کے لئے یکساں ہیں اسی طرح رزق کی بست و کشاد کے قوانین بھی زمانے کی قید سے آزاد ہیں نہ صرف یہ کہ یہ قوانین سطح زمان سے بلند ہیں بلکہ ان میں غور و فکر کرنے والوں کے لئے آیات الٰہی بھی پوشیدہ ہیں۔

اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّ اللّٰہَ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیَقْدِرُ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ (۳۰/۳۷)

کیا یہ لوگ کبھی اس حقیقت پر غور نہیں کرتے کہ رزق کی کشائش اور تنگی

Marfat.com

اللہ کے قانون کے مطابق ہوتی ہے بے شک اس میں ایمان لانے والوں
کے لئے نشانیاں ہیں۔

اس حقیقت کا اعادہ کہ رزق قانون مشیت سے مشروط ہے ان آیات قرآنی میں بھی کیا گیا ہے (۳۰/۳۷)، (۳۸-۳۷/۲۴)، (۳۴/۳۵)، (۳۹/۵۲)، (۴۲/۱۹) اور (۴۸/۵۳) وغیرہ۔

## ۲۔ شکر

جہاں تک شکر کا تعلق ہے یہ قرآن مجید کی دیگر اصطلاحات کی طرح ایک بہت جامع اور کثیر المعانی اصطلاح ہے اس پر تفصیلی بحث چھٹے باب میں کی گئی ہے۔ اس کے بنیادی معنی بھر جانا اور اظہار کرنا کے ہیں۔ صاحب تاج العروس کے نزدیک انسان کی طرف سے شکر کے معنی اطاعت اور ادائے فرض، نیز احسان مندی کے جذبات کا اظہار اور خدا کی طرف سے شکر کے معنی پورا پورا بدلہ دینا، تھوڑے عمل کا بڑھا کر اجر دینا ہے۔ اب اگر اس اصطلاح کے معنی پر غور کیا جائے جو اطاعت، ادائے فرض اور احسان مندی کے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ انسان یہ جملہ افعال کب انجام دے گا؟ ظاہر ہے اگر اسکا اللہ کی ذات پر ایمان کامل ہوگا اور وہ یہ حقیقت تسلیم کرتا ہوگا کہ اسے حاصل ہونے والی تمام نعمتیں اللہ ہی کی عطا ہیں جبھی وہ سر تسلیم خم کرے گا ورنہ نہیں۔ اس بنیاد پر قرآن رزق کے حوالے سے انسانوں کو دو (۲) گروہوں میں تقسیم کرتا ہے ایک مومن دوسرے کافر۔ اول الذکر یہ حقیقت تسلیم کرتے ہیں جبکہ ثانی الذکر نہیں۔ اسی بنیاد پر رزق کے حوالے سے دو بالکل علیحدہ علیحدہ تقدیریں متعین ہیں جو جس راہ پر چلنا چاہے گا اس پر ویسی ہی تقدیر منطبق ہو جائے گی۔ اس حوالے سے قوانین بھی الگ الگ ہیں جو دونوں قسم کے افراد پر منطبق ہوتے ہیں اور اسی بنیاد پر ظاہر ہے نتائج بھی الگ الگ مرتب ہوتے ہیں۔ اول الذکر دنیاوی اور اخروی دونوں فلاح پر منتج ہوتے ہیں جبکہ ثانی الذکر ممکنہ طور پر دنیاوی نعمتوں سے متمتع ہو سکتا ہے لیکن اس کا حتمی انجام

Marfat.com

بہت بڑی تباہی اور ذلت ہے۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے خیر اور شر کے دونوں راستے دکھا دیئے ہیں انسان کو اختیار و ارادہ کی دولت بھی عطا کی ہے اب یہ اس کی مرضی ہے کہ وہ ان دونوں راہوں میں سے کونسی راہ اختیار کرتا ہے۔ ظاہر ہے معاشی معاملات کو بھی اس سے کوئی استثناء حاصل نہیں ہے یہاں بھی دنیاوی فوری مفاد اور اخروی طویل المعیاد مفادات دونوں کی راہیں کھلی ہیں انسان جو چاہے راہ اختیار کر سکتا ہے۔

وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ (۱۶/۶۷)

اور کھجور اور انگور کے درختوں کے پھلوں سے تم شراب بنا لیتے ہو اور عمدہ رزق بھی جو لوگ عقل رکھتے ہیں ان کے لئے اس میں بہت بڑی نشانی ہے۔

اس آیت کریمہ میں واضح طور پر حصول رزق کے لئے دونوں راہوں کی کھلی کھلی نشاندہی کر دی گئی ہے۔ یہ کائنات، سورج، چاند، زمین وغیرہ انسان کے لئے مسخر کر دیئے گئے ہیں انسان کو زمین و آسمان میں موجود چیزوں پر تصرف کا حق بھی دے دیا گیا ہے ان چیزوں سے انسان اپنے لئے کونسی راہ اختیار کرتا ہے یہ انسان کا اپنا فیصلہ ہے۔ کھجور اور انگور کے درخت انسان کے قبضے و اختیار میں ہیں اور ان کی پیداوار بھی۔ اب اگر انسان ان سے شراب بناتا ہے تو یہ فوری مفاد کا فیصلہ ہے۔ شراب کے نقصانات سب پر واضح ہیں ماسواء مستثنیات کے اس سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا اور جیسا کہ خود قرآن مجید نے تصدیق کی ہے اس کے فوائد بہت کم اور نقصانات زیادہ ہیں۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ؕ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ؗ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ؕ (۲/۲۱۹)

یہ آپ سے شراب اور جوئے کے بارے میں پوچھتے ہیں کہہ دیجئے کہ ان میں نقصانات بڑے ہیں اور لوگوں کے لئے کچھ فائدے بھی ہیں مگر ان کے

Marfat.com

نقصانات فوائد سے کہیں زیادہ ہیں۔

اور ایک دوسری جگہ پر حتمی طور پر بتادیا گیا کہ شراب اور جوا اور اس قسم کے دیگر تمام کام ناپاک ہیں اور شیطانی افعال ہیں اور فلاح کے لئے ان سے مجتنب رہنا لازمی ہے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (۵/۹۰)

اے اہل ایمان! شراب اور جوا اور بت اور پانسے (یہ سب) ناپاک افعال اور اعمال شیطان سے ہیں سو ان سے بچتے رہنا تاکہ نجات پاؤ۔

ان آیات ربانی سے واضح ہے کہ شراب ایک ناپاک شے ہے اور ناپاک شے سے حاصل ہونے والا رزق بھی ناپاک ہی ہوگا اب اگر ایک انسان ناپاک شے اور اسے حاصل ہونے والے ناپاک رزق کا انتخاب کرتا ہے تو ظاہر ہے اس کی شخصیت پر اسی قسم کے اثرات رونما ہوں گے۔ وہ ایک ایسی شے کی تجارت میں مصروف ہے جس کے انسانوں پر منفی اثرات رونما ہوتے ہیں بالفاظِ دیگر وہ لوگوں پر ظلم کر رہا ہے اس ظلم کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اسے خود بھی اسی قسم کے منفی نتائج کے لئے تیار رہنا ہوگا۔ اس حوالے سے سیدھا سا قرآنی اصول یہ ہے کہ:۔

لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ (۲/۲۷۹)

نہ تم کسی پر ظلم کرو گے نہ تم پر ظلم کیا جائے گا۔

اس سادہ سے اصول کے تحت کوئی بھی انسان، کبھی بھی، کسی بھی جگہ، جب بھی، کوئی بھی ظلم کرے گا تو اسے اس کے مساوی ظلم کو سہنا بھی ہوگا اور اگر کوئی کسی پر ظلم نہیں کرے گا تو اس پر بھی کوئی ظلم نہیں ہوگا۔

شراب کی تجارت ایک ظلم ہے لہٰذا لازمی طور پر اس کے تاجر کو اس کے مساوی ظلم کا سامنا کرنا ہوگا۔ یہ مکافات عمل ہے جس سے کوئی کسی قسم کا فرار یا اس سے استثناء ممکن نہیں

ہے لہٰذا:۔

جس کو ہو جان و دل عزیز

وہ اس کی گلی میں جائے کیوں

یہاں واضح رہے کہ یہاں شراب ان تمام منفی قسم کی تجارت کی ایک علامت ہے جو نوعِ انسانی پر منفی اثرات ڈالتے ہیں اس میں ہمہ اقسام کے منفی افعال شامل ہیں مثلاً جوا، لوٹ مار، ڈاکہ، رہزنی، دھوکہ دہی، جبراستحصال یا اس نوع کی کسی بھی قسم کی سرگرمی اس میں شامل ہے۔

اس کے برخلاف وہی کھجور اور انگور جس سے شراب جیسی مضر شے بنائی گئی انہی اشیاء کو اگر ذریعۂ تجارت بنالیا جائے تو یہ انسانوں کے لئے نفع بخش ہی نہیں ہوتیں بلکہ انہیں خود اللہ نے رزقا حسنا کہا ہے یعنی عمدہ اور متوازن رزق۔

حسن سے مراد ہوتی ہے اعضاء کا صحیح تناسب اور توازن لہٰذا حسن کے بنیادی معنی ہیں تناسب وتوازن کا قائم رہنا یہ سُوء کی ضد ہے اس کے مقابلے میں فساد کا لفظ آیا ہے (۷/۷/۲۸) جس کے معنی بگڑے ہوئے توازن کے ہیں۔ لہٰذا الاحسان کے معنی ہیں کسی کے بگڑے ہوئے توازن کو ٹھیک کردینا احسان دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک تو کسی دوسرے پر انعام کرنا (یعنی اس کی کمی کو پورا کر کے اسکا توازن درست کردینا) اور دوسرے خود اپنے کاموں (سیرت وکردار) میں توازن پیدا کرنا، اس میں حسن پیدا کرنا۔

قرآن مجید میں حسنات (بمقابلہ سیئات) زندگی کی خوشگواریوں کے لئے آیا ہے مثلاً (۳/۱۱۹)، (۱۳۱/۷) سورۃ توبہ میں حُسۡنَۃٌ کے مقابلے میں مُصِیۡبَۃٌ آیا ہے (۹/۵۰)۔

تصریحات بالا سے واضح ہے کہ جب قرآن تجارت کو "رزقا حسنا" کہتا ہے تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ تجارت یا کوئی بھی جائز اور حلال ذریعۂ رزق انسانی شخصیت میں توازن پیدا کرتا ہے اور یہی وہ توازن ہے جس کے قائم رہنے یا نہ رہنے پر روز قیامت

Marfat.com

انسان کی نجات کا انحصار ہوگا۔ باالفاظ دیگر جائز یا حلال ذریعۂ رزق انسانی شخصیت کے توازن کو بناتا اور سنوارتا اور اسے مستحکم کرتا ہے جبکہ ناجائز، غلط، حرام یا ناپاک ذریعۂ رزق فساد کا موجب ہوتا ہے۔ یہی وہ بنیادی حقیقت ہے جس کی طرف متذکرہ بالا آیت (۱۶/۶۷) میں نشاندھی کی گئی ہے اور اسی وجہ سے آیت کے آخری حصے میں یہ کہا گیا ہے کہ اس (پوری مثال) میں عقل والوں کے لئے بڑی نشانی ہے۔ ظاہر ہے جو صاحب عقل ہیں وہ کسی صورت اول الذکر راہ اختیار نہیں کریں گے بلکہ ثانی الذکر کو ترجیح دیں گے۔ وہ اصحاب جن کے سینے نور حق سے منور ہیں وہ حلال ذرائع رزق کے لئے کوشش کریں گے جو اس روشنی سے محروم ہیں اور محروم رہنا چاہتے ہیں ان کے لئے تباہی مقدر ہے سیدھی سی بات ہے جیسی درآئیدات (Input) ہوں گی ویسے ہی برآئیدات (Output) ہوں گی۔ اس بنیادی حقیقت کو قرآن مجید میں اس انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهُ بِإِذْنِ رَبِّهِ وَالَّذِي خَبُثَ لَا يَخْرُجُ إِلَّا نَكِدًا كَذَٰلِكَ نُصَرِّفُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَشْكُرُونَ (۷/۵۸)

(جو) زمین پاکیزہ (ہے) اس میں سے سبزہ بھی اپنے رب کے حکم سے (نفیس) نکلتا ہے اور جو خراب ہے اس میں سے جو کچھ نکلتا ہے ناقص ہوتا ہے اس طرح ہم آیات کو شکر گذار لوگوں کے لئے پھیر پھیر کر بیان کرتے ہیں۔

باالفاظ دیگر ایسی زمین جو خود طیب ہو وہ اپنے رب کے حکم سے اچھی پیداوار دیتی ہے اور جو زمین خبیث ہو اس سے خراب نتائج ہی حاصل ہو سکتے ہیں۔ اسی مثال کو اگر انسانوں پر منطبق کیا جائے تو صورت حال کچھ اس طرح ہوگی کہ وہ لوگ جو راہِ حق پر ہیں ان سے اعمال صالحہ کی توقع کی جا سکتی ہے اور جو راہ ھدایت سے دور ہیں ان سے صرف منفی اعمال، منفی حرکات کی ہی توقع کی جا سکتی ہے۔ تمام انسانوں کی جسمانی اور ذہنی ساخت ایک ہی

Marfat.com

طرح کی ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود اعمال مختلف ہوتے ہیں ان کے نتائج مختلف ہوتے ہیں۔ اس بات کو تمثیل کے انداز میں کچھ اس طرح قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے۔

وَفِی الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّنَخِیْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَیْرُ صِنْوَانٍ یُّسْقٰی بِمَآءٍ وَّاحِدٍ وَّنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰی بَعْضٍ فِی الْاُكُلِ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ (۱۳/۴)

اور زمین میں کئی طرح کے قطعات ہیں ایک دوسرے سے ملے ہوئے اور انگور کے باغ اور کھیتی اور کھجور کے درخت بعض کی شاخیں ہیں اور بعض کی اتنی نہیں ہوتیں (باوجودیکہ) سب ایک ہی پانی سے سیراب ہوتے ہیں اور ہم بعض میوں کو بعض پر لذت میں فضیلت دیتے ہیں اسمیں سمجھنے والوں کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں۔

جیسا کہ اس آیت (۱۳/۴) میں کہا گیا ہے کہ تمام نباتات کو ملنے والا پانی ایک ہی ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود بلحاظ لذت بعض میوں کو بعض پر فضیلت حاصل ہے۔ اس مثال کو اگر انسانوں پر منطبق کیا جائے تو متذکرہ بالا آیت (۵۸/۷) میں بیان کردہ حقیقت ہی ہمارے سامنے آتی ہے یعنی زمین بہ حیثیت کل ایک ہی ہے لیکن اچھی زمین کی پیداوار، خراب زمین کے مقابلے میں مختلف ہوتی ہے جبکہ پانی سب کو ایک ہی ملتا ہے۔ اس بات کو انسانی تناظر میں لیا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ تمام انسانوں کو سمع، بصر اور قلب کی دولت یکساں ملتی ہے ان کی جسمانی اور ذہنی نشو ونما کا انداز بھی یکساں ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ مختلف قسم کے افعال اور ان افعال کے لحاظ سے نتائج پیدا کرتے ہیں۔

جہاں تک زمین کا معاملہ ہے وہ تو اللہ کے قوانین کی تابع ہے اور مشیت الٰہی کی جانب سے متعین کردہ قوانین کے مطابق مختلف صورتوں میں مختلف قسم کی پیداوار دیتی ہے۔ لیکن انسانوں کا معاملہ مختلف ہے۔ انسانوں کو اختیار و ارادہ کی قوت دی گئی ہے۔ وہ اپنی راہ

Marfat.com

خود متعین کرسکتا ہے تو آخر وہ کونسی ایسی شے ہے جس کی وجہ سے انسانوں میں اتنا فرق پیدا ہو جاتا ہے ظاہر ہے وہ صرف اور صرف ایک شے ہے اور وہ شے ہے اللہ پر ایمان۔ یہیں سے انسانوں کے راستے سب کچھ یکساں ہونے کے باوجود الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ جو لوگ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں ان کی اساس، نظریات، افعال، نتائج ان سے قطعی الگ ہوتے ہیں جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے۔

پرواز ہے دونوں کی اس ایک جہاں میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہین کا جہاں اور

اس بنیاد پر مسلم اور غیر مسلم کی رزق کی تقدیریں بھی جدا جدا ہو جاتی ہیں۔ اور جیسا کہ تیسرے باب میں وضاحت کی جا چکی ہے رزق دینے والی ذات صرف اور صرف اللہ کی ہے (۳۹/۳۴) زمین میں رہنے والا کوئی جاندار ایسا نہیں جسکا رزق اللہ کے ذمے نہ ہو (۱۱/۶) لیکن توجہ طلب امر یہ ہے کہ انسانوں میں سے ہی کفار کے لئے پورے قرآن مجید میں رزق کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا بلکہ صرف یہ کہا گیا ہے کہ وہ صرف متمتع ہوتے ہیں اور روز قیامت تو ان پر مشروبات و ماکولات دونوں حرام ہوں گے۔ جبکہ اس کے برعکس مومنین کو کہا گیا کہ انہیں جو رزق اللہ عطا کرتا ہے وہ باقی رہ جانے والا ہے۔ (۲۰/۱۳۱) بالفاظ دیگر کفار کی تمام تر دنیاوی چیزوں سے "استفادہ" کی تقدیر اس دنیا کی حد تک محدود ہے جبکہ مومنین کی اس دنیا سے لیکر جنت تک محیط ہے۔ ان دونوں حوالوں سے ان کی رزق کی تقدیر کا تجزیہ مندرجہ ذیل ہے۔

## مومنین کے لئے رزق کی تقدیر

جہاں تک اہل ایمان کا تعلق ہے اس حوالے سے بنیادی اصول یہ متعین کر دیا گیا ہے کہ دنیا کی تمام اشیاء زینت اور جملہ اشیاء رزق میں سے پاک اشیاء صرف اہل ایمان کے لئے ہیں۔

Marfat.com

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ؕ قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (۷/۳۲)

آپ کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ کے پیدا کیئے ہوئے اسباب زینت کو جس کو اس نے اپنے بندوں کے لئے بنایا ہے اور کھانے پینے کی حلال چیزیں دنیا کی زندگی میں ایمان والوں کے لئے ہیں اور قیامت کے دن خاص انہی کا حصہ ہوں گی اسی طرح اللہ اپنی آیات سمجھنے والوں کے لئے کھول کر بیان فرماتا ہے۔

یہ آیت واضح طور پر اس امر پر دلیل ہے کہ وہ تمام تر اشیاء زینت جو اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہیں اور کھانے پینے کی حلال اشیاء دنیا میں اہل ایمان کے لئے پیدا کی گئی ہیں گو کفار بھی ان سے فیض یاب اور متمتع ہو لیتے ہیں اور بسا اوقات وہ اس حوالے سے مسلمانوں سے آگے نظر آتے ہیں لیکن یہ بالتبع اور عارضی ہے۔ روز قیامت تو یہ نعمتیں صرف اور صرف اہل ایمان کے لئے مخصوص ہوں گی کیونکہ کافروں پر جس طرح جنت حرام ہوگی اسی طرح ماکولات اور مشروبات بھی حرام ہوں گے۔ جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ دنیاوی زینت کی اشیاء اور کھانے پینے کی حلال اشیاء صرف مسلمانوں کے لئے ہی کیوں ہیں؟ اسکا سیدھا سا جواب یہ ہے کہ اہل ایمان جو رزق حاصل کرتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے طریقوں اور اس کی حدود میں رہتے ہوئے حاصل کرتے اور استعمال کرتے ہیں اس کے نتیجے کے طور پر یہ رزق ان کے نفس کے توازن کا ذریعہ بنتا ہے اور یہی توازن خیر اور بقا کی راہ ہے جیسا کہ تیسرے باب میں تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے۔ اسی طرح صرف رزق ہی نہیں بلکہ دنیا کی تمام اشیاء مومن اس نقطۂ نظر سے حاصل کرتا اور استعمال کرتا ہے۔ اس طرح نہ صرف رزق بلکہ دنیا کی تمام اشیاء مومن کے لئے بذات خود مقصد نہیں ہوتیں بلکہ

Marfat.com

ایک اعلیٰ ترین مقصد یعنی اللہ کی رضا اور اخروی نجات کے حصول کا ذریعہ بنتی ہیں۔ جبکہ اس کے برعکس ایک غیر مسلم چونکہ حیات بعد الموت پر یقین ہی نہیں رکھتا لہٰذا وہ جب رزق حاصل کرتا ہے یا دنیا کی کوئی بھی دیگر شے حاصل کرتا ہے تو اسکا انتہائی مفاد ان اشیاء سے زیادہ سے زیادہ تسکین ہوتا ہے اس سے زائد نہیں۔ لہٰذا قانون قدرت کے مطابق یہ اشیاء اسے اس کی مطلوبہ شے یعنی لذت فراہم کر دیتی ہیں اور اس کے بعد معاملہ ختم۔

اس کے برعکس جماعت مومنین کے لئے نہ صرف یہ کہ دنیا کی تمام اشیاء زینت اور حلال ماکولات و مشروبات مومنین کے لئے ہیں بلکہ قرآن ان کے رزق کو رزقِ کریم (معزز رزق) سے ممیز کرتا ہے۔ یہ مومنین کے لئے اللہ کی دیگر بے شمار نعمتوں میں ایک اور نعمت ہے۔

باالفاظ دیگر یہ کہا جاسکتا ہے کہ مومنین کو دیگر لوگوں پر ان کے ایمان اور اعمال صالح کی وجہ سے فضیلت حاصل ہے اور اس فضیلت کی وجہ سے انہیں رزق بھی عام لوگوں سے برتر (رزق کریم) حاصل ہوتا ہے۔ اور بہر حال از روئے قرآن فضیلت والے بہتر ہیں۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّمَنْ رَّزَقْنٰهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا فَهُوَ يُنْفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَّجَهْرًا ۭ هَلْ يَسْتَوٗنَ ۭ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (۱۶/۷۵)

خدا ایک اور مثال بیان فرماتا ہے کہ ایک غلام ہے جو (بالکل) دوسرے کے اختیار میں ہے اور کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتا اور ایک ایسا شخص ہے جس کو ہم نے اچھا رزق عطا فرمایا ہے اور اس میں سے پوشیدہ اور ظاہر خرچ کرتا رہتا ہے تو کیا یہ دونوں اشخاص برابر ہیں؟ (ہرگز نہیں) الحمد للہ لیکن ان میں سے اکثر لوگ علم نہیں رکھتے۔

اس کے علاوہ (۱۶/۷۶) میں بھی فضیلت والے لوگوں کی برتری تسلیم کی گئی ہے،

Marfat.com

یہی وہ بنیادی وجہ ہے جس کی وجہ سے مومنین کو معزز رزق دیا جاتا ہے جبکہ دیگر لوگوں کو عام رزق۔

## کفار کے لئے رزق کی تقدیر

کافر سے مراد اس شخص کے ہوتے ہیں جو قرآنی صداقتوں کا انکار کرے یا انہیں تسلیم نہ کرے بالفاظ دیگر منکر حق کو کافر کہا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں کفر کا لفظ عمل صالح کے مقابلے میں استعمال کیا ہے (۳۰/۲۴) لہذا ایمان اور کفر صرف نظری اعتقاد نہیں بلکہ صحیح اور غلط افعال کا نام ہے۔ کافر نہ صرف یہ کہ اسلام اور قرآن کی ابدی صداقتوں کو تسلیم نہیں کرتا بلکہ دیگر لوگوں کو بھی اسلام کی راہ سے روکتا ہے۔ قرآن مجید نے کفار کے اس فعل کے متعدد اسباب گنوائے ہیں مثلاً اہل کتاب کے متعلق کہا گیا کہ وہ ضد اور سرکشی کی بنا پر ایسا کرتے ہیں (۲/۶۰) یا حسد کی بنا پر ایسا کرتے ہیں (۲/۱۰۹) عام مخالفین عرب اپنے تکبر کی بنا پر ایسا کرتے تھے (۳۵/۴۲) کیونکہ اسلام سے ان کے مفادات پر ضرب پڑتی تھی۔ ان کی اس روش کے نتیجے کے طور پر قانون فطرت کے مطابق ان کی سوچنے، سمجھنے، دیکھنے اور سننے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے نہ صرف ختم ہو جاتی ہے بلکہ ان صلاحیتوں کی حیات نو کے امکانات بھی ختم ہو جاتے ہیں (۲/۷)۔ درحقیقت یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنی سوچنے سمجھنے غور و تدبر کی صلاحیتوں کو استعمال نہیں کرتے اور اندھا دھند اپنی ڈگر پر چلے چلے جاتے ہیں۔ یہ محض حیوانیت ہے بلکہ اس سے بھی نچلی سطح۔

یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو چونکہ اللہ پر ایمان نہیں رکھتے لہذا ان کے نزدیک کسی اخلاقی قدر کی بھی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ ان کے نزدیک یہ دنیا ہی سب کچھ ہوتی ہے۔ یہ اپنی خواہشات کے غلام ہوتے ہیں (دور حاضر کی معاشیات کے انتہائی تسکین یا انتہائی منافع کے حصول کے تصور کو اسی پس منظر میں دیکھا جانا چاہیے) نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان کے کانوں اور دلوں پر مہریں لگ جاتی ہیں اور آنکھوں پر پردے پڑ جاتے ہیں۔

Marfat.com

ان کے نزدیک حیات چونکہ اسی دنیا تک محدود ہوتی ہیں لہٰذا حیات بعد الموت کا تصور ان کے لئے بے معنی ہوتا ہے اور وہ صرف دنیا ہی کے ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کیلئے قرآن مجید کا واضح حکم ہے۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ ۚ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۙ وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ (۴۲/۲۰)

جو شخص آخرت کی کھیتی کا طالب ہو اس کے لئے ہم اس کی کھیتی میں افزائش کریں گے اور جو دنیا کی کھیتی کا خواستگار ہو اسے ہم اس میں سے دیں گے اور اس کا آخرت میں کچھ حصہ نہ ہوگا۔

دنیا میں بھی یہ لوگ (کفار) اللہ کی نعمتوں سے کسی قدر متمتع ہو سکتے ہیں اس سے زائد نہیں۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّ ارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗٓ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ (۲/۱۲۶)

اور جب ابراہیم نے کہا کہ اے میرے رب اس جگہ کو امن کا شہر بنا اور اس کے رہنے والوں میں سے جو خدا پر اور روز آخرت پر ایمان لائیں ان کو کھانے کو میوے عطا فرما تو خدا نے کہا جو کافر ہوگا میں اس کو بھی کسی قدر متمتع کروں گا (مگر) پھر انہیں آگ کے عذاب کی طرف بے بس کر دوں گا اور یہ نتیجے کی بہت بری جگہ ہے۔

اس آیت میں قطعی واضح اور دو ٹوک انداز میں یہ بتا دیا گیا ہے کہ اللہ کے قانون کے مطابق کفار اس کی پیدا کی گئی چیزوں سے صرف متمتع ہو سکتے ہیں اور وہ بھی پورے نہیں محض ایک قلیل مقدار میں اس سے زائد نہیں۔ اور اس معمولی سے فائدے کے بعد انکا انجام

Marfat.com

صرف اور صرف دوزخ کی بھڑکتی ہوئی آگ ہے۔ انہوں نے چونکہ صرف دنیا کو مقصد جانا لہٰذا انہیں دنیا دے دی جاتی ہے۔ اندازہ کیجئے کتنے برے ہیں یہ لوگ اور اس سے کتنی زیادہ بری وہ تقدیر ہے جسکا انتخاب یہ خود اپنے لئے کرتے ہیں۔

یہ وہ دو نقطہ ہائے نظر ہیں جن کو بنیاد بنا کر قرآن مجید کے رزق کے بست وکشاد کے قوانین کو سمجھا جا سکتا ہے۔ ایک فکر جو اہل ایمان کی ہے وہ طویل المعیاد منفعت کی سوچ ہے جبکہ دوسری فکر جو کہ کفار کی ہے وہ فوری فائدے کے حصول پر مبنی ہے۔ اس پس منظر میں اگلے ابواب میں قرآن مجید کے رزق کے بست وکشاد کے قوانین کو بیان کیا گیا ہے۔

باب ٦

# رزق کی کشادکے قوانین

جیسا کہ گذشتہ باب میں عرض کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر اپنی نعمتوں کی تکمیل چاہتا ہے تاہم یہ امر چند شرائط سے مشروط ہے اس باب میں انہی شرائط یا بالفاظِ دیگر قوانین پر بحث کی گئی ہے جن پر عمل کے نتیجے میں رزق میں کشادگی پیدا ہوتی ہے۔

## پہلا قانون: اللہ کی کتاب کی اطاعت سے رزق کی کشاد

سورۃ المائدہ میں اہل کتاب کے متعلق کہا گیا ہے کہ اگر وہ تورات اور انجیل اور جو دیگر کتابیں ان پر ان کے رب کی طرف سے نازل کی گئی تھیں اگر وہ ان پر عمل پیرا رہتے تو ان پر رزق مینہ کی طرح برستا۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ؕ مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ؕ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ ؑ (۵/٦٦)

اگر یہ لوگ تورات اور انجیل اور ان کی جانب جو کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ان کے پورے پابند رہتے تو یہ لوگ اپنے اوپر سے اور نیچے سے کھاتے ان میں کچھ لوگ میانہ رو ہیں ور بہت سے ایسے ہیں جن کے اعمال بُرے ہیں۔

یہ آیت سیدھے سادے انداز میں اس امر کی شہادت ہے کہ جب بھی اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکامات خواہ وہ ان کتابوں میں تھے جو اب تاریخ کا حصہ ہیں یا قرآن مجید میں ہوں ان پر جب بھی، جہاں بھی عمل کیا جائے گا فراوانیٔ رزق اس کا لازمی نتیجہ ہے۔ جہاں تک اوپر نیچے سے رزق کا تعلق ہے اوپر سے مراد آسمان ہے یعنی حسبِ ضرورت خوب بارشیں اور نیچے سے مراد زمین ہے جس سے اچھی بارش کے نتیجے میں خوب پیداوار حاصل

Marfat.com

ہوتی۔ اس حقیقت کا اعادہ سورۃ الاعراف میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ
(۷/۹۶)

اگر ان بستیوں کے لوگ ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکات (کے دروازے) کھول دیتے مگر انہوں نے تو تکذیب کی سو ان کے اعمال کی سزا میں ہم نے ان کو پکڑ لیا۔

یہ صورتِ حال خود قرآن مجید کے ساتھ بھی ہے قرآن مجید میں دیئے گئے احکام کی اطاعت کی صورت میں معیشت میں توسیع اور عدم اطاعت یا قرآنی احکام سے روگردانی کی صورت میں معیشت تنگ ہو جائے گی۔

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ط (۲۰/۱۲۴)

جو میرے ذکر سے اعراض کرے گا اس کی معیشت تنگ ہو جائے گی اور (روز) قیامت اسے ہم اندھا کر کے اٹھائیں گے۔

'ذکر' قرآن مجید کی ایک کثیر المعانی اصطلاح ہے اور خود قرآن مجید نے اپنے آپ کو ذکر کہا ہے۔

كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۞ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ (۸۰/۱۱-۱۲)

دیکھو یہ (قرآن) نصیحت (ذکر) ہے پس جو چاہے اسے یاد رکھے۔

اس کے علاوہ (۷۵/۵۴)، (۷۶/۲۹)، (۳۳/۳۴) میں اور بعض دیگر مقامات پر بھی قرآن مجید کو ذکر کہا گیا ہے۔ اس بنیاد پر متذکرہ بالا آیت (۲۰/۱۲۴) کا مفہوم یہ ہوگا کہ جو بھی قرآن مجید سے اعراض کرے گا اس کی معیشت تنگ ہو جائے گی اور اس کی دنیا اور

آخرت دونوں برباد ہو جائیں گی۔ باالفاظِ دیگر قرآن مجید سے ہمیں وہ اصول وقوانین حاصل ہوتے ہیں جن پر رزق کی بست وکشاد کا انحصار ہوتا ہے جو شخص بھی، جب بھی، جہاں بھی ان اصولوں یا ان قوانین پر عمل کرے گا اس کا رزق کشادہ ہو جائے گا اور دنیا جہاں کی نعمتیں اس کی جانب کھینچی چلی آئیں گی اور اعراض کی صورت میں معیشت کی تنگی یا رزق کی بستگی اس کا مقدر ہو گی اور قیامت میں بھی اسے اندھا اٹھایا جائے گا۔

اس حوالے سے قرآن مجید کے بعض احکام ایسے ہیں جو پوری نوع انسانی کے لیے ہیں ان میں امتناع ربا کا حکم، حرام مال کھانے سے اجتناب، ناپ تول کو پورا رکھنا، امانت میں خیانت نہ کرنا، اسراف وتبذیر سے اجتناب، رشوت سے بچنا وغیرہ ایسے احکام ہیں جو پوری نوع انسانی کے لیے ہیں۔

ان افعال سے مجتنب رہنے سے رزق کے دروازے خود بخود کھل سکتے ہیں یہ نتیجہ قرآن مجید کی متذکرہ بالا آیت (۲۰/۱۲۴) سے بالواسطہ اخذ کیا گیا ہے۔ اس آیت کریمہ پر اگر غور کیا جائے تو اس آیت میں بنیادی بات یہ کہی گئی ہے کہ ”جو میرے ذکر سے اعراض کرے گا اس کی معیشت تنگ ہو جائے گی“۔ باالفاظِ دیگر کوئی بھی انسان وقت کے کسی بھی لمحے میں ان قوانین سے انحراف کرے گا جو قرآن مجید میں دیئے گئے ہیں تو اس کی معیشت تنگ ہو جائے گی۔ یہ آیت سیدھے سادے انداز میں اس حقیقت کی نشاندہی کر رہی ہے کہ قرآنی احکام سے انحراف کا نتیجہ معیشت کی تنگی ہے جب قرآنی احکام سے انحراف سے معیشت تنگ ہو جاتی ہے تو ظاہر ہے ان پر عمل کے نتیجے میں معیشت خود بخود کشادہ ہو جائے گی۔ لہٰذا جو فرد بھی ان احکامات پر جو پوری نوع انسانی کے لیے دیئے گئے ہیں ان پر عمل کرے گا اس کی معیشت میں کشادہ لازمی ہے اور برعکس صورت میں برعکس نتیجہ برآمد ہو گا۔ باالفاظِ دیگر یہ ایک عمومی حکم ہے جو پوری نوع انسانیت کے لیے ہے اور یہاں مسلم اور غیر مسلم کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔

قرآن مجید کے ایسے احکام جو پوری نوع انسانی کو دیئے گئے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:

## ۱۔امتناع ربا:

تمام نوع انسانی کو ربا سے مجتنب رہنے کے لیے کہا گیا ہے باالفاظِ دیگر سرمایہ کی کسی بھی شکل کا معاوضہ بالکلیۂ حرام قرار دے دیا گیا ہے جیسا کہ پہلے باب میں وضاحت کی جا چکی ہے۔

## ۲۔ حرام مال کھانے سے اجتناب

اس حوالے سے حکم قرآنی ہے۔

وَلَا تَاْکُلُوْٓا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ (۲/۱۸۸)

اور ایک دوسرے کا مال باطل طریقوں سے مت کھاؤ۔

یہاں باطل طریقوں سے مراد وہ تمام ذرائع ہیں جنہیں عرف عام میں غلط اور ناجائز تصور کیا جاتا ہے یعنی دھوکہ دہی، ناجائز دباؤ، ظلم، استحصال، فریب اور اس نوع کی دیگر تمام سرگرمیاں۔

## ۳۔ ناپ تول پورا رکھنا

ازروئے قرآن ناپ تول ہر حال میں پورا رکھنا لازمی ہے۔

و اوفوا الکیل والمیزان بالقسط (۶/۱۵۲)

اور ناپ تول انصاف کے ساتھ پورا پورا کیا کرو۔

## ۴۔ امانت میں خیانت نہ کرنا

امانت میں خیانت نہ کرنے کا حکم بھی نوع انسانی کو ان الفاظ میں دیا گیا ہے:

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓی اَھْلِھَا (۴/۵۸)

بے شک اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانت والوں کی امانتیں ان کے حوالے کر دیا کرو۔

Marfat.com

## ۵۔ اسراف وتبذیر سے اجتناب

اسراف وتبذیر دونوں سے مجتنب رہنے کا حکم ہے۔

وَ لَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا (۱۷/۲۶)

اور فضول خرچی نہ کرو۔

کیونکہ اس کا انجام صرف اور صرف تباہی ہے۔

وَ اَهْلَكْنَا الْمُسْرِفِيْنَ (۲۱/۹)

اور مسرفین کے لیے ہلاکت ہے۔

## ۶۔ رشوت سے بچنا

دوسروں کے مال پر ناجائز قبضے کے لیے حکام کو رشوت دینے سے منع کیا گیا ہے:

وَ لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَ تُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۲/۱۸۸)

اور ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ اور نہ اس کو (رشوۃ) حاکموں کے پاس پہنچاؤ تا کہ لوگوں کے مال کا کچھ حصہ ناجائز طور پر نہ کھا جاؤ اور تم جانتے بھی ہو۔

## ۷۔ یتیموں کا مال کھانے سے بچنا

نوع انسانی کو یتیموں کے مال کو ناجائز کھانے سے مجتنب رہنے کا حکم ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ؕ وَ سَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا (۴/۱۰)

اور جو لوگ یتیموں کا مال ظلم سے کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں آگ بھرتے ہیں اور عنقریب وہ جہنم کی آگ میں جلیں گے۔

Marfat.com

## ۸۔ اللہ کو قرض

تمام بنی نوع انسانی کو دیے جانے والے عمومی احکام میں سے ایک اپنے مال و دولت کو دوسروں کی امداد و اعانت کے لیے کھلا رکھنا بھی ہے۔ قرآن مجید فرقان حمید کی وہ آیات جن میں انفاق (مال کو اللہ کی راہ میں کھلا رکھنا) کا حکم دیا گیا ہے ان تمام آیات پر اگر تدبر کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اکثر مقامات پر اس کا حکم بالخصوص مسلمانوں کو دیا گیا ہے اور اسے مسلمانوں کی ایک نمایاں خصوصیت کی حیثیت سے گنوایا گیا ہے۔ تاہم بعض مقامات پر یہ حکم عمومی نوعیت کا بھی ہے مثلاً:

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَہٗ لَہٗٓ اَضْعَافًا کَثِیْرَۃً ط
(۲/۲۴۵)

کوئی ہے کہ اللہ کو قرض حسنہ دے کہ وہ اس کے بدلے اس کو کئی حصے زیادہ دے گا۔

سورۃ الحدید میں پھر اس دعوت کا اعادہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَہٗ لَہٗ وَ لَہٗٓ اَجْرٌ کَرِیْمٌ ط
(۵۷/۱۱)

کوئی ہے جو اللہ کو قرض حسنہ دے کہ وہ اس کو اس سے دوگنا ادا کرے یہ اس کے لیے عزت کا صلہ ہے۔

متذکرہ بالا دونوں آیات کے ابتدائی الفاظ ''کوئی ہے'' اس امر کے صریحاً غماز ہیں کہ یہ دعوت پوری نوع انسانی کو دی جا رہی ہے اور پوری بنی نوع انسان میں سے کوئی بھی شخص جو یہ فعل انجام دے گا اسے اس کے بدلے کئی گنا بہتر اور باعزت صلہ خود اللہ تعالیٰ دے گا۔ کسی بھی معیشت کی افراط میں یہ فعل بہرحال ایک بہت بنیادی کردار ادا کرتا ہے اور اس کے نتیجے میں رزق میں کشاد ایک لازمی امر ہے۔

متذکرہ بالا احکامات ظاہر ہے حتمی نہیں بلکہ قرآن مجید میں بیان کردہ قوانین میں سے چند ہیں قرآن مجید پر مزید تدبر سے اس حوالے سے مزید احکامات بھی سامنے آ سکتے ہیں جن کا تعلق نوعِ انسانی سے ہے۔ ماحصل یہ کہ یہ وہ احکامات ہیں جن پر عمل کے نتیجے میں رزق کشادہ ہوجاتا ہے اور جن سے انحراف سے معیشت تنگ ہوجاتی ہے۔ ان احکامات سے انحراف کے جو شدید منفی دنیاوی اور اخروی نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ ان پر تفصیلی بحث ساتویں باب میں رزق کی بستگی کے پہلے قانون بہ عنوان ''اللہ کے ذکر سے اعراض سے معیشت تنگ ہوجاتی ہے'' کے تحت کی گئی ہے۔ یہاں قندِ مکرر کے طور پر ذہن میں رکھیے کہ متذکرہ بالا افعال سے ایک مسلم اور غیر مسلم دونوں کے رزق میں کشاد پیدا ہوتی ہے لیکن ایک غیر مسلم کی کشاد بہرحال عارضی نوعیت کی ہوتی ہے جو اس دنیا تک محدود ہوتی ہے اس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ جبکہ ایک مسلمان کی کشاد دنیا اور آخرت دونوں پر محیط ہوتی ہے۔ یہ ایک بنیادی فرق ہے جسے بہرحال ملحوظِ خاطر رہنا چاہیے۔

## دوسرا قانون: اللہ پر ایمان اور ایمان صالح کے نتیجے میں باعزت رزق

رزق کی کشاد کے لیے سب سے پہلی اور بنیادی شرط اللہ پر ایمان اور اعمال صالح ہیں۔

فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ كَرِیْمٌ ؕ
(۲۲/۵۰)

جو لوگ ایمان لائے اور اعمال صالح کیئے ان کے لیے بخشش اور عزت کا رزق ہے۔

سورۃ الرعد میں اس حقیقت کو اس انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ طُوْبٰی لَهُمْ وَ حُسْنُ مَاٰبٍ ؕ
(۱۳/۲۹)

Marfat.com

جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال کیئے ان کے لیے خوشحالی اور عمدہ ٹھکانہ ہے۔

انبیاء کی بعثت کے مقاصد میں سے سب سے اہم ترین مقصد یہ تھا کہ لوگ ایمان لائیں اور اعمال صالح کریں اس کا نتیجہ اخروی فلاح اور دنیا میں بہترین رزق ہے۔

رَّسُوْلًا یَّتْلُوْا عَلَیْکُمْ اٰیٰتِ اللّٰہِ مُبَیِّنٰتٍ لِّیُخْرِجَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ ؕ وَ مَنْ یُّؤْمِنْۢ بِاللّٰہِ وَ یَعْمَلْ صَالِحًا یُّدْخِلْہُ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِہَا الْاَنْہٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْہَاۤ اَبَدًا ؕ قَدْ اَحْسَنَ اللّٰہُ لَہٗ رِزْقًا ۝ (۶۵/۱۱)

(اور) اپنے پیغمبر (بھی بھیجے ہیں) جو تمہارے سامنے خدا کی واضح المطالب آیات پڑھتے ہیں تا کہ جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے رہے ہیں ان کو اندھیرے سے نکال کر روشنی میں لے آئیں جو شخص ایمان لائے گا اور نیک عمل کرے گا وہ جنت کے باغوں میں داخل ہوگا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں وہ ابد تک ان میں رہیں گے خدا نے ان کو خوب رزق دیا ہے۔

یہاں تک کہ تخلیق ارض وسماان کو رواں دواں رکھنے کے قوائد وضوابط (طبعی اور سماجی قوانین)، روز حشر اعمال کی جانچ اور اس کے نتیجے میں جنت اور دوزخ میں لوگوں کا داخلہ، ان تمام امور کے جملہ مقاصد میں سے ایک مقصد یہ بھی ہے کہ جو لوگ ایمان لائے اور اعمال صالح کیے ان کو ان کے اعمال کا بدلہ دیا جائے۔

وَ قَالَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَا تَاْتِیْنَا السَّاعَۃُ ؕ قُلْ بَلٰی وَ رَبِّیْ لَتَاْتِیَنَّکُمْ ۙ عٰلِمِ الْغَیْبِ ۚ لَا یَعْزُبُ عَنْہُ مِثْقَالُ ذَرَّۃٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَ لَا فِی الْاَرْضِ وَ لَاۤ اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِکَ وَ لَاۤ اَکْبَرُ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مُّبِیْنٍ ۝

Marfat.com

لِّيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ كَرِيْمٌ۝ (۳۴/۳_۴)

اور کافر کہتے ہیں کہ (قیامت کی) گھڑی ہم پر نہیں آئے گی کہہ دیجیے کہ کیوں نہیں (آئے گی) میرے رب کی قسم وہ تم پر ضرور آ کر رہے گی (وہ رب) غیب کا جاننے والا (ہے) ذرہ بھر چیز بھی اس سے پوشیدہ نہیں (نہ) آسمانوں میں نہ زمین میں بلکہ اس سے بھی چھوٹی اور بڑی ہر چیز کھلی کتاب میں موجود ہے اس لیے کہ جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے ان کو بدلہ دے یہی ہیں جن کے لیے بخشش اور عزت کا رزق ہے۔

متذکرہ بالا آیات (۲۲/۵۰)، (۱۳/۲۹)، (۶۵/۱۱) اور (۳۴/۳_۴) کا اگر تجزیہ کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ایمان اور اعمال صالح لازم و ملزوم ہیں صرف ایمان بغیر اعمال صالح کے اور اعمال صالح بغیر ایمان کے کسی کام کے نہیں۔ ان دونوں کی بیک وقت موجودگی ہی مثبت نتائج پیدا کر سکتی ہے۔ اس حوالے سے چند نقاط پر بہر حال تدبر لازمی ہے جو مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ ایمان

۲۔ اعمال صالح

۳۔ مغفرت/بخشش

۴۔ رزق کریم (عزت کا رزق)

۵۔ اخروی فلاح

ان نقاط کا انفرادی تجزیہ مندرجہ ذیل ہے۔

## ۱۔ ایمان

نہ صرف متذکرہ بالا تمام آیات بلکہ پورے قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا انسانوں سے

Marfat.com

جو سب سے پہلا مطالبہ ہے وہ ایمان باللہ یعنی اللہ پر ایمان لانے کا ہے۔ ایمان سے مراد درحقیقت کسی بات کی سچائی کو دل کے پورے سکون اور ذہن کے کامل اطمینان کے ساتھ تسلیم کرنا، یقین کرنا، کسی پر اعتماد و بھروسہ کرنا، اطاعت کرنا اور سرِ تسلیم خم کرنا ہے۔ ایمان کسی اندھے یقین کا نام نہیں بلکہ ایمان علی وجہ البصیرت لایا جاتا ہے بالفاظِ دیگر ایسی صداقتیں جو محسوس طور پر سامنے نہ ہوں یعنی انہیں محسوس نہ کیا جا سکتا ہو لیکن علم اور بصیرت ان کی گواہی دیں تو ان حقائق کو تسلیم کرنا ایمان کہلاتا ہے۔ مثال کے طور پر اللہ یا فرشتوں کا وجود، حیات بعد الموت ان کا علم حواس کے ذریعے ممکن نہیں لیکن علم اور بصیرت اس کی گواہی دیتے ہیں ان صداقتوں کو پورے اطمینان قلب کے ساتھ تسلیم کرنا ایمان کہلاتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي نَزَّلَ عَلَىٰ رَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي أَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ۚ وَمَنْ يَكْفُرْ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِيدًا (۴/۱۳۶)

مومنو خدا پر اور اس کے رسول پر اور جو کتاب اس نے اپنے پیغمبر (آخرالزمان) پر نازل کی ہے اور جو کتابیں اس سے پہلے نازل کی تھیں سب پر ایمان لاؤ اور جو شخص خدا اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے پیغمبروں اور روز قیامت سے انکار کرے وہ راستے سے بھٹک کر بہت دور جا پڑا۔

گویا ایمان کے پانچ عناصر خمسہ ہیں (۱) اللہ پر ایمان (۲) آخرت پر ایمان (۳) ملائکہ پر ایمان (۴) آسمانی کتب پر ایمان اور (۵) اللہ کے رسولوں پر ایمان۔

وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں یعنی مومنین ان کے ایمان کا معیار یہ ہے کہ وہ پھر کبھی شک میں نہیں پڑتے اور اللہ کی راہ میں جان و مال سے لڑتے ہیں۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ (۴۹/۱۵)

Marfat.com

مومن تو وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر شک میں نہ پڑے اور اللہ کی راہ میں جان اور مال سے لڑے یہی لوگ (ایمان کے) سچے ہیں۔

باالفاظ دیگر اللہ پر پختہ ایمان کے بعد اللہ کی راہ میں اپنا سب کچھ قربان کر دینے والے لوگ ہی در حقیقت مومن ہیں۔ قرآن مجید میں مختلف مقامات پر مومنین کی خصوصیات بیان کی ہیں جن میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ مغفرت کے طالب ہوتے ہیں، عذاب آخرت سے پناہ مانگنے والے (۳/۱۸)۔

۲۔ صبر کرنے والے، سچ بولنے والے، عبادت گذار، انفاق کرنے والے، اوقات سحر مین گناہوں کی معافی مانگنے والے۔ (۳/۱۷)

۳۔ خدا کے آگے سر اطاعت خم کرنے والے، فرمانبردار، اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے، خدا کو کثرت سے یاد کرنے والے۔ (۳۳/۳۵)

۴۔ اپنا مال و دولت خدا کی راہ میں کھلا رکھنے والے۔ (۲/۲۱۹)

۵۔ صاحبان علم و بصیرت جو توحید کی گواہی دیتے ہیں۔ (۳/۱۸)

۶۔ جھوٹی گواہی نہ دینے والے، بیہودہ چیزوں سے احتراز کرنے والے۔ (۲۵/۷۲)

۷۔ یتیم کے مال کی انسب انداز میں نگہداشت کرنے والے، ناپ تول میں پورے، انصاف کی بات کہنے والے، خدا کے عہد کو پورا کرنے والے، خدائی احکامات پر عمل کرنے والے۔ (۶/۱۵۳)

۸۔ ہر حال میں خدا کو یاد کرنے والے، کائنات پر غور و فکر کرنے والے یعنی صاحبان عقل و فکر، کائنات کی برحق تخلیق کی گواہی دینے والے۔ (۳/۱۹۱)

۹۔ آیات خداوندی پر اندھے بہرے بن کر نہ گرنے والے بلکہ ان پر غور و فکر اور تدبر کرنے والے۔ (۲۵/۷۳)

Marfat.com

۱۰۔ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے۔ (۴/۷۶)

۱۱۔ باہم ایک دوسرے کے دوست لیکن کفار کے لیے چٹان، کسی ملامت کرنے والے سے نہ ڈرنے والے۔ (۵/۵۴)

۱۲۔ نماز پڑھنے والے، زکوٰۃ کی ادائیگی کرنے والے اور خدا کے آگے جھکنے والے۔ (۵/۵۵)

۱۳۔ کافروں کو دوست نہ بنانے والے، خدا سے ڈرنے والے۔ (۵/۵۷)

۱۴۔ خدا کا فضل اور اس کی خوشنودی کے طالب، کثرت سجود سے جن کی پیشانیوں پر نشان پڑ جاتے ہیں۔ (۴۸/۲۹)

۱۵۔ حق وصداقت کی راہ میں مسلسل جدوجہد کرنے والے۔ (۵/۵۴)

۱۶۔ اللہ پر توکل رکھنے والے، خدا کے ذکر سے جن کے دل ڈر جاتے ہیں، اللہ کی آیات جب ان کے سامنے پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے۔ (۸/۲)

۱۷۔ وہ جنہوں نے اپنی جان اور مال خدا کے ہاتھ بیچ دیا ہے۔ (۹/۱۱۱)

۱۸۔ توبہ کرنے والے، عبادت گذار، حمد کرنے والے، روزہ رکھنے والے، رکوع اور سجود کرنے والے، نیک کام کرنے والے، بُرے کاموں سے روکنے والے، خدا کی حدود کی حفاظت کرنے والے۔ (۹/۱۱۲)

۱۹۔ جن رشتوں کو خدا نے جوڑے رکھنے کا حکم دیا ہے ان کو جوڑے رکھتے ہیں، آخرت کے حساب کتاب کا خوف رکھتے ہیں۔ (۱۳/۲۱)

۲۰۔ وعدہ پورا کرنے والے۔ (۱۳/۲۰)

۲۱۔ نیکی سے بُرائی کو دور کرنے والے۔ (۱۳/۲۲)

۲۲۔ جن کے دلوں کو خدا کی یاد سے آرام ملتا ہے۔ (۱۳/۲۸)

۲۳۔ زمین پر اکڑ کر نہ چلنے والے۔ (۱۷/۳۷)

Marfat.com

۲۴۔ جو امانتوں اور اقراروں کا لحاظ رکھتے ہیں۔ (۲۳/۸)

۲۵۔ نماز میں عجز سے کام لینے والے۔ (۲۳/۲)

۲۶۔ اسراف وتبذیر سے بچنے والے اور اعتدال سے خرچ کرنے والے۔ (۲۵/۶۷)

۲۷۔ اللہ کے سوا کسی کو نہیں پکارنے والے، جس جان کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے اسے قتل نہیں کرتے ماسوا جائز صورتوں کے، بدکاری نہیں کرتے۔ (۲۵/۶۸)

۲۸۔ ظلم کا بدلہ لینے والے۔ (۴۲/۳۹)(۲۶/۲۲۷)

۲۹۔ جاہلین سے کنارہ کش۔ (۷/۱۹۹)

۳۰۔ دوسروں کو اپنی ضرورت پر ترجیح دینے والے۔ (۳۳/۳۵)

۳۱۔ بڑے گناہوں اور بےحیائی کے کاموں سے پرہیز کرنے والے جب غصہ آ جائے تو معاف کرنے والے۔ (۴۲/۳۷)

۳۲۔ اپنے رب کے احکام قبول کرنے والے، اپنے کام باہم مشورے سے کرنے والے۔ (۴۲/۳۸)

۳۳۔ درگزر کرنے والے۔ (۴۲/۴۰)

۳۴۔ باہم بھائی بھائی، ایک دوسرے کا تمسخر نہ اڑانے والے، عیب گوئی نہ کرنے والے، نہ ایک دوسرے کا برا نام رکھنے والے۔ (۴۹/۱۱)

۳۵۔ احساس برتری سے محفوظ۔ (۵۳/۳۲)

۳۶۔ حرص نفس سے بچنے والے، دل میں کدورتیں یا بغض نہ رکھنے والے، اپنی ضروریات تج کر دوسروں کی مدد کرنے والے۔ (۵۹/۹)

۳۷۔ ذمے داریوں سے احسن طریقے سے عہدہ براہونے والے۔ (۷۶/۷)

۳۸۔ اپنی ضروریات تج کر یتیموں، اسیروں کی مدد کرنیوالے۔ (۷۶/۸)

۳۹۔ ستائش اور صلے کی خواہش سے بے نیاز۔ (۷۶/۹)

Marfat.com

۴۰۔ انصاف پر قائم رہنے والے، سچی گواہی دینے والے، عدل پر کار بند۔ (۴/۱۳۵)

۴۱۔ کفار کو دوست نہ بنانے والے۔ (۳/۲۸)

۴۲۔ نیکیوں میں سبقت لے جانے والے۔ (۲۳/۶۱)

۴۳۔ قانون میں کوئی نرمی نہ برتنے والے۔ (۲۴/۲)

۴۴۔ جس چیز کا علم نہیں رکھتے اس کے پیچھے نہیں پڑتے۔ (۱۷/۳۶)

۴۵۔ رفتار و گفتار میں میانہ رو۔ (۳۱/۱۹)

۴۶۔ نہ متکبر نہ خود پسند۔ (۳۱/۱۸)

۴۷۔ سیدھی باتیں کرنے والے اور خدا سے ڈرنے والے۔ (۳۳/۷۰)

۴۸۔ ایسی باتیں نہیں کہتے جو کیا نہیں کرتے۔ (۶۱/۳)

۴۹۔ جہاد کو اپنے عزیز و اقارب، مال و دولت اور جائیداد سے عزیز تر رکھنے والے۔ (۹/۲۴)

۵۰۔ خدا اور رسول کی آواز پر لبیک کہنے والے اور ان کے فیصلوں کے مطیع۔ (۲۴/۵۱)

ان خصوصیات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مومن کن خصوصیات کا حامل ہوتا ہے۔ ان خصوصیات کو ایک معیار کی حیثیت بھی دی جا سکتی ہے۔ بالفاظِ دیگر ایک اہل ایمان متذکرہ بالا خصوصیات سے متصف ہوتا ہے۔ اس بنیاد پر یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ آج کے مسلمان کیا ان خوبیوں کے حامل ہیں جو ایمان کا لازمی نتیجہ ہیں؟ یقیناً اس کا جواب نفی میں ہے۔ اس کی وجہ بنیادی طور پر یہ ہے کہ آج کا مسلمان صرف ایمان باللسان کا حامل ہے ایمان بالقلب کا نہیں۔ ایمان کے ساتھ عمل بھی لازمی ہے۔

هَلْ يَنْظُرُونَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِيَ رَبُّكَ اَوْ يَاْتِيَ بَعْضُ
اٰيٰتِ رَبِّكَ ؕ يَوْمَ يَاْتِيْ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا اِيْمَانُهَا لَمْ
تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ اَوْ كَسَبَتْ فِيْٓ اِيْمَانِهَا خَيْرًا ؕ قُلِ انْتَظِرُوْٓا اِنَّا

مُنتَظِرُونَ ط (۶/۱۵۹)

یہ اس کے سوا اور کس بات کے منتظر ہیں کہ ان کے پاس فرشتے آئیں یا خود تمہارا رب آئے یا تمہارے رب کی کچھ نشانیاں آئیں مگر جس روز تمہارے رب کی نشانیاں آ جائیں گی تو جو شخص پہلے ایمان نہیں لایا ہوگا اس وقت اسے ایمان لانا کچھ فائدہ نہیں دے گا، یا اپنے ایمان (کی حالت) میں نیک عمل نہیں کیے ہوں گے آپ فرما دیجیے کہ تم منتظر رہو ہم بھی منتظر ہیں۔

اس آیہ مبارکہ سے جو بنیادی حقیقت مترشح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ جب مکافاتِ عمل کا وقت شروع ہو جائے اس وقت ایمان لانا نہ لانا سب برابر ہے بلکہ روز قیامت ایسے لوگ جو صرف ایمان لائے ہوں گے لیکن عمل سے عاری ہوں گے وہ بھی خسارے میں رہیں گے۔

لہٰذا ایمان اور اعمال صالح کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

یہ صورتِ حال اس کے برعکس بھی بے کار ہے یعنی اعمال صالحہ کی ایمان کے بغیر کوئی حیثیت نہیں ہے۔

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا ○ الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا ○ أُولٰٓئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَآئِهٖ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ○ (۱۸/۱۰۳۔۱۰۵)

کہہ دیجیے اگر (تم کہو تو) میں تمہیں بتاؤں کہ باعتبار اعمال سب سے زیادہ خسارے میں کون ہیں؟ وہ ہیں جن کی دنیاوی زندگی کی تمام تر کوششیں بے کار ہو گئیں اور وہ اسی گمان میں رہے کہ وہ بہت اچھے کام کر رہے ہیں یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کی آیات اور اس کی ملاقات سے کفر کیا اس لیے ان کے اعمال غارت ہو گئے پس قیامت کے دن ان کے لیے ہم کوئی

Marfat.com

وزن قائم نہیں کریں گے۔

یہ آیت سیدھے سادے انداز میں اس حقیقت کی ترجمان ہے کہ اللہ پر ایمان رکھے بغیر لاکھ اچھے اعمال کیئے جائیں تو ان کی کسی قسم کی کوئی اہمیت نہیں ہے حتیٰ کہ روزِ قیامت ان کے اعمال کا وزن تک نہیں ہوگا۔

باالفاظِ دیگر بغیر ایمان کے اعمال کی سرے سے کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اس حقیقت کا اعادہ سورہ ابراہیم میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ ﹰاشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ ۭ لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰي شَيْءٍ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ط
(۱۴/۱۸)

جن لوگوں نے اپنے رب سے کفر کیا ان کے اعمال کی مثال راکھ کی سی ہے کہ آندھی کے دن اس پر زور کی ہوا چلے (اور) اسے اڑا لے جائے (اسی طرح) جو بھی انہوں نے کیا اس میں سے کسی چیز پر قادر نہ ہوں گے۔ یہی دور کی گمراہی ہے۔

اور حرف آخر یہ کہ ان کے لیے مکمل ہلاکت اور بربادی ہے۔ کفار چونکہ اللہ کے نازل کردہ احکامات اور تعلیم کو قبول نہیں کرتے لہٰذا اللہ تعالیٰ نے صرف ان کے اعمال صالحہ ہی نہیں بلکہ ہر قسم کے اعمال برباد کردیئے۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَتَعْسًا لَّهُمْ وَاَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَرِهُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ ۝ (۴۷/۸-۹)

اور جو کافر ہیں ان کے لیے ہلاکت ہے اور وہ ان کے اعمال کو برباد کرے گا یہ اس لیے کہ خدا نے جو چیز نازل فرمائی انہوں نے اس کو ناپسند کیا تو خدا نے ان کے اعمال اکارت کردیئے۔

Marfat.com

''حبطِ اعمال'' ایک مخصوص قرآنی اصطلاح ہے جس سے مراد ہے انسانی اعمال کا رائیگاں جانا یعنی ایسے اعمال جن سے اچھے نتائج کی توقع کی گئی ہو لیکن ان سے وہ نتائج مرتب نہ ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ صرف وہ انسانی افعال خوشگوار نتائج پیدا کر سکتے ہیں جو اللہ پر ایمان کے ساتھ انجام دیئے جائیں بصورتِ دیگر سب کچھ برباد ہو جاتا ہے اور ما حصل صرف تباہی اور بربادی ہوتا ہے۔ اس سے نہ صرف اعمال ضائع ہوتے ہیں بلکہ ان کوششوں کے ضائع جانے کا احساس مزید تکلیف دہ ہو جاتا ہے۔

نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم
نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے

لہٰذا اس بنیاد پر یہ حتمی نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ نیک اعمال کا کوئی تصور ایمان کے بغیر نہیں ہے۔

## ۲۔ اعمال صالح

ایمان کے ساتھ ساتھ جس شرط کا پورے قرآن مجید میں مسلسل اعادہ کیا گیا ہے وہ اعمال صالح ہیں۔

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (۲/۸۲)

اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور اعمال صالح کیے۔

صالح کا مادہ ص ل ح ہے اس کے معنی ایسے کام کے ہیں جس سے کسی دوسرے کی خرابی، نقص یا کمی دور ہو جائے، ایسے کام جن سے توزن پیدا ہو اعمال صالح کہلاتے ہیں۔ سورۃ اعراف میں جسمانی لحاظ سے صحیح اور تندرست بچے کے لیے صالحا کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔(۷/۱۶۰)

قرآن کریم میں حسنات کے مقابلے میں سیئات کا لفظ کثرت سے آیا ہے اور (۲/۸۱-۸۲) میں سیئۃ کے مقابل میں عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ آیا ہے لہٰذا اعمال صالحہ اور

حسنات ہم معنی ہیں۔ اس لیے دوسرے مقام پر من عمل صالحا کے مقابل میں من اساء آیا ہے(۴۶/۴۱) لہٰذا اعمال صالحہ کے معنی ہیں ایسے کام جن سے انسان کی مضمر صلاحیتیں بیدار ہوجائیں اور اس طرح اس میں زندگی کے ارتقائی مراحل طے کرنے کی صلاحیت پیدا ہوجائے نیز جن سے معاشرہ کا حسن وتوازن قائم رہے اور ناہمواریاں دور ہوجائیں یہ فساد کی ضد ہے قرآن مجید میں فساد اور صلاح کو ایک دوسرے کے مقابل استعمال کیا ہے۔ (۲/۱۱) اس کے علاوہ اسے لوگوں سے اچھے معاملات کرنے کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے (۲۷/۲۸)۔

ایمان اور اعمال صالح لازم وملزوم ہیں۔ ایسے افعال ہی جو اللہ پر پختہ یقین کے ساتھ انجام دیئے جائیں صرف وہی اعمال حتمی مثبت نتائج پیدا کرسکتے ہیں اگر دل سے اللہ پر یقین نہیں ہے تو اس طرح کے اعمال قطعی بے نتیجہ ثابت ہوتے ہیں۔ سورۃ الروم میں قرآن کریم نے من عمل صالحا کے مقابلے میں من کفر (۳۰/۴۴) لاکر اس حقیقت کو واضح کردیا ہے کہ اگر اعمال صالحہ ساتھ نہ ہوں تو ایمان، ایمان نہیں رہتا۔

یہاں یہ امر بھی ملحوظِ خاطر رہے کہ صرف وہی اعمال، اعمال صالحہ متصور ہوں گے جنہیں قرآن نے صالح قرار دیا ہے اس حوالے سے کوئی دیگر معیار قابل قبول نہیں ہوسکتا۔ قرآن مجید نے اگرچہ ان افعال کی کوئی فہرست نہیں دی لیکن قرآن مجید کے مطالعہ سے ان تمام افعال کو اس ضمن میں اعمال صالحہ شمار کیا جائے گا جن کے کرنے کا حکم دیا گیا ہے یا جن افعال پر اظہار پسندیدگی کیا گیا ہے مثلاً:

ا۔ انفاق: انفاق سے مراد زائد از ضرورت تمام مال ودولت کو اللہ کی راہ میں کھلا رکھنا ہے۔

وَ يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ ؕ (۲/۲۱۹)

یہ آپ سے پوچھتے ہیں اللہ کی راہ میں کیا دیں کہہ دیجیے جو ضرورت سے زائد ہو۔

Marfat.com

یہ فعل بارگاہ رب العزت میں اتنا پسندیدہ ہے کہ اسے خود اللہ تعالیٰ نے خود کو قرض دینے کے مترادف قرار دیا ہے۔

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَہٗ لَہٗ اَضْعَافًا کَثِیْرَۃً ؕ (۲/۲۴۵)

کوئی ہے کہ اللہ کو قرضہ حسنہ دے کہ وہ اس کے بدلے اس کو کئی حصے زیادہ دے گا۔

صرف اس آیت سے ہی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس فعل کی کتنی اہمیت ہے لہٰذا اعمال صالح میں اسے نمایاں اہمیت حاصل ہے۔ انفاق پر تفصیلی بحث اسی باب میں آگے کی گئی ہے۔

## ادائیگی زکوٰۃ:

زکوٰۃ کی ادائیگی بھی ایک ایسا فعل ہے جس کی قرآن مجید میں نمایاں تاکید کی گئی ہے اسی وجہ سے جہاں جہاں ادائیگی صلوٰۃ کا حکم آیا ہے اسی کے ساتھ زکوٰۃ کی ادائیگی کا حکم بھی ہے۔

وَ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ ؕ (۲/۱۱۰)

صلوٰۃ قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کیا کرو۔

زکوٰۃ سے مراد چونکہ وہ منجملہ محاصل ہیں جو ایک اسلامی حکومت اپنے اخراجات پورے کرنے کے لیے مسلمانوں پر عائد کرتی ہے اور ان کی عدم ادائیگی سے اسلامی حکومت بحران کا شکار ہوسکتی ہے لہٰذا متعدد مقامات پر اس کی ادائیگی کا حکم دیا گیا ہے۔

## iii۔ اقامت صلوٰۃ:

قرآن مجید میں اقامت صلوٰۃ کا حکم متعدد مقامات پر دیا گیا ہے۔ الصلوٰۃ سے مراد جہاں ایک طرف نماز کی ادائیگی ہے تو دوسری طرف اس کے معنی قوانین خداوندی کے اتباع

Marfat.com

کے بھی ہیں۔ صلوٰۃ کے لغوی معنی کسی کے پیچھے متواتر اور مسلسل چلنے کے ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے قوانین خداوندی کے اتباع کا مفہوم یہ ہوگا کہ ان فرائض و ذمے داریوں کی کما حقہ ادائیگی جو از روئے قرآن مسلمانوں یا اہل ایمان پر عائد ہوتی ہیں۔

## iv۔ اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت

اللہ تعالیٰ کے مختلف احکامات جو قرآن مجید میں مختلف مقامات پر دیئے گئے ہیں ان کی مکمل اطاعت بھی اعمال صالحہ میں شامل ہے۔ اللہ کی اطاعت اور مکمل تابعداری کا حکم واتقو اللہ (اللہ کا تقویٰ اختیار کرو) قرآن مجید میں کئی مقامات پر دیا گیا ہے۔ مثلاً:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ (۳/۱۰۲)

اے اہل ایمان! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جیسا کہ تقویٰ اختیار کرنے کا حق ہے۔

سیدھے سادے لفظوں میں اللہ کے احکامات کی کامل پاسداری تقویٰ ہے اور یہی اللہ کے نزدیک عزت کا معیار ہے۔

اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ (۴۹/۱۳)

اللہ کے نزدیک تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے بے شک اللہ جاننے والا اور باخبر ہے۔

## ۷۔ جہاد

جہاد چونکہ اہل ایمان پر فرض ہے اور قرآن مجید میں متعدد مقامات پر مسلمانوں کو جہاد کے لیے حکم دیا گیا ہے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰۤى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ؕ (۲/۲۱۶)

(مسلمانوں) تم پر (اللہ کی راہ میں) لڑنا فرض کر دیا گیا ہے وہ تمہیں ناگوار تو

Marfat.com

ہوگا مگر عجب نہیں کہ ایک چیز تم کو بُری لگے اور وہ تمہارے حق میں بہتر ہو اور عجب نہیں کہ ایک چیز تم کو بھلی لگے اور وہ تمہارے لیے مضر ہو اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

لہٰذا اس بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ جہاد کا شمار بھی اعمال صالحہ میں ہوتا ہے۔

### vi۔ احسان:

احسان سے مراد ہوتی ہے کسی کے بگڑے ہوئے توازن کو درست کر دینا یا کسی کی کمی کو دور کر دینا۔ قرآن مجید نے اس فعل کو صفات عالیہ میں شمار کیا ہے۔

### vii۔ شکر:

اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنا اعلیٰ صفات میں شامل ہے اور اہل ایمان کی خصوصیات میں شامل ہے۔ شکر پر تفصیلی بحث اسی باب میں آگے کی گئی ہے۔

### viii۔ ناپ تول:

قرآن مجید میں ناپ تول کو صحیح رکھنے کی بہت تاکید کی ہے اور اس میں کسی قسم کی کمی بیشی نہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ ج (۶/۱۵۳)

اور ناپ تول انصاف کے ساتھ پورا کرو۔

اس کے علاوہ دیگر متعدد مقامات پر بھی اس بابت حکم دیا گیا ہے۔

### ix۔ صبر:

صبر کے بنیادی معنی استقامت، ثابت قدمی، استقلال اور جہد مسلسل کے ہیں۔ بالفاظِ دیگر صابر سے مراد وہ اصحاب ہوں گے جو ہمت، استقلال، ثابت قدمی اور حوصلے سے مخالفت کا سامنا کریں۔ مایوس نہ ہوں، جی نہ ہاریں اور جلد بازی کا مظاہرہ نہ کریں۔ اللہ تعالیٰ نے مومن مرد اور عورتوں کی ایک خصوصیت صابر ہونا بتائی ہے (۳۳/۳۵):

## x۔ رزق حلال کا حصول:

قرآن مجید میں رزق حلال کے حصول پر بہت زور دیا گیا ہے رزق حلال کا حصول بھی اعمال صالحہ میں شامل میں ہے۔

## xi۔ دیانت:

قرآن مجید میں امانت میں خیانت نہ کرنے کا واضح حکم دیا گیا ہے۔

يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَخُونُوا۟ ٱللَّهَ وَٱلرَّسُولَ وَتَخُونُوٓا۟ أَمَـٰنَـٰتِكُمْ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ ط (۸/۲۷)

اے اہل ایمان! نہ تو اللہ اور رسول کی امانت میں خیانت کرو اور نہ اپنی امانتوں میں خیانت کرو اور تم (ان باتوں کو) جانتے ہو۔

متذکرہ بالا افعال کے علاوہ جن افعال کو اعمال صالح میں شمار کیا جا سکتا ہے ان میں عدل، صلۂ رحمی، اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت، وعدہ کا پورا کرنا، ادب، شفقت، اللہ کو کثرت سے یاد کرنا، آیات اللہ پر تدبر کرنا، سچی گواہی دینا، بیہودہ افعال سے احتراز، کافروں کو دوست بنانے سے مجتنب رہنا، حق کی راہ میں جدوجہد کرنا، اللہ کی متعین کردہ حدود کو نہ توڑنا، نماز میں عجز سے کام لینا، شرک اس کی شکل خواہ کچھ ہو اس سے بچنا، ناحق قتل نہ کرنا، بدکاری نہ کرنا، جاہلین سے کنارہ کشی کرنا، انصاف پر قائم رہنا، رفتار و گفتار میں میانہ روی، اخراجات میں اعتدال برتنا، حرص نفس سے محفوظ رہنا وغیرہ شامل ہیں۔

متذکرہ بالا بیان کردہ افعال، قرآن مجید میں بیان کردہ ان افعال و اعمال میں سے چند ہیں جنہیں اعمال صالح کہا جاتا ہے۔ قرآن مجید پر مزید تدبر کرنے سے اور بالخصوص مومنین کی جو خصوصیات قرآن مجید میں بیان کی گئی ہیں ان پر تدبر کر کے ان میں مزید اضافہ ممکن ہے۔

جب ایمان اور اعمال صالح باہم مجتمع ہوں تو ان کے کیا نتائج مرتب ہوتے ہیں یقیناً

اس کا نتیجہ دنیا اور آخرت دونوں کی کامیابی کی صورت میں ہی نکل سکتا ہے اس میں دنیاوی نتائج مغفرت اور باعزت رزق ہیں اور اخروی کامیابی جنت کا حصول ہے۔

## ۳۔ مغفرت:

مغفرت کا مادہ غ ف ر ہے جس کے بنیادی معنی حفاظت کے ہیں۔ یہ حفاظت تین طرح سے ممکن ہے۔ اوّل یہ کہ کوئی فرد یا قوم اگر کسی غلط روش پر چلتی ہے تو لامحالہ اس کے منفی اثرات اس پر پڑنا شروع ہو جاتے ہیں لیکن اس سے قبل کہ یہ اثرات اس حد تک بڑھ جائیں کہ فرد یا قوم کی ہلاکت یقینی ہو جائے اگر اس مرحلے پر وہ فرد یا قوم اس غلط روش سے رجوع کرے اور صحیح راہ یعنی راہ ہدایت اختیار کر لے تو اس کے نتیجے میں ایک طرف تو اس کی سابقہ غلط روش کے اثرات سے تحفظ مل جاتا ہے تو دوسری طرف صحیح راہ اختیار کرنے کے مثبت اثرات بھی پیدا ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ اس طرح مغفرت کے لیے توبہ یا رجوع لازمی ہے جس کے بعد ہی مغفرت ممکن ہے۔

دوم یہ کہ ایسا فرد یا قوم جو پہلے ہی راہ حق کی مسافر ہو وہ بدی کی ان قوتوں کی تخریب کاری سے محفوظ رہتی ہے جو اس کی تباہی کے درپے ہوتی ہیں۔

سوم راہ تقویٰ پر چلنے سے فرد یا قوم کا خود اپنے اندر خود دفائی قوتوں (Self Defence Forces) کو تقویت حاصل ہوتی ہے جس سے فرد یا قوم تخریبی قوتوں کے مضر اثرات سے محفوظ رہتی ہے۔ چنانچہ صاحب محیط نے لکھا ہے کہ الاستغفار کے معنی ہیں قول و عمل میں کسی فساد انگیز بات کی اصلاح کی خواہش کرنا، حفاظت چاہنا۔ اور مغفرۃ کے معنی ہیں بندہ کی لغزشوں کو نظر انداز کر کے اس سزا سے اس کو بچا لینا جس کا وہ مستحق ہو چکا ہو اور تاج العروس میں ہے کہ غفر الاسر یغفرتہ کے معنی ہیں اس نے معاملہ کو اس طرح درست کر دیا جس طرح اسے درست کرنا چاہیئے تھا۔

گویا یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایمان اور اعمال صالح کا پہلا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان دنیا میں

Marfat.com

خود اپنے غلط افعال کے نتائج سے محفوظ ہو جاتا ہے اگر پہلے ہی اس راہ کا مسافر ہو تو یہ حفاظت مزید بڑھ جاتی ہے۔

## ۴۔ باعزت رزق:

متذکرہ بالا افعال کا دوسرا اہم ترین نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان کو باعزت رزق ملنے لگتا ہے۔ جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے قرآن اہل ایمان کے رزق اور ایسے لوگ جو ایمان کی دولت سے محروم ہوں دونوں کے رزق میں فرق روا رکھتا ہے۔ غیر مسلموں کو ملنے والا رزق محض رزق ہوتا ہے لیکن جب رزق کی اصطلاح اہل ایمان کے حوالے سے قرآن مجید میں استعمال ہوتی ہے تو اسے رزق کریم سے ممیز کیا جاتا ہے۔

کریم کا مادہ ک رم ہے اس کے بنیادی معنی خلوص کے ہیں یعنی دوسروں کو بغیر کسی ذاتی غرض و منفعت کے فائدہ پہنچانا، ایسا فائدہ جو بلند اور باشرف ہو اور یہ فائدہ اس طرح پہنچایا جائے کہ جس کو فائدہ پہنچایا جارہا ہو اس کی اہانت یا ذلت نہ ہو۔ اس بنیاد پر الکریم ایک ایسی جامع صفت ہے جس میں ہر قسم کی بھلائیاں، فضیلتیں اور شرف شامل ہے۔ ہر پسندیدہ اور منتخب چیز کے لیے بھی اسے استعمال کیا جاتا ہے۔ کثیر بارش کو بھی کریم کہتے ہیں۔ نیز وہ عمدہ زمین جس سے عمدہ پیداوار حاصل ہو۔ اکرام (۱۵/۸۶) کے معنی ہیں عزت و تکریم عطا کرنا، مکرم (۱۸/۲۲) عزت دینے والے کو کہا جاتا ہے۔ اسی بنیاد پر رزق کریم سے مراد ہو گی باشرف اور عزت کا رزق۔

اس بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ رزق تو تمام لوگوں کو ملتا ہے اور ہر شخص اپنی محنت کے عوض اسے حاصل کرتا ہے تاہم اہل ایمان کے رزق کو خصوصی امتیاز حاصل ہے انہیں حاصل ہونے والا رزق باشرف اور باعزت ہوتا ہے کیونکہ اہل ایمان نہ صرف اللہ پر پختہ ایمان رکھتے ہیں بلکہ وہ اپنا رزق قوانین خداوندی کے کامل اتباع سے حاصل کرتے ہیں لہٰذا انہیں رزق کریم حاصل ہوتا ہے۔

Marfat.com

اور جیسا کہ وضاحت کی جاچکی ہے کہ از روئے قرآن رزق کی اصطلاح اشیاء خوردو نوش سے لے کر مال و دولت تک محیط ہے۔ اس تناظر میں فراوانی رزق کا مطلب ہر قسم کی فراوانی ہے جو عام ضروریات سے لے کر آسائشات تک پر محیط ہے۔ لہٰذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایمان اور اعمال صالحہ کا نتیجہ ہر قسم کی نعمتوں کے حصول پر منتج ہوتا ہے۔

## ۵۔ اخروی فلاح

ایمان اور اعمال صالح کا نتیجہ صرف دنیاوی فلاح ہی نہیں بلکہ اخروی فلاح بھی ہے۔ متذکرہ بالا آیت (۱۳/۲۹) پر تدبر کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ایمان اور اعمال صالح کا نتیجہ ''طوبیٰ'' اور ''حسن ماب'' بتایا گیا ہے۔ ان دونوں کا الگ الگ تجزیہ مندرجہ ذیل ہے۔

### طوبیٰ:

طوبیٰ کا مادہ ط ی ب ہے اس سے مراد وہ شے ہے جس سے انسان کے حواس و نفس دونوں کو لذت ملے۔ بالفاظ دیگر کوئی بھی ایسی شے جو حواس خمسہ کے لیے پسندیدہ اور باعثِ کیف اور خوشگواری کا باعث ہو۔ سورۃ ابراہیم میں شجرۃ طیبۃ کی تعریف اس طرح کی گئی ہے کہ اس کی جڑیں زمین میں گہری اور شاخیں فضائے محیط میں پھیلی ہوئی ہوتی ہیں اور وہ ہمیشہ ثمر بار رہتا ہے (۱۴/۲۴)۔ سورۃ سبا میں بلدۃ طیبۃ (۳۴/۱۵) اس شہر کو کہا گیا ہے جس کے اردگرد باغات ہوں اور جس میں سامان رزق کی فراوانی ہو۔ اسی بنیاد پر جب قرآن حکیم نے یہ کہا کہ ہم مومنین کو حیوۃ طیبۃ (۱۶/۹۷) عطا کرتے ہیں تو اس سے مراد ایسی زندگی ہے جس میں زندگی کی تمام خوشگواریاں موجود ہوں اور اچھی اور اعلیٰ اشیاء بافراط مہیا ہوں۔

اس بنیاد پر طوبیٰ سے مراد ہوگی ہر قسم کی نعمتیں، خوشگواریاں بالفاظِ دیگر جنت کی ساری نعمتوں کو ایک لفظ میں بیان کردیا گیا ہے۔

### حسن ماب:

Marfat.com

حسن کے معنی صحیح تناسب اور توازن کے قائم رہنے کے ہوتے ہیں یہ سوء کی ضد ہے جس کے معنی بگڑے ہوئے توازن کے ہوتے ہیں۔ قرآن مجید میں حسنات (بمقابلہ سیئات) زندگی کی خوشگواریوں کے لیے آیا ہے مثلاً (۳/۱۱۹)، (۷/۱۳۱)۔ حسنۃ سے مراد ہر وہ چیز ہے جس سے انسان کو آرام ملے اور راحت و آسائش کا سامان۔ جبکہ ماب کے معنوں میں سے ایک معنی مستقر یا ٹھکانہ یا پڑاؤ کے ہیں۔ بالفاظِ دیگر ان لوگوں کا جنت میں ایک عمدہ ٹھکانہ ہے۔

اس بحث کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر انسان اللہ پر پختہ ایمان رکھتا ہو اور اس کی ساتھ صالح اعمال بھی انجام دے تو دنیا اور آخرت میں نہ صرف بہترین رزق اسے حاصل ہوگا بلکہ زندگی کی تمام خوشگواریوں کے دروازے اس پر وا ہو جائیں گے بشرطیکہ انسان خود اس راہ پر چلنا چاہے۔

## تیسرا قانون:

### خدا سے ڈرنے والوں، توکل کرنے والوں، نمازیوں اور انفاق کرنے والوں کے لیے باعزت رزق

رزق کی کشادگی کا یہ تیسرا بنیادی قانون ہے جس کے تحت خدا سے ڈرنے والے، اللہ پر توکل کرنے والے، الصلوٰۃ کے پابند اور انفاق کرنے والوں کے لیے باعزت رزق کی ضمانت اللہ تعالیٰ نے لی ہے۔ سورۃ انفال میں یہ قانون ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَجِلَتْ قُلُوْبُھُمْ وَ اِذَا تُلِیَتْ عَلَیْھِمْ اٰیٰتُہٗ زَادَتْھُمْ اِیْمَانًا وَّ عَلٰی رَبِّھِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ ۝ الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ ۝ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا لَھُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّھِمْ وَ مَغْفِرَۃٌ وَّ رِزْقٌ کَرِیْمٌ (۸/۲-۴)

مومن تو وہ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور

Marfat.com

جب انہیں اس کی آیات پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو ان کا ایمان اور بڑھ جاتا ہے اور وہ اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ وہ جو نماز پڑھتے ہیں اور ہمارے دیئے ہوئے مال میں سے خرچ کرتے ہیں یہی سچے مومن ہیں اور ان کے لیے ان کے رب کے پاس بڑے درجات اور مغفرت اور عزت کی روزی ہے۔

قرآن مجید کی ان آیات پر تدبر سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ باعزت رزق:۔

i۔ خدا سے ڈرنے

ii۔ خدا پر توکل

iii۔ نماز اور

iv۔ انفاق پر منحصر ہوتا ہے۔

ان نقاط کی انفرادی وضاحت مندرجہ ذیل ہے۔

## i۔ خدا سے ڈرنے والے:

اللہ سے ڈرنے سے مراد اللہ کے قوانین کی کامل اطاعت ہے بالفاظِ دیگر قوانین خداوندی کی خلاف ورزی سے پہنچنے والے نقصان سے ڈرنا، اسی احساس سے مسلمان ان قوانین کی خلاف ورزی سے بچتا ہے کیونکہ ان قوانین میں کسی قسم کی کوئی لچک نہیں ہے۔ قرآن مجید نے اہل ایمان کی ایک صفت یہ بھی بتائی ہے کہ فلا خوف علیهم ولا هم يحزنون. (۴۶/۱۳) مومنین کو کسی قسم کا خوف وحزن نہیں ہوتا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ مومنین احکام خداوندی کی کامل اطاعت کرتے ہیں اور ان قوانین کی کامل اطاعت انسان کو خود بخود تمام مشکلات و پریشانیوں سے تحفظ فراہم کرتی ہے لہٰذا مومن صرف اور صرف اللہ سے ڈرتا ہے۔

## ii۔ توکل علی اللہ:

Marfat.com

توکل علی اللہ سے مراد ہے اللہ پر بھروسہ۔ یہاں اللہ پر بھروسہ سے مراد قوانین خداوندی کی نتیجہ خیزی پر اعتماد اور غیر متزلزل یقین ہے یعنی اس امر کا ٹھوس یقین کہ انسان اگر اس راہ پر چلے اور ان قوانین کی اطاعت کرے جن کا خدا نے اس سے مطالبہ کیا ہے تو نتیجہ وہی برآمد ہوگا جس کا اللہ نے وعدہ کیا ہے۔ مومنین وہ ہوتے ہیں جنہیں ان قوانین کی نتیجہ خیزی پر پختہ یقین ہوتا ہے ایسا کرنے والے متوکلین کہلاتے ہیں اسی حوالے سے خدا کی ایک صفت الوکیل بھی ہے یعنی جس پر یقین کامل کیا جا سکے۔ اس سے مومنین میں ایک نفسیاتی اعتماد پیدا ہوتا ہے جو ان کو ان کے مقصد کے حصول کے لیے توانائی فراہم کرتا ہے اسی وجہ سے اللہ پر توکل کا حکم دیا گیا ہے۔

وَ تَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِي لَا يَمُوتُ وَ سَبِّحْ بِحَمْدِهِ وَ كَفَىٰ بِهِ بِذُنُوبِ عِبَادِهِ خَبِيرًا (۲۵/۵۸)

اور اس (خدائے) زندہ پر بھروسہ رکھو جو (کبھی) نہیں مرے گا اس کی تعریف کے ساتھ تسبیح کرتے رہو وہ اپنے بندوں کے گناہوں سے خبر رکھنے کو کافی ہے۔

چونکہ خدا کے سوا کوئی اس قابل نہیں کہ اسے الہ تصور کیا جائے لہٰذا لازم ہے کہ توکل بھی صرف خدا پر ہی کرنا چاہیئے۔

اَللّٰهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ (۶۴/۱۳)

اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں تو مومنوں کو چاہیئے کہ اللہ پر توکل (بھروسہ) کریں۔

تمام کائنات اسی کے قبضہ و اختیار میں ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے لہٰذا تمام انسانوں کو چاہیئے کہ اسی کو اپنا کارساز بنائیں چونکہ یہ صرف اسی ذات کو ہی زیبا ہے اس کے سوا کسی کو نہیں۔

رَبُّ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيلًا (۷۳/۹)

Marfat.com

(وہی) مشرق و مغرب کا مالک ہے اس کے سوا کوئی الہ نہیں تو اسی کو اپنا وکیل بناؤ۔

جو اللہ پر توکل کرتے ہیں ان کے لیے اللہ ہی کافی ہے۔

وَ مَنْ یَّتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ فَھُوَ حَسْبُہٗ (۶۵/۳)

اور جو اللہ پر بھروسہ رکھے گا اس کے لیے اللہ کافی ہے۔

اللہ پر توکل اس پر ایمان کا لازمی نتیجہ ہے لہٰذا حصول رزق کے لیے بھی صرف اور صرف اللہ پر توکل کرنا چاہیئے کسی اور پر نہیں۔

## iii۔ الصلوٰۃ (نماز):

جہاں تک الصلوٰۃ (نماز) کا تعلق ہے یہ اسلام کے نظام عبادات کا سب سے پہلا رکن ہے جو پانچ وقت اہل ایمان پر فرض کی گئی ہے۔ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر نماز کی ادائیگی کا حکم ہے۔

وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ (۲/۱۱۰)

اور صلوٰۃ قائم کرو اور زکوٰۃ دیا کرو۔

متذکرہ بالا آیات (۴۔۲/۸) میں اخروی درجات میں اضافے، مغفرت اور باعزت رزق کے لیے جن شرائط کی تکمیل کو لازم رکھا گیا ہے ان میں صلوٰۃ بھی شامل ہے۔

## iv۔ انفاق:

انفاق سے مراد ہے اپنی دولت کو اللہ کی راہ میں کھلا رکھنا قرآن مجید نے اس کے مقابل امساک (روکے رکھنے) کا لفظ لا کر اس کے معنی کو واضح کر دیا ہے (۱۷/۱۰۰)۔ قرآن مجید میں واضح حکم دیا گیا ہے کہ اپنی محنت سے حاصل شدہ کمائی میں سے جو ضروریات سے فاضل ہو وہ اللہ کی راہ میں دے دو۔

وَ یَسْئَلُوْنَکَ مَا ذَا یُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ (۲/۲۱۹)

Marfat.com

یہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ اللہ کی راہ میں کتنا دے دیں کہہ دیجئے جو تمہاری ضرورت سے زائد ہو۔

یہ درحقیقت اللہ کا حق ہے جو اس نے اپنے بندوں سے طلب کیا ہے۔

وَهُوَ الَّذِيٓ اَنۡشَاَ جَنّٰتٍ مَّعۡرُوۡشٰتٍ وَّ غَيۡرَ مَعۡرُوۡشٰتٍ وَّالنَّخۡلَ وَالزَّرۡعَ مُخۡتَلِفًا اُكُلُهٗ وَالزَّيۡتُوۡنَ وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَّغَيۡرَ مُتَشَابِهٍ ؕ كُلُوۡا مِنۡ ثَمَرِهٖۤ اِذَاۤ اَثۡمَرَ وَاٰتُوۡا حَقَّهٗ يَوۡمَ حَصَادِهٖ ۖ وَلَا تُسۡرِفُوۡا ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الۡمُسۡرِفِيۡنَ ۙ (۶/۱۴۲)

اور خدا ہی تو ہے جس نے باغ پیدا کیے چھتریوں پر چڑھائے ہوئے بھی اور جو چھتریوں پر نہیں چڑھائے ہوئے وہ بھی اور کھجور اور کھیتی جن کے طرح طرح کے پھل ہوتے ہیں اور زیتون اور انار (جو بعض باتوں میں) ایک دوسرے سے مشابہ ہیں اور (بعض حوالوں سے) نہیں جب یہ چیزیں پھلیں تو ان کے پھل کھاؤ اور جس دن کاٹو تو خدا کا حق بھی اس میں سے ادا کرو اور اسراف نہ کرو اللہ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

اللہ کا یہ حق صرف زرعی پیداوار تک محدود نہیں بلکہ تمام ضرورتمندوں پر محیط ہے۔

وَاٰتِ ذَا الۡقُرۡبٰى حَقَّهٗ وَالۡمِسۡكِيۡنَ وَابۡنَ السَّبِيۡلِ وَلَا تُبَذِّرۡ تَبۡذِيۡرًا ۚ (۱۷/۲۶)

اور قرابت والے (رشتہ دار) اور مسکین اور مسافر کو اس کا حق دو اور کسی صورت اسراف نہ کرو۔

سورۃ الروم میں اس حق کی ادائیگی کو اللہ کی رضا کے حصول اور کامیابی سے مشروط کر دیا گیا ہے۔

فَاٰتِ ذَا الۡقُرۡبٰى حَقَّهٗ وَالۡمِسۡكِيۡنَ وَابۡنَ السَّبِيۡلِ ؕ ذٰلِكَ خَيۡرٌ

Marfat.com

لِّلَّذِیۡنَ یُرِیۡدُوۡنَ وَجۡہَ اللّٰہِ وَ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ (۳۸/۳۰)

پس چاہیے (کہ) قرابت داروں، مساکین اور مسافروں کو ان کا حق دو یہ بات بہت بہتر ہے ان لوگوں کے لیے جو اللہ کی رضا حاصل کرنا چاہتے ہیں وہی لوگ بامراد ہونے والے ہیں۔

سورۃ الذریت میں کامیاب لوگوں کی مختلف خصوصیات گنواتے ہوئے ارشاد ربانی ہے۔

وَ فِیۡۤ اَمۡوَالِہِمۡ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَ الۡمَحۡرُوۡمِ (۵۱/۱۹)

اوران لوگوں کے مالوں میں مانگنے والوں کا بھی حق تھا اور جو مانگ نہیں سکتے تھے ان کا بھی۔

اللہ تعالیٰ کے اس حق کی بنیاد اس حقیقت پر ہے کہ جو بھی مال و دولت انسان کی ضرورت سے زائد ہو اس پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کا حق تسلیم ہی نہیں کیا ہے وہ تو اللہ کا مال ہے جو اس کے ضرورتمند بندوں تک پہنچ جانا چاہیے۔

وَ لۡیَسۡتَعۡفِفِ الَّذِیۡنَ لَا یَجِدُوۡنَ نِکَاحًا حَتّٰی یُغۡنِیَہُمُ اللّٰہُ مِنۡ فَضۡلِہٖ ؕ وَ الَّذِیۡنَ یَبۡتَغُوۡنَ الۡکِتٰبَ مِمَّا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُکُمۡ فَکَاتِبُوۡہُمۡ اِنۡ عَلِمۡتُمۡ فِیۡہِمۡ خَیۡرًا ٭ۖ وَّ اٰتُوۡہُمۡ مِّنۡ مَّالِ اللّٰہِ الَّذِیۡۤ اٰتٰىکُمۡ ؕ (۲۴/۳۳)

اور وہ لوگ جن کو نکاح کی توفیق نہیں پاکیزگی اختیار کریں یہاں تک کہ اللہ ان کو اپنے فضل سے غنی کردے اور تمہارے غلاموں میں سے جو لوگ مکاتبت کا مطالبہ کریں اگر تم ان میں ان کی بھلائی دیکھو تو ان سے مکاتبت کرلو (اور اگر ان کے پاس پورا مال نہ ہو) تو اللہ کے مال میں سے کچھ مال (دے کر ان کی آزادی ممکن بنادو)۔

اس آیت کریمہ میں جو نقطہ قابل غور ہے وہ یہ ہے کہ پورے قرآن مجید کی یہ واحد

آیت ہے جس میں مال کی نسبت اللہ کی طرف ہے "مال اللہ" (اللہ کا مال) جبکہ دیگر منجملہ تمام مقامات پر جہاں کہیں بھی مال کا تذکرہ کیا گیا ہے اس کی نسبت کسی نہ کسی حوالے سے انسانوں سے ہی ہے جبکہ یہاں وہ مال جو گردنیں چھڑانے کی غرض سے ہو اس پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ملکیت سرے سے تسلیم ہی نہیں کی ہے۔ اس کے متعلق کہا گیا کہ یہ اللہ کا مال ہے۔ گویا ہر وہ مال جو کسی ضرورتمند کی ضرورت پوری کرنے کے لیے ہو یا کسی حاجت مند کی حاجت پوری کرنے کے لیے ہو وہ مال انسانوں کا ہے ہی نہیں اس پر ان لوگوں کا حق ہے جو ایسا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ اپنے زائد از ضرورت مال میں سے اللہ کا یہ حق اس کے ضرورتمند بندوں تک پہنچانا انفاق کہلاتا ہے۔

قرآن مجید نے اس عمل کو غیر معمولی اہمیت دی ہے اور اسے بعض مقامات پر ایمان کے بعد دوسرا درجہ دیا گیا ہے۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ
(۲/۱۷۷)

نیکی یہ نہیں کہ تم مغرب یا مشرق کی طرف منہ پھیرتے ہو کامل نیک شخص وہ ہے جو اللہ، روز آخرت، ملائکہ، کتب اور تمام نبیوں پر ایمان لایا اور اللہ کی رضا کے لیے رشتے داروں، یتیموں، مساکین، مسافروں، سوالیوں اور غلاموں (کی آزادی) کے لیے اپنا مال دیا، نماز کو قائم رکھا اور زکوٰۃ دی۔

اس آیت سے جہاں ایک نتیجہ یہ حاصل ہوتا ہے کہ انفاق، زکوٰۃ سے الگ ہے وہیں انفاق کی غیر معمولی اہمیت بھی سامنے آتی ہے اگر آپ بلحاظ ترتیب غور کریں تو یہ بات

Marfat.com

سامنے آتی ہے کہ اس آیت میں کامل نیک شخص کے لیے پہلی شرط ایمان رکھی گئی ہے یعنی اللہ، روز آخرت، ملائکہ، کتب اور نبیوں پر ایمان، اس کے فوراً بعد دوسری شرط انفاق ہے اور انفاق کے لیے بھی کوئی خاص شرط نہیں ہے اگر ان منجملہ تمام افراد کو سامنے رکھا جائے جو اس آیت میں بیان کیے گئے ہیں تو خود سوچیئے کہ کونسا ضرورتمند اس فہرست سے خارج ہے یعنی ہر قسم کے ضرورتمند کی ضرورت کو پورا کرنا انفاق میں شامل ہے اور اس کی اہمیت اس قدر ہے کہ نماز کا ذکر انفاق کے بعد کیا گیا ہے کہا جا سکتا ہے کہ صرف یہی آیت انفاق کی غیر معمولی اہمیت کی وضاحت کے لیے کافی ہے۔

انفاق کوئی آسان عمل نہیں ہے۔ انسان مال و دولت کی محبت کا اسیر ہوتا ہے وہ حریص بھی ہوتا ہے اور فوری نفع کا طالب بھی۔ وہ طویل المیعاد منافع کی بجائے فوری منافع کو ترجیح دیتا ہے۔ ایسی صورت میں اپنا مال و دولت دوسروں کو دے دینا بلکہ اپنی ضروریات قربان کر کے دوسروں کو دے دینا بہت حوصلے اور ہمت کا کام ہے۔ خود قرآن مجید نے اس کام کو چوٹی پر چڑھنے کے مترادف قرار دیا ہے۔

وَ هَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ۝ فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ۝ وَ مَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ۝ فَكُّ رَقَبَةٍ ۝ اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ ۝ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۝ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ۝ (۹۰/۱۰-۱۶)

پھر ہم نے اسے (ہدایت اور گمراہی) دونوں راستے کے بھی بتا دیئے (مگر) وہ پھر بھی چوٹی پر نہ چڑھا اور آپ کو کیا معلوم کہ وہ چوٹی کیا ہے؟ (چوٹی پر چڑھنا غلام کی) گردن چھڑانا ہے یا بھوکے کو کھانا کھلانا ہے یتیم کو جو قریبی ہو یا مسکین کو جو زمین پر گرا ہوا ہو (اسے سہارا دینا ہے)۔

اس ''چوٹی پر چڑھنے'' کے عمل کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایئے کہ وہ لوگ جو اللہ کی راہ میں انفاق کرتے ہیں ان کے متعلق خود اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ وہ یہ رقم کسی

Marfat.com

دوسرے کو نہیں دے رہے ہوتے بلکہ مجھے قرض دے رہے ہوتے ہیں۔ انسان کی بے مائیگی کا تصور کیجئے اور حق تعالیٰ کی شان وقدرت کا اندازہ کیجئے کسی قسم کی کوئی نسبت ہی نہیں۔ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ کو اپنی اس مخلوق کا یہ فعل اتنا پسند ہے کہ وہ اسے خود کو قرض دینے کا مترادف کہتا ہے۔

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَہٗ لَہٗٓ اَضْعَافًا کَثِیْرَۃً ط
(۲/۲۴۵)

کوئی ہے کہ اللہ کو قرض حسنہ دے کہ وہ اس کے بدلے اس کو کئی حصے زیادہ دے گا۔

سورۃ الحدید میں اس کا اعادہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَہٗ لَہٗ وَ لَہٗٓ اَجْرٌ کَرِیْمٌ
(۵۷/۱۱)

کوئی ہے جو اللہ کو قرض حسنہ دے کہ وہ اس کو اس سے دوگنا ادا کرے یہ اس کے لیے عزت کا صلہ ہے۔

دوسری جگہ ارشادِ ربانی ہے کہ:

اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا یُّضٰعِفْہُ لَکُمْ وَ یَغْفِرْ لَکُمْ ط وَاللّٰہُ شَکُوْرٌ حَلِیْمٌ
(۶۴/۱۷)

اگر تم اللہ کو نیک (نیتی) سے قرض دو گے تو وہ تم کو اس کا دوگنا دے گا اور تمہارے لیے نقصان سے بچنے کا سامان کر دے گا وہ شکور اور حلیم ہے۔

اس عمل کا نتیجہ انسان اللہ کے پاس کہیں بہتر اور بزرگ تر پائے گا۔

وَاَقْرِضُوا اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا ط وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِکُمْ مِّنْ خَیْرٍ تَجِدُوْہُ عِنْدَ اللّٰہِ ہُوَ خَیْرًا وَّ اَعْظَمَ اَجْرًا ط وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰہَ ط اِنَّ اللّٰہَ

غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (۷۳/۲۰)

اور اللہ کو نیک (نیتی) سے قرض دیتے رہو اور جو نیک عمل تم اپنے لیے آگے بھیجو گے اس کو خدا کے ہاں بہتر اور صلے میں بزرگ تر پاؤ گے اور اللہ سے بخشش مانگتے رہو وہ بے شک بخشنے والا اور مہربان ہے۔

اس عمل کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ کم از کم ۱۶، مقامات پر اسے مومنین کی مختلف نشانیوں میں سے ایک بتایا گیا ہے۔

الٓمّٓ ۚ ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ ۛ فِیْهِ ۛ هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ ۙ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ (۲/۲-۳)

الٓمٓ ٥ اس کتاب (قرآن مجید) میں کوئی شک نہیں اور یہ متقیوں کے لیے ہدایت ہے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور جو رزق ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ (۲/۱۷۷)، (۳/۱۶-۱۷)، (۳/۱۳۴)، (۸/۳)، (۱۳/۲۲)، (۲۲/۳۵)، (۲۳/۵۷-۶۰)، (۲۸/۵۲-۵۴)، (۳۲/۱۶)، (۴۲/۳۸)، (۵۷/۷) اور (۷۰/۲۲-۲۵) میں انفاق کو مومنین کی دیگر صفات کے ساتھ ایک صفت گنوایا گیا ہے۔

یہاں تک ہے کہ مومنین خود بھوکے رہ کر دوسرے کو کھلاتے ہیں۔

وَ یُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّهٖ مِسْکِیْنًا وَّ یَتِیْمًا وَّ اَسِیْرًا (۷۶/۸)

اس کے باوجود کہ ان کو خود طعام کی خواہش ہے وہ فقیروں، یتیموں اور اسیروں کو کھانا کھلاتے ہیں۔

کیونکہ یہی کامیابی کی راہ ہے اور انسانوں کے حق میں بہترین لائحہ عمل بھی۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَ اسْمَعُوْا وَ اَطِیْعُوْا وَ اَنْفِقُوْا خَیْرًا لِّاَنْفُسِکُمْ ؕ وَ مَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۶۴/۱۶)

Marfat.com

پس جتنا ہو سکے اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اس کی بات سنو اور اس کی اطاعت کرو اور اس کی راہ میں خرچ کرتے رہو یہ تمہارے حق میں بہتر ہوگا اور جو لوگ دل کے بخل سے بچائے جاتے ہیں وہی کامیاب ہوتے ہیں۔

## شرائط انفاق:

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے انفاق کی کچھ شرائط بیان کی ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

### الف) انفاق اللہ کی رضا کی خاطر ہونا چاہیئے

انفاق کا بنیادی مقصد اللہ کی رضا کا حصول ہوتا ہے یہ کسی مالی اور مادی منفعت حاصل کرنے کے لیے نہیں ہوتا۔

الَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَكّٰیۚ ۝ وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰۤی ۝ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰی ۝ وَلَسَوْفَ یَرْضٰی ۝ (۹۲/۱۸-۲۱)

(ایسا متقی) جو اپنا مال تزکیہ حاصل کرنے کے لیے دیتا ہے اور کسی کا اس پر کوئی احسان نہیں ہوتا جس کا بدلہ اتارنے کا اس کو خیال ہو ہاں مگر اپنے رب اعلیٰ کی رضا حاصل کرنا (اس کا مقصود ہوتا ہے) اور وہ (خدا) ضرور اس سے راضی ہو جائے گا۔

### ب) انفاق پاکیزہ اور عمدہ مال میں سے ہونا چاہیئے:

انفاق کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ پاکیزہ اور عمدہ مال میں سے ہو۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّاۤ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۪ وَلَا تَیَمَّمُوا الْخَبِیْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِیْهِ اِلَّاۤ اَنْ تُغْمِضُوْا فِیْهِ ؕ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ حَمِیْدٌ (۲/۲۶۷)

اے اہل ایمان جو تم نے کمایا ہے اس میں سے پاکیزہ مال کا انفاق کرو اور جو چیزیں ہم تمہارے لیے زمین سے نکالتے ہیں ان میں سے (اللہ کی راہ

Marfat.com

میں) خرچ کرو اور بری اور ناپاک چیزیں دینے کا قصد نہ کرو کہ (اگر وہ چیزیں تمہیں دی جائیں تو) بجز اس کے کہ (لیتے وقت) آنکھیں بند کرلو اور ان کو کبھی نہ لو اور جان لو کہ اللہ غنی اور حمید ہے۔

## ج) انفاق دکھاوے کے لیے نہیں ہونا چاہیئے:

انفاق کے لیے تیسری بڑی شرط یہ ہے کہ انفاق کا مقصد دکھاوا نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ کوئی بھی نیکی جو محض نمود ونمائش کے لیے کی جائے وہ محض ضائع چلے جانے والے اعمال میں شمار ہوتی ہے۔ لہٰذا انفاق کا مقصد رضائے الٰہی کا حصول ہونا چاہیئے نہ کہ نمود ونمائش۔

يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تُبْطِلُوا۟ صَدَقَـٰتِكُم بِٱلْمَنِّ وَٱلْأَذَىٰ كَٱلَّذِى يُنفِقُ مَالَهُۥ رِئَآءَ ٱلنَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِٱللَّهِ وَٱلْيَوْمِ ٱلْـَٔاخِرِ ۖ فَمَثَلُهُۥ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَأَصَابَهُۥ وَابِلٌ فَتَرَكَهُۥ صَلْدًا ۖ لَّا يَقْدِرُونَ عَلَىٰ شَىْءٍ مِّمَّا كَسَبُوا۟ ۗ وَٱللَّهُ لَا يَهْدِى ٱلْقَوْمَ ٱلْكَـٰفِرِينَ (۲/۲۶۴)

اے اہل ایمان! اپنے صدقات احسان رکھنے اور ایذا دینے سے اس شخص کی طرح برباد نہ کردینا جو لوگوں کو دکھاوے کے لیے مال خرچ کرتا ہے اور اللہ اور روز آخرت پر ایمان نہیں رکھتا تو اس کے (مال) کی مثال اس چٹان جیسی ہے جس پر تھوڑی سی مٹی پڑی ہو اور زور کا مینہ برس کر اسے صاف کر ڈالے (اسی طرح) یہ (ریاکار) لوگ اپنے اعمال کا کچھ بھی صلہ حاصل نہیں کرسکیں گے اور اللہ ایسے ناشکروں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔

## د) پوشیدہ انفاق ظاہری انفاق سے بہتر ہے:

اگر انفاق پوشیدہ ہو تو زیادہ بہتر ہوتا ہے کیونکہ اس صورت میں جس پر احسان کیا جا رہا ہے اس کی عزت نفس مجروح نہیں ہوتی اور اس میں نمود ونمائش کا پہلو بھی نہیں ہوتا۔

اِنۡ تُبۡدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِیَ ۚ وَ اِنۡ تُخۡفُوۡهَا وَ تُؤۡتُوۡهَا الۡفُقَرَآءَ فَهُوَ خَیۡرٌ لَّكُمۡ ؕ وَ یُكَفِّرُ عَنۡكُمۡ مِّنۡ سَیِّاٰتِكُمۡ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِیۡرٌ

(۲/۲۷۱)

اگر تم صدقات ظاہر دو تو وہ بھی خوب ہے اور اگر پوشیدہ دو اور اہل حاجت کو دو تو وہ خوب تر ہے اس طرح کا دینا تمہاری بدیوں کو بھی دور کردے گا اور اللہ کو تمہارے تمام کاموں کی خبر ہے۔

## ر) موت سے پہلے ہونا چاہیئے:

انفاق کے لیے مہلت صرف اس زندگی کی حد تک محدود ہے لہٰذا اس مہلت سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھالینا چاہیئے ایسا نہ ہو کہ عین وقتِ قضا دھیان آئے ظاہر ہے اس وقت کچھ نہیں ہو سکے گا کیونکہ مہلت عمل کا وقت ختم ہو چکا ہوگا۔

وَ اَنۡفِقُوۡا مِنۡ مَّا رَزَقۡنٰكُمۡ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ یَّاۡتِیَ اَحَدَكُمُ الۡمَوۡتُ فَیَقُوۡلَ رَبِّ لَوۡ لَاۤ اَخَّرۡتَنِیۡۤ اِلٰۤی اَجَلٍ قَرِیۡبٍ ۙ فَاَصَّدَّقَ وَ اَكُنۡ مِّنَ الصّٰلِحِیۡنَ

(۶۳/۱۰)

اور جو (مال) ہم نے تم کو دیا ہے اس میں سے اس (وقت) سے پیشتر خرچ کرلو کہ تم میں سے کسی کی موت آجائے (اس وقت) کہنے لگے کہ اے میرے رب تو نے مجھے اور تھوڑی سی مہلت کیوں نہ دی تاکہ میں صدقہ کرلیتا اور نیک لوگوں میں شامل ہو جاتا۔

## س) آزمائش کے وقت کرنا بہتر ہے:

کسی بھی ہنگامی صورتِ حال یا اچانک پیش آجانے والی مصیبت کے وقت خرچ کرنا اس سے کہیں بہتر ہے کہ حالات نارمل ہو جانے کے بعد خرچ کیا جائے۔ کیونکہ ظاہر ہے اوّل الذکر صورت میں ضرورت زیادہ شدید ہوتی ہے لہٰذا اصل نیکی یہ ہے کہ عین ضرورت

کے وقت کام آیا جائے نہ کہ ضرورت پوری ہونے کے بعد۔ اگرچہ ضرورت کے بعد انفاق کی اہمیت اپنی جگہ ہے لیکن اوّل الذکر صورت میں یہ زیادہ پسندیدہ ہے۔

وَ مَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ لِلّٰهِ مِیْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ لَا یَسْتَوِیْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَ قٰتَلَ ؕ اُولٰٓىٕكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِیْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَ قٰتَلُوْا ؕ وَ كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ ۠ (۵۷/۱۰)

اور تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے حالانکہ آسمان اور زمین کی میراث اللہ کی ہے اے مومنو! فتح سے پہلے جس نے اللہ کی راہ میں خرچ کیا اور جنگ کی وہ اس کے برابر نہیں ہو سکتا جس نے فتح کے بعد خرچ کیا اور فتح کے بعد جنگ کی۔ فتح سے پہلے خرچ کرنے والے اور جنگ کرنے والے درجہ میں بہت زیادہ ہیں اور اللہ نے دونوں قسم کے لوگوں سے نیکی کا وعدہ کیا ہے اور اللہ تمہارے اعمال سے خوب اچھی طرح واقف ہے۔

## مستحقین انفاق:

انفاق بدرجہ استحقاق ہونا چاہیئے یعنی پہلے والدین اور قریبی عزیز و اقارب کا حق بنتا ہے پھر یتیموں اور مسافروں اور پھر جو بھی ضرورتمند ہو اس کی مدد حسب استطاعت کرنی چاہیئے۔ ان کے ساتھ ایسے لوگوں کا بھی دھیان رکھنا چاہیئے کہ جو اپنی سفید پوشی کے بھرم کی وجہ سے مانگ نہیں سکتے لیکن شدید ضرورتمند ہوتے ہیں ایسے لوگ سوال نہیں کرتے لیکن ان کو ان کی ہیئت سے صاف جانا جا سکتا ہے۔

یَسْــٴَـلُوْنَكَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ ؕ قُلْ مَاۤ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَیْرٍ فَلِلْوَالِدَیْنِ وَ الْاَقْرَبِیْنَ وَ الْیَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِیْنِ وَ ابْنِ السَّبِیْلِ ؕ وَ مَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَیْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ (۲/۲۱۵)

(یہ) لوگ آپؐ سے پوچھتے ہیں کہ (اللہ کی راہ) میں کیا خرچ کریں تو کہہ دیجیے (کہ) جو اچھا مال بھی تم دو اس پر (تمہارے) والدین، قریبی رشتے داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کا حق ہے اور جو نیک کام بھی تم کرو اللہ اسے یقیناً اچھی طرح جانتا ہے۔

سورۃ البقرہ میں ہی ایک دوسرے مقام پر اس کی صراحت ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ لَا يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ
(۲/۲۷۳)

(یہ خرچ) ان محتاجوں کے لیے ہیں جو اللہ کی راہ میں (دوسرے کاموں سے) روکے گئے ہیں وہ زمین میں (آزادی) سے آ جا نہیں سکتے بے خبر (شخص ان کے) سوال سے بچنے کے سبب انہیں غنی خیال کرتا ہے تم انہیں ان کی ہیئت سے پہچان سکتے ہو۔ وہ لوگوں سے لپٹ لپٹ کر سوال نہیں کرتے اور تم جو اچھا مال (اللہ کی راہ میں) خرچ کرو اللہ اس سے یقیناً واقف ہے۔

## انفاق کے نتائج:

ایسا انفاق جو متذکرہ بالا شرائط کے تابع ہو اس کے نتائج از روئے قرآن مندرجہ ذیل ہیں۔

### الف) اصل رقم کی واپسی کی ضمانت:

انسان بظاہر اس بات سے ڈرتا ہے کہ انفاق کی صورت میں اس کی رقم اس کے پاس نہیں رہتی لیکن اللہ تعالیٰ کی جانب سے یہ ضمانت دی گئی ہے کہ جو مال بھی اللہ کی راہ میں دیا

Marfat.com

جائے گا کم از کم اس کی اصل مقدار لازمی طور پر انفاق کرنے والے کو واپس مل جائے گی۔
تاہم یہ وہ کم سے کم صلہ ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے انفاق کے عوض وعدہ کیا ہے۔

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَ مَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ؕ وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ (۲/۲۷۲)

انہیں راہ پر لانا آپ کا ذمہ نہیں ہاں جو چاہے سیدھی راہ اختیار کر لے اور جو اچھا مال بھی تم اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور حقیقت یہ ہے کہ تم ایسا خرچ صرف اللہ کی توجہ حاصل کرنے کو کرتے ہو سو اس کا نفع بھی تمہارے اپنے نفوس کو ہوگا اور جو اچھا مال بھی تم خرچ کرو وہ تمہیں پورا (پورا واپس) کر دیا جائے گا اور تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

## ب) دوگنا تا سات سوگنا سے بھی زائد شرح سے واپسی کی ضمانت

جو مال و دولت انسان اللہ کی راہ میں خرچ کرتا ہے اس کا صلہ اللہ تعالیٰ نے مختلف مقامات پر مختلف انداز میں بیان کیا گیا ہے اور یہ شرح دوگنی، کئی گنی تا سات سوگنی بلکہ اس سے بھی زائد ہے۔

مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ وَ لَهٗۤ اَجْرٌ كَرِيْمٌ
(۵۷/۱۱)

کوئی ہے جو اللہ کو قرض حسنہ دے تا کہ وہ اس کو اس سے دوگنا ادا کرے یہ اس کے لیے عزت کا صلہ ہے۔

اسی طرح (۵۷/۱۸)، (۲/۲۶۵) اور (۶۴/۱۷) میں بھی دوگنا صلہ دینے کا وعدہ کیا گیا ہے۔ سورۃ البقرہ میں کئی گنا زیادہ دینے کا وعدہ کیا گیا ہے۔

Marfat.com

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَہٗ لَہٗۤ اَضْعَافًا کَثِیْرَۃً ؕ
(۲/۲۴۵)

کوئی ہے کہ اللہ کو قرضِ حسنہ دے کہ وہ اس کے بدلے میں اس کو کئی حصے زیادہ دے۔

سورۃ البقرہ میں ہی حق تعالیٰ نے انفاق کے عمل کو ایک ایسے پودے سے تشبیہ دی ہے جس کی سات (۷) بالیاں ہیں اور ہر بالی میں سو (۱۰۰) دانے ہیں۔

مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ کَمَثَلِ حَبَّۃٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِیْ کُلِّ سُنْۢبُلَۃٍ مِّائَۃُ حَبَّۃٍ ؕ وَاللّٰہُ یُضٰعِفُ لِمَنْ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ؕ (۲/۲۶۱)

اور جو لوگ اپنے اموال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ان (کے اس فعل) کی حالت اس دانہ کی حالت کے مشابہ ہے جو سات بالیاں اگائے (اور) ہر بالی میں سو دانے ہوں اور اللہ جس کے لیے چاہتا ہے (اپنے قانون کے مطابق اس سے بھی) بڑھا (کر) دیتا ہے اور اللہ وسعت دینے والا اور جاننے والا ہے۔

ان آیات کریمہ سے واضح ہے کہ انسان جو بھی مال و دولت اللہ کی راہ میں خرچ کرتا ہے وہ کبھی ضائع نہیں جاتا اور اس کا صلہ خود اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمے لیا ہے جو کم از کم اصل رقم کی واپسی سے لے کر سات سو گنا یا اس سے بھی زیادہ ہے یہاں یہ امر ذہن میں رکھیے کہ اس بھاری شرح واپسی کی ضمانت دینے والا کون ہے؟ کوئی بینک یا حکومت کا ادارہ یا خود حکومت نہیں بلکہ خود قادر مطلق کی ذات ہے جو اختیار کل کی حامل ہے جس کے قبضہ و اختیار میں یہ کل کائنات ہے وہ ضمانت دے رہا ہے غور کرنے کا مقام یہ ہے کہ کہاں یہ ''سرمایہ کاری'' کی جارہی ہے اس کا ضامن کون ہے؟ اور کس ''شرح منافع'' سے ادائیگی کی جائے

گی؟ کیا آپ یہ ''سرمایہ کاری'' کرنا چاہیں گے؟

یہ تو انفاق کے وہ نتائج ہیں جنہیں ''مال کے بدلے مال'' کے عنوان کے تحت درجہ بند کیا جاسکتا ہے۔ تاہم یہ نتائج صرف یہیں تک محدود نہیں یہ تو اللہ تعالیٰ کا ایک ایسا پسندیدہ عمل ہے جس کے مزید کئی مثبت اور تعمیری نتائج مرتب ہوتے ہیں جن کی قرآن مجید میں مختلف مقامات پر وضاحت کی گئی ہے ان میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں۔

## الف) کبھی نہ ختم ہونے والی تجارت

قرآن مجید انفاق کو ایک ایسی تجارت کے مثل قرار دیتا ہے جو کبھی تباہ نہیں ہوگی۔

إِنَّ الَّذِينَ يَتْلُونَ كِتَابَ اللَّهِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَنْفَقُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً يَرْجُونَ تِجَارَةً لَنْ تَبُورَ ؕ (۳۵/۲۹)

جو لوگ اللہ کی کتاب کی اطاعت کرتے ہیں اور نماز ادا کرتے ہیں اور ہمارے دیئے ہوئے رزق میں سے خفیہ اور علانیہ خرچ کرتے ہیں وہی درحقیقت ایک ایسی تجارت کی جستجو میں لگے ہوئے ہیں جو کبھی تباہ نہیں ہوگی۔

## ب) اللہ کی قربت اور رحمت کا ذریعہ ہے

سورۃ التوبہ میں اللہ اور یوم آخرت پر ایمان اور انفاق کو اللہ کی قربت اور رحمت کے حصول کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔

وَمِنَ الْأَعْرَابِ مَنْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَيَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ قُرُبَاتٍ عِنْدَ اللَّهِ وَصَلَوَاتِ الرَّسُولِ ۚ أَلَا إِنَّهَا قُرْبَةٌ لَهُمْ ۚ سَيُدْخِلُهُمُ اللَّهُ فِي رَحْمَتِهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ؕ (۹/۹۹)

اور عرب ایسے ہیں جو اللہ پر اور روز آخرت پر ایمان لاتے ہیں اور جو کچھ خرچ کرتے ہیں اسے خدا کی قربت اور رسول کی طرف سے تحسین و آفرین کا

Marfat.com

ذریعہ سمجھتے ہیں ان کا یہ فعل ان کے لیے ضرور (اللہ) کی قربت کا ذریعہ ہوگا اللہ ضرور ان کو اپنی رحمت میں داخل کرے گا بے شک وہ غفور اور رحیم ہے۔

## ج) اعلیٰ، معزز اور بزرگ تر بدلہ

انفاق ایک ایسا مبارک اور بہتر عمل ہے جس کے بدلے خود اللہ تعالیٰ ایک اعلیٰ، معزز اور بزرگ تر بدلے کا وعدہ کرتا ہے اور ظاہر ہے وہ کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتا، یہ تصور بھی ناممکن ہے۔

وَلَا یُنْفِقُوْنَ نَفَقَةً صَغِیْرَةً وَّلَا کَبِیْرَةً وَّلَا یَقْطَعُوْنَ وَادِیًا اِلَّا کُتِبَ لَهُمْ لِیَجْزِیَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ط (۹/۱۲۱)

اور اللہ کی راہ میں چھوٹا سا خرچ بھی نہیں کرتے نہ بڑا یا کوئی میدان طے کرتے ہیں مگر (ان کے اعمال صالحہ) میں لکھ لیا جاتا ہے تا کہ اللہ ان کے اعمال کا اعلیٰ بدلہ دے۔

اسی طرح سورۃ الحدید میں اللہ کو دیئے جانے والے قرض کے بدلے میں معزز بدلے کا وعدہ کیا گیا ہے۔

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗ وَلَهٗۤ اَجْرٌ کَرِیْمٌ ط (۵۷/۱۱)

کوئی ہے جو اللہ کو قرض حسنہ دے تا کہ وہ اس کو اس سے دوگنا ادا کرے یہ اس کے لیے ایک معزز بدلہ ہے۔

اسی طرح سورۃ المزمل میں نماز، زکوٰۃ اور انفاق کے بدلے میں بہتر نتائج اور زیادہ اجر کا وعدہ کیا گیا ہے۔

وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّکٰوةَ وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ط وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِکُمْ مِّنْ خَیْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَیْرًا وَّاَعْظَمَ اَجْرًا ط وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ط (۷۳/۲۰)

اور نماز قائم کیا کرو اور زکوٰۃ دیا کرو اور اللہ کو قرض دیتے رہو اور جو نیک عمل تم اپنے لیے آگے بھیجو گے اس کو اللہ کے پاس بہتر اور صلے میں بزرگ تر پاؤ گے اور خدا سے استغفار کرتے رہو۔

یہ ایک ایسا فعل ہے جس کا مثبت نتیجہ لازمی طور پر سامنے آتا ہے اور اس بہترین نتیجے کی ذمے داری خود قادر مطلق نے لی ہے جو یقیناً نتائج پیدا کرنے والوں میں سب سے بہترین نتیجہ پیدا کرنے والا ہے۔

قُلْ اِنَّ رَبِّیْ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَ یَقْدِرُ لَهٗ وَ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَهُوَ یُخْلِفُهٗ وَ هُوَ خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ (۳۴/۳۹)

اور آپ کہہ دیجیے کہ میرے بندوں میں سے جو چاہے (اللہ کے قانون کے مطابق) اپنے رزق کو وسیع کرلے اور جو چاہے تنگ کرلے اور جو کچھ بھی تم خرچ کرو گے اللہ اس کا نتیجہ ضرور نکالے گا اور وہ کامل ترین رزق دینے والا ہے۔

## و) خوف اور حزن سے تحفظ

انفاق ایک ایسا بابرکت عمل ہے جو انسان کو خوف اور مایوسی سے محروم رکھتا ہے بشرطیکہ احسان جتلا کر اسے ضائع نہ کر دیا جائے۔

اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا یُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّ لَآ اَذًى لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ط (۲/۲۶۲)

جو لوگ اپنے اموال کو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں پھر خرچ کرنے کے بعد نہ کسی رنگ میں احسان جتاتے ہیں اور نہ کسی قسم کی تکلیف دیتے ہیں ان کے رب کے پاس ان (کے اعمال) کا بدلہ (محفوظ) ہے اور نہ تو انہیں کسی قسم کا خوف ہوگا نہ وہ غمگین ہوں گے۔

Marfat.com

یہی مضمون (۲/۲۷۴) میں بھی دہرایا گیا ہے۔

## ر) اپنے آپ کو ظلم اور ہلاکت سے بچانے کے لیے

قرآن مجید کی رو سے انفاق ایک ایسی تقدیر ہے جس کو اپنانے والے اپنے آپ کو ہلاکت سے محفوظ رکھتے ہیں یہی راہ ظلم سے بچنے کی راہ بھی ہے۔

وَاَنۡفِقُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَلَا تُلۡقُوۡا بِاَيۡدِيۡكُمۡ اِلَى التَّهۡلُكَةِ وَاَحۡسِنُوۡا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُحۡسِنِيۡنَ (۲/۱۹۵)

اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے آپ کو ہلاکت میں مت ڈالو اور احسان سے کام لو (اور) اللہ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

اس راہ سے انکار کرنے والے ظالم ہیں اور ظلم خواہ کوئی ہو اس کی ہر شکل ناپسندیدہ ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡفِقُوۡا مِمَّا رَزَقۡنٰكُمۡ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ يَّاۡتِىَ يَوۡمٌ لَّا بَيۡعٌ فِيۡهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ؕ وَالۡكٰفِرُوۡنَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ (۲/۲۵۴)

اے اہل ایمان! جو کچھ ہم نے دیا ہے اس میں سے اس دن کے آنے سے پہلے کہ جس میں نہ کسی قسم کی بیع نہ دوستی اور نہ شفاعت ہوگی (اللہ کی راہ میں) خرچ کرلو اور انکار کرنے والے ظالمین ہیں۔

## س) کامل نیکی کے حصول کے لیے:

کامل نیکی کا حصول انفاق کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

لَنۡ تَنَالُوا الۡبِرَّ حَتّٰى تُنۡفِقُوۡا مِمَّا تُحِبُّوۡنَ ؕ وَمَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ شَىۡءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيۡمٌ (۳/۹۲)

تم کامل نیکی کو ہرگز نہیں پاسکتے جب تک اپنی پسندیدہ اشیاء میں سے (اللہ کی راہ میں) خرچ نہ کرو اور جو کوئی چیز بھی تم خرچ کرو گے اللہ اسے یقیناً خوب جانتا ہے۔

Marfat.com

## ش) زندگی کی ناہمواریاں دور کرنے کے لیے:

اللہ تعالیٰ نے اپنی تائید ونصرت کے حصول کے لیے بنی اسرائیل کو جن شرائط کا پابند کیا تھا ان میں سے ایک شرط انفاق فی سبیل اللہ بھی تھی۔ اس کے نتیجے میں ان سے اللہ کا وعدہ تھا کہ اگر وہ دیگر منجملہ شرائط کے ساتھ انفاق کرتے رہیں گے تو اللہ ان کی زندگیوں کی ناہمواریاں دور کردے گا اور انہیں بہترین نتائج سے سرفراز کرے گا ظاہر ہے یہ امر صرف بنی اسرائیل سے ہی مخصوص نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ کی سنت کبھی تبدیل نہیں ہوتی جو اصول کل تھا وہی آج بھی ہے اور کل بھی وہی رہے گا۔

وَ لَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ ۚ وَ بَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَیْ عَشَرَ نَقِیْبًا ؕ وَ قَالَ اللّٰهُ اِنِّیْ مَعَكُمْ ؕ لَىِٕنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَیْتُمُ الزَّكٰوةَ وَ اٰمَنْتُمْ بِرُسُلِیْ وَ عَزَّرْتُمُوْهُمْ وَ اَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ وَ لَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِیْلِ

(۵/۱۲)

اور ہم نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد لیا تھا اور ہم نے ان میں سے بارہ سردار کھڑے کیے تھے اور (ان سے) کہا تھا (کہ) اگر تم نماز پڑھو گے اور زکوٰۃ دو گے اور میرے رسولوں پر ایمان لاؤ گے اور ان کی ہر طرح سے مدد کرو گے اور (اللہ کو) قرض حسنہ دو گے تو میں یقیناً تمہاری زندگی کی ناہمواریاں دور کردوں گا اور تمہیں ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے اندر نہریں بہتی ہوں گی مگر جو (شخص) تم میں سے اس کے بعد بھی انکار سے کام لے تو وہ سیدھی راہ سے بھٹک گیا ہے۔

Marfat.com

## ک) نفس کے لیے بہتر ہے:

انفاق کا طرزِ عمل خود نفسِ انسانی کے لیے بہتر ہے۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا وَاَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ

(۶۴/۱۶)

پس جتنا ہو سکے اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور اس کی اطاعت کرو اور اپنا مال اس کی راہ میں خرچ کرتے رہو یہ تمہارے نفوس کے لیے بہتر ہوگا اور جو لوگ دل کے بخل سے بچائے جاتے ہیں وہی کامیاب ہوتے ہیں۔

## ل) اللہ کی رضا کے حصول اور بامراد ہونے کے لیے:

اس شخص کی خوش قسمتی کا کیا اندازہ کیا جا سکتا ہے جسے اللہ کی رضا حاصل ہوگئی ہو ایسا شخص ہی بامراد ہوتا ہے اس منزل کے حصول کی راہ بھی انفاق ہی ہے۔

فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ذٰلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۳۸/۳۰)

پس چاہیے کہ قریبی مسکین اور مسافر کو اس کا حق دو یہ بات بہت بہتر ہے ان لوگوں کے لیے جو اللہ کی رضا حاصل کرنا چاہتے ہیں وہی بامراد ہونے والے ہیں۔

سورۃ الدھر میں ایسے افراد کو جو مسکین، یتیم اور اسیر کو کھانا کھلاتے ہیں ان کے متعلق اللہ کا فرمان ہے کہ وہ (اللہ) ضرور انہیں قیامت کے ضرر سے بچائے گا اور انہیں خوشی بخشے گا (۷۶/۱) یہی وہ لوگ ہیں جن کا مقصود اپنے رب کی خوشنودی حاصل کرنا ہوتا ہے اور انہی سے ان کا رب راضی ہوتا ہے۔ یہ لوگ یقیناً بامراد ہیں۔

Marfat.com

الَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَكّٰی ۝ وَ مَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰۤی ۝
اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰی ۝ وَ لَسَوْفَ یَرْضٰی ۝ (۹۲/۱۸۔۲۱)

جو اپنا مال تزکیہ کے لیے دیتا ہے اور کسی کا اس پر کوئی احسان نہیں ہوتا جس کا بدلہ اتارنے کا اس کو خیال ہو مگر اپنے رب کی خوشنودی حاصل کرنا (اس کا مقصد ہوتا ہے) اور وہ ضرور اس سے راضی ہو جائے گا۔

## م) انفاق سے راہ آسان ہو جاتی ہے:

انفاق کے عمل کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ اللہ اس عمل کرنے والے کے لیے آسانیاں پیدا کر دیتا ہے۔

فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَ اتَّقٰی ۝ وَ صَدَّقَ بِالْحُسْنٰی ۝ فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْیُسْرٰی
(۹۲/۵۔۷)

پس جس نے (اللہ کی راہ میں) دیا اور تقویٰ اختیار کیا اور نیک بات کی تصدیق کی اسے ہم ضرور آسانی بہم پہنچائیں گے۔

## ر) عاقبت کا بہترین گھر:

ایسے لوگ جو دورِ ابتلا میں صبر سے کام لیتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ان کو اللہ نے دیا ہے اس میں سے ظاہر اور پوشیدہ خرچ کرتے ہیں ان کے لیے آخرت میں بہترین گھر ہے۔

وَ الَّذِیْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّ عَلَانِیَةً وَّ یَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّیِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَی الدَّارِ ۝ (۱۳/۲۲)

اور جو رب کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے (مصائب میں) صبر کرتے ہیں اور نماز پڑھتے ہیں اور جو (مال) ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے

Marfat.com

پوشیدہ اور ظاہر خرچ کرتے ہیں اور نیکی سے برائی کو دور کرتے ہیں یہی لوگ ہیں جن کے لیے عاقبت کا (بہترین) گھر ہے۔

## ک) دردناک عذاب سے بچنے کے لیے:

اللہ اس کے رسول پر ایمان اور جہاد کے ساتھ انفاق کو ایک ایسی تجارت سے تشبیہ دی گئی ہے جو دردناک عذاب سے محفوظ رکھتی ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ○ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ تُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۶۱/۱۰-۱۱)

اے اہل ایمان! کیا تمہیں ایک ایسی تجارت کی خبر دوں جو تم کو دردناک عذاب سے بچائے گی (اور وہ تجارت یہ ہے کہ) تم اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور اللہ کے راستے میں اموال اور اپنی جانوں سے جہاد کرو اگر تم علم رکھتے ہو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے۔

## ی) اپنے وجود کی بقا کے لیے:

انفاق کی غیر معمولی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ ایسی قوم جو انفاق نہیں کرتی اللہ کا قانون اسے زندگی کے حق سے محروم کر دیتا ہے اور اس کی جگہ کسی دوسری قوم کو لے آتا ہے جو انفاق میں پچھلی قوم کی طرح سست نہیں ہوتی۔

هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ فَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخَلُ ۚ وَ مَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ الْغَنِيُّ وَ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ ۚ وَ اِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۙ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْۤا اَمْثَالَكُمْ (۴۷/۳۸)

سنو! تم وہ لوگ ہو جن کو اس لیے بلایا جاتا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور تم میں سے بعض ایسے ہوتے ہیں جو بخل سے کام لیتے ہیں اور جو بھی بخل

سے کام لے وہ اپنے نفس ہی کے متعلق بخل سے کام لیتا ہے ورنہ اللہ تو غنی ہے اور تم ہی محتاج ہو اور اگر تم پھر جاؤ تو وہ تمہاری جگہ ایک اور قوم کو بدل کر لے آئے گا اور وہ تمہاری طرح نہیں ہوں گے۔

**ی) اوپر والا ہاتھ بہتر ہے:**

ایک مشہور حدیث ہے کہ ''اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے اوپر والا ہاتھ دینے والا اور نیچے والا ہاتھ لینے والا ہے''۔ ظاہر ہے ایک ایسا شخص جو انفاق کرتا ہے اور اور جو انفاق نہیں کرتا قرآن مجید کی نظر میں دونوں برابر نہیں ہیں۔ اوّل الذکر بہر حال ثانی الذکر سے بہتر ہے۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّمَنْ رَّزَقْنٰهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا فَهُوَ يُنْفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَّجَهْرًا هَلْ يَسْتَوٗنَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (۱۶/۷۵)

اللہ ایک ایسے بندے کی حالت بیان کرتا ہے جو غلام ہو اور (اس کے مقابلے میں اس بندے کی حالت بھی) جسے ہم نے اپنے پاس سے اچھا رزق دیا ہو اور اس میں سے وہ پوشیدہ طور پر (بھی) اور علانیہ (بھی) ہماری (راہ میں) خرچ کرتا ہو کیا وہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں (ہرگز نہیں) ہر تعریف کا اللہ ہی مستحق ہے لیکن ان میں سے اکثر جانتے نہیں۔

یہ ہیں وہ نتائج جو انفاق کے نتیجے میں مسلمانوں کو حاصل ہوتے ہیں انہی نتائج کی وجہ سے یہ عمل غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔

دوسرے قانون کے اس چوتھے نقطے یعنی انفاق پر بحث خاصی طویل ہوگئی تاہم اہم موضوعات لازمی طور پر توجہ بھی زیادہ طلب کرتے ہیں۔

لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ از روئے قرآن اس تیسرے قانون کی رو سے معزز رزق کا

انحصار اللہ سے ڈرنے، اللہ پر توکل کرنے، الصلوٰۃ کی ادائیگی اور انفاق پر ہوتا ہے۔

## چوتھا قانون: مہاجروں، مہاجرین کو پناہ دینے والوں، اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والوں اور شہدا کے لیے معزز رزق ہے۔

مشیت ایزدی کے اس قانون کی رو سے چار قسم کے افراد اوّل جنھوں نے اللہ کی راہ میں اپنا وطن چھوڑا اور ہجرت کی، دوم وہ لوگ جنھوں نے ان کو پناہ دی، سوم جنھوں نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور چہارم وہ لوگ جو راہ خدا میں شہادت کے درجۂ عظیم پر فائز ہوئے، ان سب کے لیے معزز رزق ہے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ۭ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ
(۸/۷۴)

اور جو لوگ ایمان لائے اور وطن سے ہجرت کر گئے اور اللہ کی راہ میں لڑتے رہے اور جنھوں نے (ہجرت کرنے والوں کو) جگہ دی اور ان کی مدد کی یہی لوگ سچے مومن ہیں ان کے لیے مغفرت اور معزز رزق ہے۔

ایک دوسری جگہ راہ حق کے شہدا کے لیے بھی ''احسن رزق'' (اچھا، عمدہ اور اعلیٰ رزق) کی فراہمی کی ضمانت دی گئی ہے۔

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ قُتِلُوْٓا اَوْ مَاتُوْا لَيَرْزُقَنَّهُمُ اللّٰهُ رِزْقًا حَسَنًا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ۝ (۲۲/۵۸)

اور جن لوگوں نے خدا کی راہ میں ہجرت کی پھر مارے گئے یا مر گئے ان کو خدا اچھی روزی دے گا اور بے شک اللہ سب سے بہتر روزی دینے والا ہے۔

جہاں تک شہدا کا تعلق ہے ان کے متعلق تو ویسے بھی ارشاد خداوندی ہے کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں انہیں مردہ مت کہو وہ زندہ ہیں اور انہیں ان کے رب کی جانب

سے رزق ملتا ہے۔

وَ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ (۳/۱۶۹)

وہ لوگ جو اللہ کی راہ میں مارے گئے ان کو مرے ہوئے نہ سمجھنا وہ خدا کے نزدیک زندہ ہیں اور ان کو رزق مل رہا ہے۔

یہ ایک الگ مسئلہ ہے کہ انہیں کس طرح رزق ملتا ہے یہ صرف اللہ جانتا ہے اور ہمیں اس کا کوئی شعور نہیں ہے۔

وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّ لٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ (۲/۱۵۴)

اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں ان کی نسبت یہ نہ کہنا کہ وہ مرے ہوئے ہیں بلکہ زندہ ہیں لیکن تم اس کا شعور نہیں رکھتے۔

گویا اس قانون کی رو سے اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں، ان مہاجرین کو پناہ دینے والوں، اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والوں اور شہداء کے لیے اللہ نے معزز رزق کا وعدہ کیا ہے اور وہ اپنے عہد کی کبھی خلاف ورزی نہیں کرتا۔

## پانچواں قانون: اللہ کے مخلص بندوں کے لیے رزقِ معلوم

مشیت ایزدی سے متعین کردہ اس قانون کے مطابق مصلحین کے لیے رزقِ معلوم ہے۔

اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ رِزْقٌ مَّعْلُوْمٌ ۝

(۳۷/۴۰-۴۱)

مگر جو اللہ کے مخلص بندے ہیں یہی (وہ) لوگ ہیں جن کے لیے رزقِ معلوم ہے۔

Marfat.com

متذکرہ بالا آیات میں دو نقاط پر تدبر لازم ہے اوّل اللہ کے مخلص بندے اور دوم رزق معلوم۔ ان نقاط کا انفرادی تجزیہ مندرجہ ذیل ہے۔

## اللہ کے مخلص بندے:

مخلص کا مادہ خ ل ص ہے اس کے بنیادی معنی ہیں کھوٹ اور میل سے الگ ہو کر صاف اور خالص ہو جانا۔ باالفاظ دیگر ایسے افراد جو لوگوں کی عام روش سے ہٹ کر صحیح راہ پر چل رہے ہوں انہیں مخلص کہا جائے گا۔ اس لیے المخلص اسے کہتے ہیں جسے دوسروں سے الگ کر کے کسی خاص کام کے لیے چُن لیا جائے یا مختص کر دیا جائے۔

اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ (۱۲/۲۴)

بے شک وہ (یوسفؑ) ہمارے خاص بندوں میں سے تھے۔

باالفاظِ دیگر وہ عام لوگوں کی راہ پہ نہیں چلتے تھے اللہ کی راہ پر چلتے تھے۔ اسی بنیاد پر تمام انبیاء اسی مبارک گروہ کے افراد ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سورۃ ص میں انبیاء کرام کے تذکرہ کے بعد فرمایا:

اِنَّآ اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ (۳۸/۴۶)

ہم نے انہیں عام لوگوں سے ہٹا کر (ایک خاص گروہ بنا دیا)۔

صرف اسی وجہ سے کہ تمام انبیاء کرام اپنے مقصد (لوگوں کو راہِ حق کی جانب لانا) میں صد فیصد سچے اور پُر خلوص تھے۔

سورۃ البقرہ میں ارشاد ربانی ہے:

قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِى اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ (۲/۱۳۹)

(ان سے) کہہ دیجیے کیا تم اللہ کے بارے میں ہم سے جھگڑتے ہو حالانکہ وہی ہمارا اور تمہارا رب ہے اور ہم کو ہمارے اعمال (کا بدلہ ملے گا) اور تم کو تمہارے اعمال (کا) اور ہم خالصتاً اسی کی عبادت کرنیوالے ہیں۔

اس کی مزید وضاحت اس سے بالکل متصل پچھلی آیت میں کر دی گئی ہے جہاں ارشادِ ربانی ہے۔

صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۫ وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ

(۲/۱۳۸)

ہم نے اللہ کا رنگ (اختیار کر لیا ہے) اور اللہ سے بہتر رنگ کس کا ہو سکتا ہے اور ہم اسی کی عبادت کرنے والے ہیں۔

لہٰذا اللہ کے مخلص بندوں سے مراد یہ ہوگی کہ اللہ کے وہ بندے جو بغیر کسی کھوٹ اور ملاوٹ کے خالصتاً اللہ کی اطاعت کریں اور اسی کے رنگ میں رنگ جائیں۔ اخلاص کا یہ رنگ مشکلات و موانعات میں ثابت قدم رہنے سے ہی نکھرتا ہے۔

اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ ۭ وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ۚ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَاۗءَ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ ۭ

(۳/۱۴۰-۱۴۱)

اگر تمہیں زخم لگا ہے تو ان لوگوں کو بھی ایسا زخم لگ چکا ہے اور یہ دن ہیں کہ ہم ان کو لوگوں میں بدلتے رہتے ہیں اور اس سے یہ بھی مقصود تھا کہ اللہ ایمان والوں کو متمیز کر دے اور تم میں سے گواہ بنائے اور خدا بے انصافوں کو پسند نہیں کرتا اور یہ بھی مقصود تھا کہ اللہ ایمان والوں کو خالص (مومنین) بنا دے اور کافروں کو نابود کر دے۔

خدا کے یہی وہ مخلص بندے ہیں جن پر شیطان کا کوئی داؤ نہیں چل سکتا۔ قصہ بنی آدم میں شیطان کے نوع انسانی کو ورغلانے کے بارے میں مکالمے میں خود وہ (شیطان) تسلیم کرتا ہے کہ تیرے مخلص بندوں پر میرا اختیار چلنا مشکل ہے۔

اِلَّا عِبَادَکَ مِنۡهُمُ الۡمُخۡلَصِيۡنَ (۱۵/۴۰)

ماسوا تیرے مخلص بندوں کے (ان پر میں قابو نہیں پا سکتا)۔

سورۃ ص میں اس کی مزید وضاحت اس طرح کر دی گئی کہ جو تیری اطاعت کرنے والے مخلص بندے ہوں گے ان پر میرا زور نہیں چلے گا۔

اِلَّا عِبَادَکَ مِنۡهُمُ الۡمُخۡلَصِيۡنَ (۳۸/۸۳)

ماسوا تیری اطاعت کرنے والے مخلص بندوں کے (سب کو بہکاؤں گا)۔

تصریحات بالا سے واضح ہے کہ اللہ کے مخلص بندوں سے مراد اللہ کے وہ بندے ہیں جو خالصتاً اللہ کے رنگ میں رنگے ہوئے ہوں اور ان میں کسی قسم کی کوئی کھوٹ اور ملاوٹ نہ ہو۔ انبیاء کرام بھی اس زمرے میں شامل ہیں۔

## رزقِ معلوم:

جہاں تک ان بزرگ اور برگزیدہ ہستیوں کے رزق کا تعلق ہے ان کے متعلق قرآن مجید نے رزقِ معلوم کی اصطلاح استعمال کی ہے اس سے مراد ظاہر ہے وہ رزق ہے جس کا تذکرہ قرآن مجید میں مختلف مقامات پر کیا گیا ہے اور ان ہستیوں کے رتبے کے پیش نظر وہ رزق صرف اور صرف رزق کریم (معزز رزق) ہی ہو سکتا ہے لہٰذا کشادگیٔ رزق کے اس قانون کے تحت اللہ کے مخلص بندوں کے لیے بھی معزز رزق ہے۔

## چھٹا قانون: پاک لوگوں کے لیے رزق کریم:

مشیت الٰہی سے طے شدہ اس قانون کی رو سے پاک لوگ بھی معزز رزق کے حقدار ہوتے ہیں اس حوالے سے ارشادِ ربانی ہے۔

اَلۡخَبِيۡثٰتُ لِلۡخَبِيۡثِيۡنَ وَالۡخَبِيۡثُوۡنَ لِلۡخَبِيۡثٰتِ‌ۚ وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيۡنَ وَالطَّيِّبُوۡنَ لِلطَّيِّبٰتِ‌ۚ اُولٰٓـئِكَ مُبَرَّءُوۡنَ مِمَّا يَقُوۡلُوۡنَ‌ؕ لَهُمۡ مَّغۡفِرَةٌ وَّرِزۡقٌ كَرِيۡمٌ (۲۴/۲۶)

Marfat.com

ناپاک عورتیں ناپاک مردوں کے لیے ہیں اور ناپاک مرد ناپاک عورتوں کے لیے اور پاک عورتیں پاک مردوں کے لیے ہین اور پاک مرد پاک عورتوں کے لیے یہ (پاک لوگ) ان (بدگویوں) کی باتوں سے بری ہیں (اور) ان کے لیے بخشش اور معزز رزق ہے۔

## ساتواں قانون:- صبر کا نتیجہ آسان رزق

ایسے افراد اور قومیں جو آزمائش کی گھڑی میں ثابت قدم رہتی ہیں اور صبر واستقامت کا مظاہرہ کرتی ہیں ان کے اس فعل کے بدلے اللہ انہیں آسان رزق عطا فرماتا ہے۔ اس کی مثال بنی اسرائیل کے حوالے سے دی جاسکتی ہے۔ قوم فرعون نے ان کو غلام بنا رکھا تھا اور ان پر طرح طرح کے مظالم ڈھاتے تھے۔

وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِىْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ؕ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِىْۤ اِسْرَآءِيْلَ ۙ بِمَا صَبَرُوْا ؕ وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ (۷/۱۳۷)

اور جو لوگ کمزور سمجھے جاتے تھے ان کو زمین کے مشرق ومغرب کا جس میں ہم نے برکت دی تھی وارث کردیا اور بنی اسرائیل نے (فرعون کے مظالم پر) صبر کیا اس لیے آپ کے رب کا نیک وعدہ (جو اس نے بنی اسرائیل سے کیا تھا) ان کے حق میں پورا ہوا اور فرعون اور قوم فرعون جو (محل) بناتے اور (انگور کے باغ) جو چھتریوں پر چڑھاتے تھے سب کو ہم نے تباہ کردیا۔

بنی اسرائیل کے اس صبر کی وجہ سے انہیں جو نعمتیں ملیں ان میں پاکیزہ چیزوں میں رزق بھی شامل تھا۔

Marfat.com

وَلَقَدْ اٰتَیْنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ الْکِتٰبَ وَالْحُکْمَ وَالنُّبُوَّةَ وَرَزَقْنٰھُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰھُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ (۴۵/۱۶)

اور ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب (ہدایت) اور حکومت اور نبوت بخشی اور پاکیزہ چیزوں میں سے رزق دیا اور اہل عالم پر فضیلت بخشی۔

## آٹھواں قانون: رزق کا شکر لازم ہے

ازروئے قرآن کشادگی رزق کے لیے اللہ کی جانب سے عطا ہونے والے رزق کا شکر لازم ہے۔

فَاذْکُرُوْنِیْٓ اَذْکُرْکُمْ وَاشْکُرُوْا لِیْ وَلَا تَکْفُرُوْنِ (۲/۱۵۲)

سو تم مجھے یاد کیا کرو میں تمہیں یاد کروں گا اور میرا شکر ادا کرتے رہنا اور ناشکری نہ کرنا۔

شکر قرآن مجید کی ایک بہت جامع اصطلاح ہے اس کا مادہ ش ک ر ہے۔ اس کے اصل معنی بھر جانا اور اظہار کرنا کے ہیں اس کے علاوہ مقدار میں کثیر ہونا بھی اس میں شامل ہے۔ صاحب تاج العروس کے نزدیک انسان کی طرف سے شکر کے معنی اطاعت اور ادائے فرض، نیز احسان مندی کے جذبات کا اظہار اور خدا کی طرف سے شکر کے معنی پورا پورا بدلہ دینا یا تھوڑے عمل کا بڑھا کر اجر دینا ہے۔

چونکہ شکر کے معنی نمایاں اور ظاہر کرنا ہیں اس لیے اس کے مقابلے میں کفر کا لفظ آیا ہے (۱۴/۷) جس کے معنی ڈھانپ کر رکھنا اور دبا دینا ہیں۔

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّکُمْ لَئِنْ شَکَرْتُمْ لَاَزِیْدَنَّکُمْ وَلَئِنْ کَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِیْ لَشَدِیْدٌ (۱۴/۷)

جب تمہارے رب نے تم سے کہا اگر تم شکر کرو گے تو میں زیادہ دوں گا اور اگر ناشکری کرو گے تو میرا عذاب بہت سخت ہے۔

Marfat.com

چونکہ شکر کے معنی میں اطاعت کا پہلو شامل ہے اس لیے ایک دوسرے مقام پر اس کی صراحت قرآن مجید میں کر دی گئی کہ شکر اطاعت سے مشروط ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَاشْكُرُوا لِلَّهِ إِنْ كُنْتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ (۲/۱۷۲)

اے اہل ایمان! جو پاکیزہ چیزیں ہم نے تم کو عطا فرمائی ہیں ان کو کھاؤ اور اگر خدا ہی کی اطاعت کرتے ہو تو (اس کی نعمتوں کا) شکر بھی ادا کرو۔

اس حقیقت کا اعادہ (۱۶/۱۱۳) میں بھی کیا گیا ہے جہاں طیب کے ساتھ حلال اشیاء کا بھی اضافہ کیا گیا ہے یعنی جو حلال اور طیب اشیاء اللہ نے عطا کی ہیں انہیں کھاؤ اور اگر تم اللہ کے قوانین واحکام کے تابعدار ہو تو اس کا شکر ادا کرو۔

إِنَّمَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَوْثَانًا وَتَخْلُقُونَ إِفْكًا إِنَّ الَّذِينَ تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ لَا يَمْلِكُونَ لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوا عِنْدَ اللَّهِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوهُ وَاشْكُرُوا لَهُ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ (۲۹/۱۷)

تم اللہ کے سوا بتوں کی عبادت کرتے ہو اور جھوٹی باتیں دل سے گھڑ لیتے ہو سنو جن کی تم اللہ کے سوا عبادت کرتے ہو وہ تمہارے رزق کے مالک نہیں پس تمہیں چاہیئے کہ تم اللہ ہی سے رزق طلب کرو اسی کی اطاعت کرو اسی کا شکر ادا کرو اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔

## شکر کا مفہوم:

جہاں تک شکر کے قرآنی مفہوم کا تعلق ہے اس سے مراد اعمال صالحہ ہیں یعنی اللہ کی وحدانیت پر ایمان رکھتے ہوئے ایسے افعال جن سے اللہ کی رضا حاصل ہو۔

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا ۖ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَوَضَعَتْهُ كُرْهًا ۖ وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا ۚ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ أَشُدَّهُ وَبَلَغَ

Marfat.com

اَرْبَعِيْنَ سَنَةً قَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَ عَلٰى وَالِدَيَّ وَ اَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَ اَصْلِحْ لِيْ فِيْ ذُرِّيَّتِيْ اِنِّيْ تُبْتُ اِلَيْكَ وَ اِنِّيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ (۴۶/۱۵)

اور ہم نے انسان کو اپنے والدین کے ساتھ بھلائی کا حکم دیا اس کی ماں نے اس کو تکلیف سے پیٹ میں رکھا اور تکلیف سے ہی جنا اور اس کا پیٹ میں رہنا اور دودھ چھوڑنا ڈھائی برس میں ہوتا ہے یہاں تک کہ جب خوب جوان ہو جاتا اور چالیس برس کو پہنچ جاتا ہے تو کہتا ہے کہ اے میرے رب مجھے توفیق دے تو نے جو احسان مجھ پر اور میرے ماں باپ پر کیے ہیں ان کا شکر گزار ہوں اور یہ کہ نیک عمل کروں جن کو تو پسند کرے اور میرے لیے میری اولاد میں اصلاح (وتقویٰ) دے اور میں تیری طرف رجوع کرتا ہوں اور میں فرمانبرداروں (مسلمانوں) میں ہوں۔

اس کی مزید وضاحت سورۃ النمل کی مندرجہ ذیل آیت میں کر دی گئی۔

فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا وَ قَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَ عَلٰى وَالِدَيَّ وَ اَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَ اَدْخِلْنِيْ بِرَحْمَتِكَ فِيْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِيْنَ (۲۷/۱۹)

تو وہ اس کی بات پر مسکرائے اور کہنے لگے کہ اے میرے رب مجھے توفیق عنایت کر کہ جو احسان تو نے مجھ پر اور میرے ماں باپ پر کیے ہیں میں ان کا شکر ادا کروں اور ایسے نیک اعمال کروں جنہیں تو پسند کرے اور مجھے اپنی رحمت سے اپنے صالح بندوں میں شمار فرما۔

متذکرہ بالا دونوں آیات (۴۶/۱۵) اور (۲۷/۱۹) میں شکر سے مراد اعمال صالحہ ہیں یعنی ایسے اعمال جن کی انجام دہی سے اللہ کی رضا حاصل ہو۔ باالفاظِ دیگر راہ مستقیم

Marfat.com

اختیار کرنا شکر ہے۔

اِنَّا ھَدَیْنٰہُ السَّبِیْلَ اِمَّا شَاکِرًا وَّاِمَّا کَفُوْرًا (۷۶/۳)

اسے راستہ بھی دکھا دیا (اب وہ) خواہ شکر گزار ہو یا ناشکرا۔

اس آیت کریمہ سے واضح ہے کہ صحیح راہ کا انتخاب بالفاظِ دیگر تقویٰ کی راہ کا انتخاب اور اس پر دل جمعی سے چلنا بھی شکر ہے۔ وہ افعال جنہیں قرآن مجید میں شکر قرار دیا گیا ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

## i۔ اللہ کی آیات پر تدبر شکر ہے:

از روئے قرآن اللہ کی آیات/نشانیوں پر غور وفکر بھی شکر میں شامل ہے۔

وَالْبَلَدُ الطَّیِّبُ یَخْرُجُ نَبَاتُہٗ بِاِذْنِ رَبِّہٖ وَالَّذِیْ خَبُثَ لَا یَخْرُجُ اِلَّا نَکِدًا کَذٰلِکَ نُصَرِّفُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّشْکُرُوْنَ (۷/۵۸)

اور پاکیزہ زمین میں سے پیداوار اللہ کے حکم سے خوب ہوتی ہے اور جو خراب ہے اس کی پیداوار کم نکلتی ہے ہم اس طرح دلائل کو طرح طرح سے بیان کرتے ہیں ان لوگوں کے لیے جو شکر گذار ہیں۔

## ii۔ صرف اللہ کی عبدیت اختیار کرنا شکر ہے:

از روئے قرآن اللہ کی راہِ عبدیت پر چلنا شکر ہے۔

بَلِ اللّٰہَ فَاعْبُدْ وَکُنْ مِّنَ الشّٰکِرِیْنَ (۳۹/۶۶)

بلکہ اللہ ہی کی عبدیت اختیار کرو اور شکر گذاروں میں ہو۔

## iii۔ اللہ کی عنایات کے بعد اس کی اطاعت شکر گزاری ہے:

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر جو عنایات کرتا ہے ان عنایت کے حصول کے بعد لازم ہے کہ اللہ کی عبدیت اختیار کیا جائے یہ ان عنایات کا شکر ہے۔

قَالَ یٰمُوْسٰٓی اِنِّی اصْطَفَیْتُکَ عَلَی النَّاسِ بِرِسٰلٰتِیْ وَ بِکَلَامِیْ ز صلے
فَخُذْ مَآ اٰتَیْتُکَ وَ کُنْ مِّنَ الشّٰکِرِیْنَ (۷/۱۴۴)

ارشاد ہوا کہ موسیٰ! میں نے پیغمبری اور اپنی ہم کلامی سے (تمہیں) لوگوں سے ممتاز کیا ہے تو جو کچھ میں نے تم کو عطا کیا ہے اسے پکڑ کر رکھو اور میرا شکر ادا کرو۔

بالعموم انسان اللہ کی عنایات پر اسے اپنے دست و بازو کا نتیجہ قرار دے دیتا ہے یہ فرعونیت ہے صحیح طریقہ کار یہ ہے کہ اللہ کی عنایات پر اس کی عبدیت اختیار کی جائے اور اس کا شکر ادا کیا جائے۔ باالفاظِ دیگر وہ تمام افعال انجام دینا جن کا اعمال صالحہ کے تحت تذکرہ کیا جا چکا ہے شکر کہلاتا ہے۔

## شکر توفیق ایزدی سے مشروط ہے:

شکر کے حوالے سے ایک اہم نکتہ یہ بھی ہے کہ متذکرہ بالا آیات (۱۵/۴۶) اور (۱۹/۲۷) میں شکر کو توفیق ایزی سے مشروط کیا گیا ہے۔ باالفاظِ دیگر ایسے اعمال جو اعمال صالحہ کہلاتے ہیں ان کو انجام دینے کی صلاحیت بھی اللہ ہی کی عطا ہوتی ہے۔

رَبَّنَآ اِنِّیْٓ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِکَ
الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَۃً مِّنَ النَّاسِ تَھْوِیْٓ
اِلَیْھِمْ وَارْزُقْھُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّھُمْ یَشْکُرُوْنَ (۱۴/۳۷)

اے ہمارے رب! میں نے اپنی کچھ اولاد کو اس بے کھیتی کی وادی میں تیرے حرمت والے گھر کے پاس بسایا ہے اے ہمارے رب! یہ اس لیے کہ وہ نماز قائم رکھیں پس تو لوگوں کے دلوں کو ان کی جانب مائل کر دے ان کو میووں سے رزق دیتا رہ تا کہ یہ شکر گزاری کریں۔

اس طرح جو شکر کرتا ہے وہ اپنے نفس کے لیے ہی کرتا ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ وَمَنْ يَّشْكُرْ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ (۳۱/۱۲)

اور ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی کہ اللہ کا شکر ادا کرو اور جو شخص شکر کرتا ہے وہ اپنے نفس کے فائدے کے لیے ہی کرتا ہے اور جو ناشکری کرتا ہے تو اللہ غنی اور سزاوار حمد ہے۔

شکر کا فائدہ دنیا اور آخرت دونوں میں ہوتا ہے دنیا میں ایک طرف اللہ اس کے بدلے اور زیادہ دیتا ہے اور آخرت میں بھی شکر کرنے والے جنتی ہوں گے۔

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ (۱۴/۷)

اور جب تمہارے رب نے تم کو آگاہ کیا کہ اگر تم شکر کرو گے تو میں تمہیں اور زیادہ دوں گا اور اگر ناشکری کرو گے تو میرا عذاب سخت ہے۔

شکر گذار لوگ آخرت میں بھی اعلیٰ درجات کے حامل ہوں گے۔

اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهٖ اِجْتَبٰىهُ وَهَدٰىهُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ وَاٰتَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ (۱۶/۱۲۰-۱۲۲)

بے شک ابراہیم (لوگوں کے) امام (اور) اللہ کے فرمانبردار تھے اور یک طرفہ مخلص تھے اور مشرکین میں سے نہ تھے اس کی نعمتوں کے شکر گزار تھے اللہ نے انہیں برگزیدہ کیا اور سیدھی راہ پر چلایا تھا ہم نے ان کو دنیا میں بھی خوبی دی تھی اور آخرت میں بھی صالحین میں ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ کی دیگر منجملہ صفات میں سے ایک صفت شکور بھی ہے شکور کے معنی ہیں اعمال انسانی کی ان کی حیثیت کے مطابق قدر کر کے ان کا بدلہ دینا ہے۔

Marfat.com

مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَ اٰمَنْتُمْ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا (۴/۱۴۷)

اگر تم شکر کرو اور خدا پر ایمان رکھو تو اللہ کو تمہیں عذاب دے کر کیا کرنا ہے؟ اللہ تو ان اعمال کا قدر شناس ہے اور علم رکھنے والا ہے۔

اللہ نہ صرف اعمال صالحہ کا پورا پورا بدلہ دینے والا بلکہ اپنے فضل سے اس میں اضافہ بھی کرنے والا ہے اس طرح وہ بہترین بدلہ دینے والا ہے۔

لِيُوَفِّيَهُمْ اُجُوْرَهُمْ وَ يَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ اِنَّهٗ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ (۳۵/۳۰)

تا کہ وہ ان کو پورا پورا بدلہ دے اور اپنے فضل سے اس میں اضافہ بھی کرے وہ تو بخشنے والا اور بہترین بدلہ دینے والا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مومن جب جنت میں داخل ہوں گے تو پکار پکار کر کہیں گے۔

وَ قَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرٌ (۳۵/۳۴)

وہ کہیں گے تمام حمد اللہ تعالیٰ کے لیے ہے جس نے ہم سے حزن دور کیا بیشک ہمارا رب بخشنے والا اور قدر دان ہے۔

اللہ ہی ہے جو شکر گذاروں کے اعمال قبول کرتا ہے ان کے گناہوں سے درگذر کرتا ہے اور شاکرین (شکر کرنے والے) ہی اہل جنت ہیں یہ اس پاک پروردگار کا سچا وعدہ ہے۔ سورۃ الاحقاف میں آیت ۱۵ میں جس کا اوپر تذکرہ کیا گیا پہلے یہ بتایا گیا کہ شکر سے مراد اعمال صالحہ ہیں اس سے متصل دوسری آیت میں کہا گیا ہے کہ:

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَ نَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّاٰتِهِمْ فِيْٓ اَصْحٰبِ الْجَنَّةِ وَعْدَ الصِّدْقِ الَّذِيْ كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ (۴۶/۱۶)

Marfat.com

یہی وہ لوگ ہیں جن کے نیک اعمال ہم قبول کریں گے اور ان کے گناہوں سے درگذر فرمائیں گے (اور یہی لوگ) جنت میں (ہوں گے) (یہ) سچا وعدہ (ہے) جو ان سے کیا جاتا تھا۔

شکر کے ان تمام دنیاوی اور اخروی مثبت نتائج کے باوجود انسان اللہ تعالیٰ کا شکر ادا نہیں کرتا۔ سورۃ یٰسین میں زمین سے فراہم ہونے والی متعدد نعمتوں کے تذکرے کے بعد ارشاد ربانی ہے۔

لِيَأْكُلُوا مِنْ ثَمَرِهِ وَمَا عَمِلَتْهُ أَيْدِيهِمْ أَفَلَا يَشْكُرُونَ (۳۶/۳۵)

تاکہ یہ ان کے پھل کھائیں اور ان کے ہاتھوں نے تو انہیں نہیں بنایا تو پھر (یہ لوگ) کیوں شکر ادا نہیں کرتے؟

یقیناً بہت کم لوگ ہیں جو اللہ کی ان تمام نعمتوں کو جو ان کو حاصل ہیں استعمال کے بعد اس کا شکر ادا کرتے ہیں۔

وَلَقَدْ مَكَّنَّاكُمْ فِي الْأَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ (۷/۱۰)

اور ہم ہی نے زمین میں تمہارا ٹھکانہ بنایا اور اس میں تمہارے لیے سامان معیشت پیدا کیا (مگر) تم کم ہی شکر کرتے ہو۔

یقیناً انسانوں میں بہت کم اللہ کے شکر گذار ہیں۔

وَقَلِيلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُورُ (۳۴/۱۳)

اور میرے بندوں میں سے شکر گذار کم ہیں۔

اور ناشکر گزاری کا انجام صرف اور صرف عذاب الٰہی ہے جو بہت سخت ہوتا ہے۔

وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِن شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِن كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ (۱۴/۷)

Marfat.com

اور جب تمہارے رب نے تم کو آگاہ کیا کہ اگر تم شکر کرو گے تو میں تمہیں زیادہ دوں گا اور اگر ناشکری کرو گے تو میرا عذاب سخت ہے۔

گویا یہ کہا جا سکتا ہے کہ رزق کی کشاد کے بعد اسے برقرار رکھنے کے لیے اللہ کا شکر (اعمال صالح) لازم ہے یہ ایک ایسی بنیادی شرط ہے جو پوری نہ ہونے کی صورت میں عذاب الٰہی سے افراد یا اقوام کو کوئی نہیں بچا سکتا۔

## نواں قانون: استغفار سے رزق

رزق کی کشاد کے دوسرے قانون ''اللہ پر ایمان اور ایمان صالح کے نتیجے میں باعزت رزق'' کے عنوان کے تحت مغفرت (واضح رہے کہ مغفرت اور استغفار دونوں کا مادہ غ ف ر ہے) کے ذیلی عنوان میں یہ بحث کی جا چکی ہے کہ اگر کوئی فرد یا قوم غلط روش پر چلنا شروع ہو جائے تو لامحالہ اس کے منفی نتائج اس پر پڑنا شروع ہو جاتے ہیں لیکن اس سے قبل کہ یہ منفی اثرات اس فرد یا قوم کی ہلاکت پر منتج ہو جائیں اس سے پہلے وہ فرد یا قوم اجتماعی طور پر اس غلط راہ سے رجوع کر لے اور راہِ ہدایت پر آجائے تو اس کے نتیجے میں ایک طرف تو اس کی سابقہ غلط روش کے اثرات سے تحفظ مل جاتا ہے دوم صحیح راہ اختیار کرنے کے مثبت اثرات بھی پیدا ہونے شروع ہو جاتے ہیں اللہ کی مشیت سے طے کردہ قانون کے مطابق اگر کوئی قوم ایک خاص مرحلے تک رجوع کر لیتی ہے بالفاظِ دیگر سابقہ راہ سے تائب ہو کر راہ ہدایت اختیار کر لیتی ہے تو اس پر رزق کے دروازے کھل جاتے ہیں اس کی وضاحت سورۃ النوح میں حضرت نوح علیہ السلام کے ان کلمات سے ہو جاتی ہے جو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے کہے یہ کلمات از روئے قرآن اس وقت کے ہیں جب حضرت نوح علیہ السلام کی ہر ہر طرح کی کوشش کے بعد بھی ان کی قوم راہ راست پر نہیں آئی۔

فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ إِنَّهُ كَانَ غَفَّارًا ۝ يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُم مِّدْرَارًا ۝ وَيُمْدِدْكُم بِأَمْوَالٍ وَبَنِينَ وَيَجْعَل لَّكُمْ جَنَّاتٍ وَيَجْعَل لَّكُمْ أَنْهَارًا ۝ مَّا لَكُمْ لَا تَرْجُونَ لِلَّهِ وَقَارًا (۱۰-۱۳/۷۱)

اور کہا اپنے رب سے استغفار کرو وہ بڑا معاف کرنے والا ہے وہ تم پر آسمان سے مینہ برسائے گا اور مال اور بیٹوں سے تمہاری مدد کرے گا اور تمہیں باغ عطا کرے گا ان میں تمہارے لیے نہریں بہادے گا تم کو کیا ہوا ہے کہ تم اللہ سے وقار کے طالب نہیں ہوتے۔

یہ آیات واضح طور پر اس امر پر دلیل ہیں کہ اگر کوئی قوم جو غلط راہوں کی مسافر ہو اگر اپنے سابقہ عمل سے رجوع کرلے تو اللہ بار بار توبہ قبول کرنے والا ہے۔ اور اگر وہ قوم اپنے عمل سے ثابت بھی کردے کہ واقعی اس نے راہ ہدایت اختیار کرلی ہے تو اللہ اپنی رحمتوں کے دروازے کھول دیتا ہے۔ لہٰذا اس بنیاد پر کسی بھی قوم کے لیے کسی بھی وقت (نکتۂ اجل سے پہلے) رجوع کا موقعہ ہوتا ہے اور اگر وہ اس سے فائدہ اٹھالے تو اس پر رزق کی راہیں کشادہ ہوتی چلی جاتی ہیں۔

متذکرہ بالا قوانین وہ ہیں جن پر عمل درآمد کے نتیجے میں رزق کی کشاد لازمی ہے کیونکہ یہ خدائے برحق کے قوانین ہیں جو فلاح کی جانب جانے والی واحد راہ ہے۔

## بغیر کسی حساب کے رزق

اگر متذکرہ بالا قوانین کی کامل اطاعت کی جائے تو ایک مرحلہ وہ بھی آتا ہے جسے قرآن مجید میں بغیر کسی حساب کے رزق عطا ہونے کا مرحلہ کہا گیا ہے:

إِنَّ اللَّهَ يَرْزُقُ مَنْ يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ (۳/۳۷)

بے شک اللہ (اپنے قوانین مشیت سے مشروط) جسے چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے۔

اس اصطلاح کا استعمال (۳۸/۲۴)، (۴۰/۴۰) میں بھی کیا گیا ہے۔ یہ اصطلاح خالصتاً رزق کے حوالے سے ہی قرآن مجید میں استعمال نہیں کی گئی ہے بلکہ لوگوں کے اعمال کے اجر کے حوالے سے بھی اس کا قرآن مجید میں تذکرہ کیا گیا ہے۔

Marfat.com

اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ (۳۹/۱۰)

جو صبر کرنے والے ہیں انہیں بے حساب اجر ملے گا۔

اس اصطلاح کے معنی یہ ہرگز نہیں ہیں کہ خدا بغیر کسی قاعدے، قانون یا حساب کتاب کے اجر یا رزق عطا کر دیتا ہے۔ یہ تصور پوری قرآن تعلیمات کے خلاف ہے۔ جب ہر ہر شے قوائد و ضوابط کی ایک مخصوص زنجیر میں بندھی ہوئی ہے تو ظاہر ہے ان مقامات پر استثنیٰ کی کوئی گنجائش نہیں ہے، رزق کے حوالے سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ متذکرہ بالا قوانین کی اطاعت کے نتیجے میں ایک خاص مرحلہ وہ آتا ہے جہاں رزق کی مقدار غیر معمولی وسیع یا لامحدودیت کو چھونے لگتی ہے۔ اس کی ایک ادنیٰ سی مثال صرف تصور کی وضاحت کے لیے بوفے کی دی جا سکتی ہے۔ بوفے میں ایک خاص رقم کی ادائیگی کے بعد جو یقیناً عام کھانے کی رقم سے زیادہ ہوتی ہے صارف کو ہر قسم کے کھانوں، سویٹ ڈشز اور تمام دستیاب مشروبات وغیرہ کی سہولت حاصل ہو جاتی ہے۔ یہ کھانے یقیناً اتنے ہوتے ہیں جو انسان کی نارمل بھوک کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہوتے ہیں بالفاظِ دیگر ایک مخصوص رقم کی ادائیگی سے بہت بڑی مقدار میں رزق دستیاب ہو جاتا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہی وہ مرحلہ ہے جسے بغیر کسی حساب کے رزق سے تعبیر کیا گیا ہے اسے اطاعت کا نقطۂ عروج کہا جا سکتا ہے جہاں رزق کی مقدار عام انسانی اندازوں سے کہیں زیادہ ہو جاتی ہے۔

Marfat.com

باب ۷

# رزق کی بستگی کے قوانین

رزق کی کشاد کے قوانین کے تحت پچھلے باب میں اس امر پر بحث کی جا چکی ہے کہ ازروئے قرآن چند بنیادی قوانین ایسے ہیں جن پر عمل کے نتیجے میں رزق کی افراط ممکن ہے لیکن ان قوانین پر عمل اگر ایمان کے ساتھ کیا جائے تو دنیا اور آخرت دونوں کی فلاح حاصل ہوتی ہے اسی لیے مومنین کو حاصل ہونے والے رزق کو متمیز کر کے رزق کریم پکارا گیا۔ لیکن اگر ان قوانین پر عمل بغیر ایمان کے ہو تو دنیاوی منفعت تو یقیناً حاصل ہو جائے گی لیکن اخروی ناکامی مقدر ہو جائے گی۔

تاہم جہاں تک رزق کی بستگی کا تعلق ہے یہاں کوئی تفریق نہیں ہے کوئی بھی شخص خواہ وہ اہل ایمان ہو یا ایمان کی دولت سے محروم ہو جب احکام الٰہی سے انحراف کرے گا یا روگردانی کرے گا تو دونوں کو یکساں نوعیت کی تباہی کا سامنا کرنا ہوگا۔ بالفاظِ دیگر صرف ایمان بغیر اعمال صالح کے کسی کام کا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں بارہا ایمان کے ساتھ اعمال صالح کی شرط عائد کی گئی ہے۔

دوسری طرف یہ امر بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ رزق کی بستگی یا معیشت کی تنگی ہی قوموں کے زوال کی سب سے اہم وجہ ہوتی ہے۔ دنیا کی کسی بھی قوم خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی اس کے زوال کا تجزیہ کیجیے سب سے بنیادی وجہ بہرحال معاشی عوامل میں ہی ملے گی۔ لہٰذا قوموں کے زوال میں بالخصوص معاشی عوامل سب سے زیادہ اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ یہی وہ بنیادی سبب ہے جس کی وجہ سے جب قرآن مجید قوموں کے زوال کا پورا عمل یا کلیہ بیان کرتا ہے تو اس میں اوّل آخر اساسی اہمیت معاشی عوامل کو دیتا ہے۔ ازروئے قرآن قوموں کے زوال کا پورا عمل اس طرح انجام پاتا ہے۔

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَاۤ اِلٰۤى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ۝ فَلَوْ لَاۤ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا وَ لٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۝ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ حَتّٰۤى اِذَا فَرِحُوْا بِمَاۤ اُوْتُوْۤا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ۝ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۶/۴۲-۴۵)

اور ہم نے آپ سے پہلے بہت سی امتوں میں (اپنے رسول) بھیجے پھر (ان کے انکار پر) ہم نے انہیں سختی اور تکلیف میں مبتلا کیا تا کہ وہ عاجزی (اختیار) کریں سو جب ان کو ہماری سزا پہنچی تو انہوں نے عاجزی کیوں نہیں اختیار کی؟ لیکن (ہوا یہ کہ) ان کے دل (اور بھی) سخت ہو گئے اور شیطان نے ان کے لیے وہ کام خوشنما بنا دیا جو وہ کیا کرتے تھے پھر جب وہ اس نصیحت کو بھول گئے جو انہیں کی گئی تھی تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کشادہ کر دیئے گئے یہاں تک کہ ان چیزوں پر جو ان کو ملیں تھیں خوب خوش ہو گئے (اترانے لگے) تو ہم نے ان کو دفعتاً پکڑ لیا اس وقت وہ مایوس ہو کر رہ گئے پھر ہم نے ظالموں کی جڑ تک کاٹ دی اور تمام تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے۔

قرآن مجید کی متذکرہ بالا آیات میں قوموں کے زوال کے مختلف مراحل کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ مراحل مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ احکام خداوندی سے انحراف: پہلا مرحلہ۔

۲۔ انبیاء کی بعثت: دوسرا مرحلہ۔

۳۔ مرحلۂ سزا: تیسرا مرحلہ۔

۴۔ قلوب پر مہر: چوتھا مرحلہ۔

۵۔ کھلی نافرمانی اور معیشت کی افراط: پانچواں مرحلہ۔

۶۔ مکمل تباہی: چھٹا مرحلہ۔

ان مراحل کی انفرادی وضاحت مندرجہ ذیل ہے:

## ا۔ احکام خداوندی سے انحراف: پہلا مرحلہ

جس طرح روسو نے کہا تھا کہ ہر انقلاب کا آغاز سرگوشی سے ہوتا ہے اسی طرح ہر تباہی کا آغاز لازمی طور پر ظلم سے ہوتا ہے۔ ظلم سے مراد کسی بھی شے کو اس کے اصل مقام سے ہٹا دینا ہے۔ ظلم میں ہر قسم کی ناانصافی، دھاندلی، استبداد، جبر، حق پر ڈاکہ ڈالنا، زیادتی، واجبات کی عدم ادائیگی، حدود فراموشی، استحصال اور ناجائز تصرفات شامل ہیں۔ قرآن مجید میں کئی افعال کو ظلم کہا گیا ہے جن میں سے چند اہم مندرجہ ذیل ہیں۔

i۔ یتیموں کا مال ناجائز طریقے سے کھانا ظلم ہے۔ (۴/۱۰)

ii۔ وحی کو افتراء کہنا ظلم اور جھوٹ ہے۔ (۷/۳۷)(۲۵/۴)

iii۔ دوسروں کا مال باطل طریقوں سے کھانا ظلم ہے۔ (۴/۳۰)

iv۔ غرباء کا استحصال ظلم ہے۔ (۳۸/۲۴)

v۔ اللہ تعالیٰ کے احکامات میں تحریف ظلم ہے۔ (۲/۵۹)(۷/۱۶۲)

vi۔ دنیاوی زندگی کے مفاد کو مقصود و منتہا جان لینا ظلم ہے۔ (۳/۱۱۶)

vii۔ تن آسانی/آسائشات کی ہوس ظلم ہے۔ (۱۱/۱۱۶)

viii۔ وحی کی مخالفت ظلم ہے۔ (۷/۳۷)، (۷/۱۰۳)، (۱۰/۱۷)، (۱۷/۴۷)، (۲۱/۳)

ix۔ غیر اللہ کی محکومیت اختیار کرنا ظلم ہے۔ (۳۷/۲۲۔۲۳)

x۔ اپنی بات خدا سے منسوب کر دینا ظلم ہے۔ (۳/۹۳)، (۶/۲۱)، (۶/۹۴)، (۷/۳۷)

xi۔ شرک سب سے بڑا ظلم ہے۔ (۳۱/۱۳)

Marfat.com

xii۔ تکذیب احکام خداوندی ظلم ہے۔ (۶/۱۵۸)،(۳۹/۳۲)

xiii۔ اللہ سے حاصل ہونے والا علم چھپانا ظلم ہے۔ (۲/۱۴۰)

xiv۔ اختلافات پیدا کرنا ظلم ہے۔ (۴۳/۶۵)

xv۔ اللہ کی حدود سے تجاوز کرنا ظلم ہے۔ (۲/۲۲۹)

xvi۔ قانون مکافات عمل سے انکار ظلم ہے۔ (۲/۲۵۴)

xvii۔ منافقت ظلم ہے۔ (۲۴/۴۹۔۵۰)

xviii۔ احکام الٰہی کا استہزاء ظلم ہے۔ (۶/۶۸)

xix۔ جرم سے زیادہ سزا دینا ظلم ہے۔ (۶/۱۶۱)

xx۔ دوسروں کو راہ خدا سے روکنا، اس میں کجی تلاش کرنا ظلم ہے۔ (۱۱/۱۸۔۱۹)

xxi۔ کسی مربی سے خیانت ظلم ہے۔ (۱۲/۲۳)

xxii۔ غلط شہادت دینا ظلم ہے۔ (۵/۱۰۷)

xxiii۔ شیطان کے پھیلائے ہوئے جال میں آ جانا ظلم ہے۔ (۷/۲۳)

نہ صرف متذکرہ بالا بلکہ اس کے علاوہ بھی متعدد افعال کو قرآن مجید میں ظلم قرار دیا گیا ہے۔ ایک معاشرہ یا قوم جب زوال کی جانب مائل ہو جاتی ہے تو اس کی ابتدا ظلم کے فروغ سے ہوتی ہے۔ متذکرہ بالا افعال میں سے کوئی ایک یا زائد بتدریج معاشرے میں فروغ پانا شروع ہو جاتے ہیں۔ جس سے معاشرتی توازن آہستہ آہستہ بگڑنے لگتا ہے۔ اس صورتِ حال کی اصلاح کے لیے انبیاء مبعوث کیے جاتے رہے ہیں۔ جن کا بنیادی مقصد اس معاشرتی عدم توازن کی اصلاح ہوتا تھا جو انسانوں کا پیدا کردہ ہوتا تھا۔

## ۲۔ انبیاء کی بعثت: دوسرا مرحلہ

انبیاء کی بعثت کا بنیادی مقصد اس معاشرتی عدم توازن کی اصلاح اور اسے پھر سے بحال کرنا ہوتا تھا تاکہ جو معاشرہ مائل بہ زوال ہو چکا ہے اس کے اس پستی میں جانے کے

Marfat.com

عمل کو روکا جائے اور نہ صرف یہ کہ روکا جائے بلکہ اس کا توازن بحال کر کے اسے پھر عروج کی جانب گامزن کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام انبیاء کی تعلیمات کا نقطۂ ماسکہ اللہ کی وحدانیت کو تسلیم کروانا اور اعمال صالحہ کی جانب راغب کروانا رہا ہے۔ قرآن مجید میں مذکور تمام انبیاء کی تعلیمات کا تجزیہ کیجیے ان کا محور یہی دو نکات ہیں اس سے ماسوا کچھ نہیں۔ کیونکہ کسی بھی معاشرے کا توازن انہی دو نکات پر استوار ہوتا ہے۔ اگر معاشرتی توازن ان دونوں نکات پر استوار ہو تو معاشرہ یا قوم کی دنیا اور آخرت دونوں سنور جاتی ہے اور اگر صرف ثانی الذکر پر استوار ہو تو صرف دنیا سنورتی ہے۔

انبیاء کی بعثت کا مقصد بنیادی طور پر یہی ہوتا تھا کہ لوگ اپنے افعال سے رجوع کریں۔ اللہ کے حضور توبہ کریں اور اعمال صالح کے رخ پر واپس آ جائیں۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّبِيٍّ اِلَّآ اَخَذْنَآ اَهْلَهَا بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَضَّرَّعُوْنَ ۝ (۷/۹۴)

اور ہم نے کسی بستی میں کوئی نبی نہیں بھیجا کہ وہاں کے رہنے والوں کو ہم نے سختی اور تکلیف میں نہ پکڑا ہوتا کہ وہ اللہ کی طرف رجوع کریں۔

یہاں یہ واضح رہے کہ یہ سختی اور تکالیف بھی منجانب اللہ نہیں ہوتی تھیں بلکہ خود ان کے اپنے منفی اعمال کا نتیجہ ہوتی تھیں۔ اللہ کسی پر ظلم نہیں کرتا حتیٰ کہ ذرہ برابر ظلم کا تصور بھی اس سے منسوب ہونا ممکن نہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ (۴/۴۰)

بے شک اللہ کسی پر ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا۔

اللہ انسانوں پر ظلم نہیں کرتا (۱۰/۴۴) نہ صرف انسان بلکہ وہ کسی پر بھی ظلم نہیں کرتا۔ (۱۸/۴۹) کیونکہ خدا کے فیصلے حق کے ساتھ ہوتے ہیں کسی پر ظلم نہیں ہوتا۔ (۲/۲۸۱)، (۳/۲۴)، (۶/۱۶۱)، (۱۰/۴۷)، (۱۰/۵۴)، (۳۹/۶۹)۔

Marfat.com

لہٰذا یہ سختی اور تکلیف خود اس بستی کے رہنے والوں کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتی تھی۔ اللہ کے رسول تو ان کے لیے رحمت بن کر آتے تھے تا کہ انہیں ان سختیوں اور مشکلات سے نجات دلوائیں جن میں وہ خود اپنے اعمالِ بد کی وجہ سے گرفتار ہوتے تھے ان کی تعلیمات کا بنیادی محور ہی یہ ہوتا تھا کہ لوگ بدی کے چنگل سے نکلیں اور اللہ کی طرف رجوع کریں تا کہ ان پر رحمتوں کے دروازے کھل جائیں جیسا کہ حضرت نوح علیہ السلام نے کہا:

فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ إِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًاۙ يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًاۙ وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا ؕ (۷۱/۱۰-۱۲)

اور کہا اپنے رب سے استغفار کرو وہ یقیناً معاف کرنے والا ہے وہ تم پر آسمان سے مینہ برسائے گا اور مال اور بیٹوں سے تمہاری مدد فرمائے گا اور تمہیں باغ عطا کرے گا اور (ان میں) تمہارے لیے نہریں بہادے گا۔

لہٰذا بعثت انبیاء کا بنیادی مقصد لوگوں کو ظلم کے اندھیرے سے نکال کر حق کے نور کی طرف لانا ہوتا ہے تا کہ وہ اللہ پر ایمان لے آئیں اور اس کے نتیجے میں ان پر آسمان اور زمین کی برکتوں کے دروازے کھول دیئے جائیں۔

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (۷/۹۶)

اگر ان بستیوں کے لوگ ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکات (کے دروازے) کھول دیتے مگر انہوں نے تکذیب کی سو ان کے اعمال کی سزا میں ہم نے ان کو پکڑ لیا۔

تاہم یہ بھی اللہ کی بین سنت ہے کہ کسی بستی کو اس وقت تک گرفت میں نہیں لیا جاتا جب تک کہ کوئی رسول اس بستی میں اصلاح احوال کے لیے نہیں بھیج دیا جاتا۔

وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ؁ (۱۷/۱۵)

اور ہم (کسی قوم کو) عذاب میں مبتلا نہیں کرتے جب تک کسی رسول کو (ان میں) نہیں بھیج لیتے۔

اللہ کی یہ سنت ہر تباہ ہونے والی بستی کے ساتھ رہی ہے۔

وَ مَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا لَهَا مُنْذِرُوْنَ ۝ ذِكْرٰى وَ مَا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ (۲۶/۲۰۸-۲۰۹)

اور ہم نے کوئی بستی ہلاک نہیں کی جس میں ہماری طرف سے ڈرانے والے نہ ہوئے ہوں (تاکہ) نصیحت (کردیں) اور ہم ظالم نہیں ہیں۔

یہاں ایک بنیادی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آنحضرت (ﷺ) تک تو اللہ کی سنت رہی کہ جب کسی بستی/قوم میں ظلم کا چلن عام ہو گیا تو اس بستی یا قوم میں اللہ اپنے رسولوں کو مبعوث فرماتا رہا ہے لیکن اب جب کہ آنحضرت (ﷺ) کے بعد باب نبوت مکمل طور پر بند ہو گیا ہے اب کوئی نبی کبھی نہیں آئے گا اب اس صورتِ حال میں جب کوئی قوم ظلم پر آمادہ ہو جائے اور اس میں ظلم کی روش عام ہو جائے تو اس کا کیا حل ہوگا؟

اس کا حل سیدھا سیدھا متذکرہ بالا آیات (۶/۴۲-۴۵) میں بیان کر دیا گیا ہے۔ آیت کے ابتدائی الفاظ پر غور کیجئے "و لقد ارسلنا الی امم من قبلک" (اور ہم نے آپ سے پہلے بہت سی امتوں میں رسول بھیجے) یعنی یہ سنت رسول اللہ (ﷺ) تک تھی آپ (ﷺ) کے بعد اب صرف اور صرف قرآن مجید ہی یہ فریضہ انجام دے گا۔ اس ام الکتاب میں افراد و اقوام کے لیے رہنمائی کے تمام جملہ اصول و قوانین مجتمع کر دیئے گئے ہیں جس کو راہ ہدایت چاہیئے وہ قرآن مجید سے رجوع کر سکتا ہے۔ یہ ایک طرح سے انسان کے شعور کی بلوغت پر اللہ کے اعتماد کا مظہر ہے۔ اب قرآن مجید فرقان حمید کی شکل میں سرچشمۂ نور انسانیت کے حوالے کر دیا گیا ہے لہٰذا اب انبیاء کی بعثت کی ضرورت باقی نہیں رہی ہے۔

Marfat.com

## مرحلۂ سزا: تیسرا مرحلہ

جیسا کہ عرض کیا گیا بعثت انبیاء کا مقصد لوگوں کی اصلاح تھا لیکن متذکرہ بالا آیت (۷/۹۶) میں خود اللہ تعالیٰ نے گواہی دی کہ بستیوں کے رہنے والوں نے انبیاء کی تکذیب کی تو انہیں اس کی سزا بھی دی گئی۔ جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تذکرہ مبارکہ میں ارشاد ربانی ہے۔

وَ لَقَدْ اَخَذْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِيْنَ وَ نَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ○ (۷/۱۳۰)

ہم نے آل فرعون کو قحطوں اور میووں کے نقصان میں پکڑا تا کہ وہ نصیحت حاصل کریں۔

صرف قحط اور میووں کے نقصان ہی کی شکل میں نہیں بلکہ دیگر کئی شکلوں میں بھی آل فرعون پر عذاب آیا۔ یہ اللہ کی کھلی ہوئی نشانیاں تھیں مگر آل فرعون نے اپنے تکبر کی وجہ سے انکار ہی کیا۔

فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ فَاسْتَكْبَرُوْا وَ كَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ (۷/۱۳۳)

تو ہم نے ان پر طوفان اور ٹڈیاں اور جوئیں اور مینڈک اور خون کتنی کھلی ہوئی نشانیاں بھیجیں مگر وہ تکبر ہی کرتے رہے وہ مجرم قوم تھی۔

اس مرحلے پر اگر اس باب کے ابتداء میں دی گئی آیات کریمہ (۶/۴۲-۴۵) پر تدبر کیا جائے تو یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ اس تیسرے مرحلے میں لوگوں کے اپنے منفی اعمال کے جو برے نتائج سامنے آتے ہیں انہیں قرآن مجید میں عذاب نہیں کہا گیا انہی آیات کریمہ کے الفاظ پر غور کیجیے بالباساء (سختی) اور والضراء (تکلیف) کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں اسی طرح متذکرہ بالا آیات (۷/۱۳۰) اور (۷/۱۳۲) میں آنے

والی مختلف اقسام کی منفی صورت حال کے لیے بھی عذاب کا لفظ استعمال نہیں ہوا ہے۔ باالفاظِ دیگر یہ حتمی تباہی سے پہلے قوموں کو پیش آنے والے وہ مصائب اور تکالیف ہیں جو ان کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ لیکن یہ حتمی تباہی نہیں ہوتی ان کی حیثیت ایک الارم کی سی ہوتی ہے تا کہ اگر قلب ونظر یا فہم وفراست میں زندگی کی کوئی امید یا کوئی بھی کرن باقی ہو تو قوم اس وارننگ کو سمجھے اور اللہ کی جانب رجوع کرے لیکن اگر کوئی قوم ایسا نہیں کرتی باالفاظِ دیگر وہ خود اپنی واپسی کے تمام دروازے بند کر لیتی ہے پھر ایسی اقوام کے قلب پر مہر لگا دی جاتی ہے۔

## قلوب پر مہر: چوتھا مرحلہ

اگر کسی قوم کے اعمال بد اپنی انتہا کو پہنچ جائیں تو پھر ان کے قلب پر مہر لگا دی جاتی ہے باالفاظِ دیگر سینوں میں موجود دل اندھے ہو جاتے ہیں۔

اَفَلَمۡ یَسِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ فَتَکُوۡنَ لَہُمۡ قُلُوۡبٌ یَّعۡقِلُوۡنَ بِہَاۤ اَوۡ اٰذَانٌ یَّسۡمَعُوۡنَ بِہَا فَاِنَّہَا لَا تَعۡمَی الۡاَبۡصَارُ وَ لٰکِنۡ تَعۡمَی الۡقُلُوۡبُ الَّتِیۡ فِی الصُّدُوۡرِ (۲۲/۴۶)

کیا ان لوگوں نے زمین میں سیر وسیاحت نہیں کی جو ان کے دل ان باتوں کو سمجھنے والے ہوتے یا کانوں سے ہی ان (واقعات) کو سن لیتے، بات یہ ہے کہ صرف آنکھیں ہی اندھی نہیں ہوتیں بلکہ وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔

یہ اس مرحلے پر پہنچ جاتے ہیں جہاں ان کے لیے نصیحت کرنا یا نہ کرنا سب ایک برابر ہو جاتا ہے ان کے کان سننے سے اور قلب سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہو جاتے ہیں۔

خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوۡبِہِمۡ وَ عَلٰی سَمۡعِہِمۡ ؕ وَ عَلٰۤی اَبۡصَارِہِمۡ غِشَاوَۃٌ ۫ وَّ لَہُمۡ عَذَابٌ عَظِیۡمٌ ٪ (۲/۷)

Marfat.com

اللہ نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا رکھی ہے ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔

یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن کے اپنے اعمال ان کے لیے واپسی کے تمام راستے مقفل کر دیتے ہیں۔

صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ (۲/۱۸)

(یہ) بہرے، گونگے، اندھے ہیں وہ (سیدھی راہ کی طرف) لوٹ ہی نہیں سکتے۔

یہی وجہ تھی کہ آل فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا:

وَقَالُوْا مَهْمَا تَاْتِنَا بِهٖ مِنْ اٰيَةٍ لِّتَسْحَرَنَا بِهَا فَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ (۷/۱۳۲)

اور کہنے لگے کہ تم ہمارے پاس (خواہ) کوئی سی نشانی لاؤ تا کہ اس سے ہم پر جادو کرو مگر ہم تم پر ایمان لانے والے نہیں۔

جب کوئی قوم نافرمانی کی اس حد تک پہنچ جاتی ہے جہاں وہ اللہ کو سرے سے بھلا دیتی ہے تو اللہ بھی ایسی قوم کو بھلا دیتا ہے اور اسے مکمل طور پر شیطان کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا ہے نہ صرف یہ بلکہ معیشت کے دروازے بھی کشادہ کر دیئے جاتے ہیں۔

## ۵۔ کھلی نافرمانی اور معیشت کی افراط: پانچواں مرحلہ

وہ آیات جن سے یہ بحث مستنبط ہے یعنی (۶/۴۲-۴۵) ان پر مزید تدبر سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ جب افراد و اقوام اس مرحلے پر پہنچ جائیں جب وہ عقل و شعور اور فہم و تدبر کے تمام دروازے اپنے اوپر بند کر لیں بالفاظِ دیگر نور حق سے مکمل ناطہ توڑ لیں تو دوسرا راستہ صرف شیطانی راہوں کا ہی رہ جاتا ہے۔ شیطان ان کے شیطانی افعال کو مزید آراستہ کر کے دکھاتا ہے اور وہ مکمل شیطانی رنگ میں رنگ جاتے ہیں۔ مزید برآں اللہ تعالیٰ کی

Marfat.com

جانب سے ان پر معیشت کے دروازے بھی کھول دیئے جاتے ہیں۔ یہ محض اتمام حجت کی خاطر ہوتا ہے کیونکہ اس کے بعد مکمل تباہی ان کا مقدر ہوتی ہے۔

وَ اِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا (۱۷/۱۶)

اور جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنے کا فیصلہ کر لیتے ہیں تو (پہلے) ہم اس کے آسودہ حال لوگوں کو (نیکی کا) حکم دیتے ہیں جس پر وہ (الٹا) اس بستی میں نافرمانی کی راہ اختیار کر لیتے ہیں پھر ان پر حجت تمام ہو جاتی ہے پھر ہم اسے پوری طرح برباد کر دیتے ہیں۔

اس آیت سے یہ حقیقت مترشح ہوتی ہے کہ جب کسی قوم کا طبقہ اشرافیہ اس صحیح راستے کو چھوڑ کر جو واضح طور پر ان کے سامنے آ چکا ہوتا ہے غلط راہوں کا انتخاب کر لیتا ہے تو وہ قوم بالکلیۃً تباہی کی مستوجب ہو جاتی ہے اور انہیں اس طرح ہلاک کر دیا جاتا ہے کہ ان کا نام بھی داستانوں میں نہیں ملتا۔

اس حقیقت کا اعادہ سورۃ الاعراف میں اس انداز میں کیا گیا ہے۔

ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الْحَسَنَةَ حَتّٰى عَفَوْا وَّ قَالُوْا قَدْ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَ السَّرَّآءُ فَاَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً وَّ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ (۷/۹۵)

پھر ہم نے تکلیف کو آسودگی میں بدل دیا یہاں تک کہ (مال و اولاد میں) زیادہ ہو گئے تو کہنے لگے کہ اسی طرح کا رنج و راحت ہمارے بڑوں کو بھی پہنچتا رہا ہے تو ہم نے ان کو ناگہاں پکڑ لیا اور ان کو خبر بھی نہ تھی۔

یہاں یہ امر بھی ذہن میں رکھیئے کہ اس شیطانی چکر میں صرف طبقۂ اشرافیہ ہی ملوث نہیں ہوتا بلکہ پوری پوری قوم سر تا پا اس میں ملوث ہوتی ہے، مثلاً قوم نوح کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ وہ اندھی قوم تھی (۷/۶۴) ایک دوسرے مقام پر کہا گیا کہ وہ بلا شبہ قوم بد تھی

Marfat.com

(۷۷/۲۱) سورۃ الشعرا میں کہا گیا کہ ان میں سے اکثر ایمان لانے والے نہیں تھے (۱۲۱/۲۶) اسی طرح قوم عاد کے متعلق سورۃ الھود میں کہا گیا کہ قوم عاد پر پھٹکار ہے۔ (۶۰/۱۱) اسی طرح قوم ثمود کے متعلق کہا گیا کہ انہوں نے اپنے رب کی نافرمانی کی، قوم ثمود پر اللہ کی پھٹکار ہے (۶۸/۱۱)۔ یہی صورتِ حال قوم لوط کے ساتھ بھی تھی پوری کی پوری قوم امرد پرستی کا شکار ہو چکی تھی لہٰذا تباہی پوری قوم کا مقدر بنی (۸۳-۶۹/۱۱)۔ یہی صورتِ حال قوم مدین کے ساتھ بھی تھی جس طرح ثمود پر پھٹکار تھی اسی طرح ان پر بھی بہ حیثیت قوم اللہ کی پھٹکار ہے (۹۵/۱۱)۔ اور ٹھیک یہی صورتِ حال بنی اسرائیل کے ساتھ بھی تھی۔ لہٰذا جب پوری پوری قومیں تباہی کی راہ اختیار کر لیں تو پھر مکمل تباہی ان کا انجام ہوتی ہے۔

## مکمل تباہی: چھٹا مرحلہ

زوال کے اس عمل کا آغاز جس کی ابتدا احکام خداوندی سے انحرافات کی شکل میں ہوتی ہے۔ متذکرہ بالا مراحل سے گذر کر اپنے منطقی انجام یعنی مکمل تباہی پر ختم ہوتا ہے۔

متذکرہ بالا آیات (۴۵-۴۲/۶) کی رو سے جس وقت قومیں اپنی بداعمالیوں کے نشے میں پوری طرح بدمست ہو جاتی ہیں معیشت کی افراط سے تکبر اپنی انتہا کو پہنچتا ہے تو اللہ کے عذاب کا کوڑا اپنی پوری شدت سے برستا ہے اور ان بدمستوں کو تاریخ میں عبرت کا نشان بنا دیتا ہے۔

وَ كَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ عَتَتْ عَنْ اَمْرِ رَبِّهَا وَ رُسُلِهٖ فَحَاسَبْنٰهَا حِسَابًا شَدِيْدًا وَّ عَذَّبْنٰهَا عَذَابًا نُّكْرًا ○ فَذَاقَتْ وَبَالَ اَمْرِهَا وَ كَانَ عَاقِبَةُ اَمْرِهَا خُسْرًا ○ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰۤاُولِي الْاَلْبَابِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا (۱۰-۸/۶۵)

اور بہت سی بستیوں (کے رہنے والوں) نے اپنے رب اور اس کے رسولوں

Marfat.com

کے احکامات سے سرتابی کی تو ہم نے بھی ان کو سخت حساب میں پکڑ لیا اور انہیں عذاب دیا ان دیکھا (سخت) عذاب۔ پس انہوں نے اپنے کرتوتوں کا مزا چکھ لیا اور ان کا انجام نقصان ہی تھا۔ ان کے لیے اللہ نے سخت عذاب تیار کر رکھا ہے پس اے ارباب دانش جو ایمان لائے ہو اللہ سے ڈرو یقیناً اللہ نے تمہاری طرف نصیحت اتاری ہے۔

یہ ظاہر ہے ان کے اپنے اعمال کا بدلہ ہوتا ہے وہ جس چیز کا مذاق اڑایا کرتے تھے وہی شے ان کو چاروں طرف سے گھیر لیتی ہے۔

فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ
(۱۶/۳۴)

تو ان کو ان کے اعمال کے برے بدلے ملے اور جس چیز کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے اس نے ان کو ہر طرف سے گھیر لیا۔

ان کی دنیا بھی برباد ہوتی ہے اور آخرت تو اس سے سوا برباد ہوگی۔

قَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَاَتَى اللّٰهُ بُنْيَانَهُمْ مِّنَ الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَيْهِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَاَتٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُخْزِيْهِمْ وَيَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تُشَآقُّوْنَ فِيْهِمْ قَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اِنَّ الْخِزْيَ الْيَوْمَ وَالسُّوْٓءَ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۙ
(۱۶/۲۶-۲۷)

ان سے پہلے لوگوں نے بھی (ایسی ہی) مکاریاں کی تھیں تو خدا (کا حکم) ان کی عمارت کے ستونوں پر آ پہنچا اور چھت ان کے اوپر سے گر پڑی اور (ایسی طرف سے) ان پر عذاب واقع ہوا جہاں سے ان کو خیال بھی نہ تھا۔ پھر وہ ان کو قیامت کے دن بھی ذلیل کرے گا اور کہے گا کہ میرے وہ شریک کہاں

Marfat.com

ہیں جن کے بارے میں تم جھگڑا کرتے تھے؟ جن لوگوں کو علم دیا گیا تھا وہ یہ
کہیں گے کہ آج کافروں کی رسوائی اور برائی ہے۔

اس طرح ایسی اقوام کے لیے جو اللہ کے احکامات سے لاپرواہی برتتی ہوں ان کی دنیا اور آخرت دونوں برباد ہو جاتے ہیں۔

قوموں کے زوال کے اس پورے عمل کے پس منظر میں ابتدائی مرحلے میں رزق کی بستگی اور اگلے مرحلے میں معاشی تباہی کے نتیجے میں پوری اقوام کی تباہی کن قوانین کے تحت ہوتی ہے ان کا تجزیہ مندرجہ ذیل ہے۔

قوانین کے بیان سے قبل یہ حقیقت ذہن میں رکھنا لازمی ہے کہ ان قوانین میں سے ابتدائی دو قوانین زوال کے ابتدائی مرحلے سے متعلق ہیں جب قومیں احکام خداوندی کو نظر انداز کرنا شروع کرتی ہیں یہی وجہ ہے کہ ان دو قوانین میں جو افعال بیان کیے گئے ہیں ان کے نتیجے میں صرف معیشت تنگ ہوتی ہے تباہ نہیں ہوتی جبکہ بقیہ قوانین کا تعلق زوال کے پانچویں مرحلے یعنی افراطِ معیشت کے دور سے ہے۔ تاہم یہ کوئی حتمی حد بندی نہیں ہے۔ قوموں کے عروج و زوال کا مظہر کوئی سادہ مظہر نہیں ہوتا یہ ایک انتہائی پیچیدہ اور گنجلک عمل ہوتا ہے جو بے شمار عوامل کے عمل اور ردعمل کا نتیجہ ہوتا ہے۔ تاہم جس طرح کسی پیچیدہ مظہر کو سمجھنے کے لیے مختلف مفروضات کا سہارا لیا جاتا ہے بالکل اسی طرح یہاں یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ ابتدائی دو قوانین ابتدائی دور اور بقیہ کا تعلق معیشت کی افراط کے دور سے ہے۔ یہ محض تجزیے میں آسانی کی خاطر ہے اس سے زائد نہیں۔ بعض عوامل ایسے ہوتے ہیں جو طویل المعیاد اثرات کے حامل ہوتے ہیں مثلاً ربوٰ یا ناجائز اور حرام مال کھانا۔ یہ عوامل ممکنہ طور پر ابتدائی مرحلے میں شروع ہو کر اپنے حتمی منفی نتائج آخری مرحلے میں ظاہر کریں یا یہ بھی ممکن ہے کہ ابتدائی مرحلے میں ہی ان کے اثرات سامنے آنا شروع ہو جائیں۔ جبکہ بعض عوامل ایسے ہوتے ہیں جو فوری نتائج پیدا کرتے ہیں مثلاً تکبر اور جاہ پسندی وغیرہ۔ اس

حوالے سے باغ والے اصحاب جن کا تذکرہ سورۃ القلم آیات ۱۷ تا ۳۲ میں کیا گیا ہے اور قارون کی مثال قابل ذکر ہے۔ لہٰذا رزق کی بستگی ان تمام عوامل کا نتیجہ ہوتی ہے جن کا ذیل میں تذکرہ کیا جارہا ہے تاہم نتائج مرتب ہونے کی بابت کوئی حتمی نتیجہ بیان کرنا ممکن نہیں ہے۔ یہ صورتِ حال اس وقت اور بھی پیچیدہ ہو جاتی ہے جب یہ دیکھا جائے کہ اس حوالے سے کبھی کوئی سائنسی مطالعہ یا اسٹڈی سرے سے کی ہی نہیں گئی مستقبل جو یقیناً مسلمانوں کا ہے اس حوالے سے جب مطالعات کیے جائیں گے تو ان عوامل اور عوامل کے نتائج اور اس کے دورانیے کی بابت مستقبل کا قرآن کا طالب علم زیادہ یقین اور حتمی انداز میں کہنے کی پوزیشن میں ہوگا۔ فی الوقت اس حوالے سے صرف اندازے سے بات کی جاسکتی ہے اس سے زیادہ نہیں۔

## پہلا قانون: اللہ کے ذکر سے اعراض سے معیشت تنگ ہو جاتی ہے

رزق کی بستگی کے حوالے سے سب سے پہلا اور بنیادی قانون یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے چند مخصوص قوانین سے اعراض برتنے سے معیشت تنگ ہو جاتی ہے اور یہ نتیجہ انفرادی اور اجتماعی دونوں سطح پر یکساں ہوتا ہے۔

> وَ مَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیْشَةً ضَنْكًا وَّ نَحْشُرُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَعْمٰی (۱۲۵/۲۰)
>
> جو میرے ذکر سے اعراض کرے گا اس کی معیشت تنگ ہو جائے گی اور (روزِ) قیامت اسے ہم اندھا اٹھائیں گے۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ ذکر قرآن مجید کی ایک کثیر المعانی اصطلاح ہے خود قرآن مجید کو بھی ذکر کہا گیا ہے (۱۱/۸۰)۔ اس پس منظر میں متذکرہ بالا آیت (۱۲۵/۲۰) میں یہ بنیادی اصول بیان کیا گیا کہ ذکر سے اعراض سے معیشت تنگ ہو جاتی ہے تو اس سے مراد بدیہی طور پر وہ قوانین ہیں جن کا اس حوالے سے قرآن مجید میں تذکرہ کیا گیا ہے۔

Marfat.com

باالفاظِ دیگر قرآن مجید میں ایسے قوانین موجود ہیں جن سے اعراض کے نتیجے میں معیشت تنگ ہوجاتی ہے۔ اس حوالے سے سب سے بنیادی قانون غیر مکتسب آمدنی (unearned income) کا حصول ہے۔ اس کے نتیجے میں دنیا اور آخرت دونوں تباہ ہوجاتی ہیں۔ غیر مکتسب آمدنی یعنی کوئی بھی ایسی آمدنی جو انسانی محنت کا نتیجہ نہ ہو باالفاظِ دیگر ربا سے حاصل ہونے والی آمدنی۔ اس قسم کی آمدنی انفرادی اور اجتماعی دونوں سطح پر سوائے تباہی کے اور کچھ نہیں لاتی۔ اس قسم کی آمدنی کے دنیاوی اور اخروی تباہ کن نتائج کے تجزیے کے لیے قرآن مجید کی اس آیتِ کریمہ کو زیرِ بحث لانا ضروری ہے جس میں یہ حکم دیا گیا ہے۔ یہ آیت مندرجہ ذیل ہے۔

اَلَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا کَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ؕ ذٰلِکَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰی فَلَهٗ مَا سَلَفَ ؕ وَاَمْرُهٗٓ اِلَی اللّٰهِ ؕ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲/۲۷۵﴾

جو لوگ ربا (سود) کھاتے ہیں وہ (بالکل) اسی طرح کھڑے ہوتے ہیں جس طرح وہ شخص کھڑا ہوتا ہے جس پر شیطان (سانپ) کا سخت حملہ ہوا ہو یہ اس وجہ سے ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ (خرید و) فروخت (بھی تو) بالکل سود کی طرح ہے حالانکہ اللہ نے (خرید و) فروخت کو حلال کیا ہے اور ربا (سود) کو حرام قرار دیا ہے تو جس شخص کے پاس اللہ کی نصیحت پہنچی اور وہ باز آ گیا تو جو پہلے ہو چکا اس کا معاملہ اللہ کے سپرد اور جو پھر لینے لگا تو ایسے لوگ دوزخی ہیں جس میں وہ ایک (بہت) طویل مدت رہیں گے۔

اس آیت میں امتناعِ ربا کے حوالے سے متعدد پہلوؤں پر تدبر لازمی ہے جو مندرجہ

Marfat.com

ذیل ہیں۔

۱۔ اوّل یہ کہ اس آیت میں خطاب پوری نوع انسانی سے ہے کسی خاص گروہ یا افراد سے نہیں۔ آیت کے ابتدائی الفاظ پر غور کیجیے کہ کیا کہا جا رہا ہے۔ ''جو لوگ ربا (سود) کھاتے ہیں''۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی انسان، کہیں بھی، وقت کے کسی بھی لمحے میں جب ربا وصول کرے گا تو اسے اسی انجام سے دوچار ہونا ہوگا جو اس آیت میں بیان کیا گیا ہے۔ گویا اس طرح یہ آیت تمام انسانوں کے لیے بلالحاظ وقت و مقام ایک حتمی کلیہ ہے جس میں کہیں کوئی استثناء نہیں ہے۔

۲۔ اس آیت میں ان لوگوں کو مجرم قرار دیا گیا ہے جو ربا ''وصول'' کرتے ہیں ان کا انجام بتایا ہے جبکہ ان لوگوں کو جو ربا ''ادا'' کرتے ہیں پورے قرآن مجید میں کہیں کچھ نہیں کہا گیا ہے۔ یہ بنیادی طور پر اس وجہ سے ہے کہ ربا ادا کرنے والا ہمیشہ اپنی مجبوری سے ربا ادا کرتا ہے اور مجبور شخص پر کہیں بھی فردِ جرم عائد نہیں ہوتی۔ تاہم اگر ربا ادا کرنے والا بالرضا ایسا کرتا ہے تو یقیناً وہ بھی مجرم گردانا جائے گا اس کی مثال زنا بالجبر اور زنا بالرضا سے دی جاسکتی ہے۔ زنا بالجبر میں عورت مجرم نہیں ہوتی جبکہ زنا بالرضا میں عورت بھی مساوی مجرم ہوتی ہے۔

۳۔ اس آیت میں لفظ ''یقومون'' انتہائی توجہ طلب ہے یہ فعل مضارع ہے۔ عربی میں فعل مضارع حال اور مستقبل دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے باالفاظِ دیگر اس آیت میں ربا خور کا جو انجام بتایا گیا ہے وہ اس کے حال اور مستقبل دونوں پر منطبق ہوتا ہے یعنی اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی وہ اسی انجام سے دوچار ہوگا جو اس آیت میں مذکور ہے۔

لفظ ''یقومون'' کا مادہ ق و م ہے جس کے معنی کی وضاحت چوتھے باب میں کی جاچکی ہے۔ قند مکرر کے طور پر یاد رہے کہ اس کے معنی کھڑا ہونا، متوازن ہونا، کسی معاملے کا اعتدال و توازن پر ہونا، محکم اور استوار ہونا، ثابت اور دائم وغیرہ رہنے کے آتے ہیں۔

Marfat.com

اس آیت میں واضح ہے کہ انسانی شخصیت کا وہ توازن جس پر اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا ہے ربا خوری کے نتیجے میں وہ توازن اس دنیا میں اور آخرت میں بھی دونوں جگہ بُری طرح برباد ہو جاتا ہے اور جیسا کہ چوتھے باب میں وضاحت کی جا چکی ہے انسانی زندگی کا بنیادی مقصد ہی اس توازن کو قائم رکھنا اور اس کا استحکام ہے۔ ربا کے نتیجے میں یہ توازن بری طرح درہم برہم ہو جاتا ہے۔ اس کی وضاحت قرآن مجید نے سانپ کے ڈسنے سے کی ہے۔ عربی محاورے میں شیطان سانپ کو بھی کہتے ہیں جس شخص کو سانپ نے ڈس لیا ہو وہ درد اور تکلیف کی شدت سے ادھ موا تو ہوتا ہی ہے پیاس کی شدت سے الگ مرتا ہے اس حالت میں وہ جتنا بھی پانی پی لے اس کی پیاس نہیں بجھتی۔ یہی حالت رباخور کی بھی ہوتی ہے۔ اس کی ہوس زرا سے کسی پل چین نہیں لینے دیتی۔ وہ ہر وقت ھل من مزید کے چکر میں پڑا رہتا ہے جس کے نتیجے میں نفسیاتی نکتہ نگاہ سے شدید عدم توازن کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ انسان کی اپنی ذات یا نفس پر ظلم کی بدترین مثال ہے۔ ربا کی وجہ سے انسانی سوچ تبدیل ہو جاتی ہے اور رباخور زندگی کے اعلیٰ وارفع مقاصد کی بجائے ایک کہیں کم تر مقصد یعنی محض حصول زر و دولت میں اپنی زندگی برباد کر دیتا ہے۔

ربا کا دوسرا بڑا نقصان یہ ہے کہ یہ "اثم" پیدا کرتا ہے۔ ربا کی آمدنی کے نتیجے میں جو کرب واضطراب پیدا ہوتا ہے اس کا لازمی نتیجہ اضمحلال، افسردگی، ست روی، شکستگی اور توانائی کی کمی کی شکل میں نکلتا ہے اس کی وضاحت اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں کی ہے۔

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَ يُرْبِي الصَّدَقٰتِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ
اَثِيْمٍ ؕ (۲/۲۷۶)

اللہ ربا کو مٹائے گا اور صدقات کو بڑھائے گا اور اللہ کسی کافر اور اثیم کو پسند نہیں کرتا۔

اس آیت میں لفظ اثیم بنیادی اہمیت کا حامل ہے یہ قرآن مجید کی ایک مخصوص

اصطلاح ہے جس کا مادہ ا ث م ہے۔ اس کے بنیادی معنی اضمحلال، پس مردگی، افسردگی، توانائی کا کم ہونا، سست روی اور شکستگی کے ہوتے ہیں۔ اس سے مراد وہ تمام اعمال و افعال ہیں جن سے انسانی ذات میں ضعف و اضمحلال پیدا ہو جائے جن سے اس کی قوت عمل کمزور ہو جائے۔ اس کے لیے قرآن مجید نے خمر اور میسر کی مثال دی ہے جہاں کہا گیا ہے کہ ان میں فائدہ تو ضرور ہے لیکن ان سے انسان کے قوائے عملیہ میں جو اضمحلال پیدا ہوتا ہے اس کے نقصانات اس کے فوائد کے مقابلے میں بہت زیادہ ہیں وَ اِثۡمُهُمَاۤ اَكۡبَرُ مِنۡ نَّفۡعِهِمَا (۲/۲۱۹) خمر (نشہ آور اشیاء) کے اثرات سے کون واقف نہیں ہے جس سے انسان کی قوتیں آہستہ آہستہ مضمحل ہو جاتی ہے اسی لیے جنت کی شراب کے متعلق کہا گیا ہے کہ اس میں تاثیم نہیں ہوگی لَّا لَغۡوٌ فِيۡهَا وَ لَا تَاۡثِيۡمٌ (۵۲/۲۳) یعنی اس سے قوی مضمحل نہیں ہوں گے بلکہ ان کی کمی پوری ہو جائے گی۔

گویا ربا کا لازمی نتیجہ اثم ہے یعنی قوت عمل کی کمزوری اور اگر دیکھا جائے تو یہ شیطان (سانپ) کے ڈسنے (۲/۲۷۵) کا منطقی نتیجہ ہے۔ بالفاظ دیگر وہ لوگ جو ربا کی آمدنی کھا کر شکستگی اور پژمردگی کا شکار ہو جاتے ہیں انہیں خود اللہ تعالیٰ نے کفار کے ساتھ بریکٹ کیا ہے اور واضح طور پر کہا ہے کہ وہ انہیں پسند نہیں کرتا۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ربا کی آمدنی کی انسان کیا قیمت ادا کرتا ہے۔

یہاں یہ امر واضح رہے کہ ربا ایک بہت جامع قرآنی اصطلاح ہے اور اگر دیکھا جائے تو یہ ان تمام افعال پر محیط ہے جن کے نتیجے میں ماسوا محنت آمدنی حاصل ہوتی ہے یہ افعال چاہے ناپ تول میں کمی کی شکل میں ہوں، امانت میں خیانت کی شکل میں ہوں، رشوت کی شکل میں ہوں، دھوکہ دہی کی شکل میں ہوں یا کسی بھی ناجائز ذریعہ سے آمدنی کے حصول کی شکل میں ہوں ان تمام افعال میں قدر مشترک یہی ہے کہ ایسی تمام آمدنیاں انسانی محنت کا نتیجہ نہیں ہوتیں بلکہ یا تو سرمایہ کا معاوضہ ہوتی ہیں یا مختلف ناجائز ذرائع سے حاصل شدہ ہوتی

Marfat.com

ہیں۔ اس قسم کی تمام آمدنیوں کا انجام وہی ہوتا ہے جو ربا وصول کرنے والوں کا ہوتا ہے یعنی صرف اور صرف تباہی۔ یہ وہ افعال ہیں جنہیں قرآن مجید حرام یا باطل ذرائع رزق پکارتا ہے ان کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ انسانی شخصیت کا توازن بُری طرح برباد ہوتا ہے بلکہ یہ افعال نفس انسانی کی ہلاکت پر منتج ہوتے ہیں۔ ان کے نتیجے میں افراد اور اقوام دونوں بتدریج تباہی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بنی اسرائیل کی تباہی کے منجملہ اسباب میں سے ایک سبب قرآن مجید نے ربا کھانے بھی کو بھی بتایا ہے۔

وَّ اَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَ قَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَ اَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ط
(۴/۱۶۱)

اور اس سبب سے بھی کہ باوجود منع کیے جانے کے ربا لیتے تھے اور اس سبب سے بھی کہ لوگوں کا مال ناحق کھاتے تھے۔

یہاں بھی توجہ طلب امر یہ ہے کہ ربا لینے کو تباہی کا سبب گنوایا گیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ لوگوں کا مال ناحق کھانا بھی ان کی تباہی کا ایک اہم سبب گنوایا گیا ہے۔

جہاں تک ربا کھانے کے منفی نتائج کے عملی پہلو کا تعلق ہے یہ چونکہ قرآنی حقائق ہیں لہٰذا ان کے غلط ہونے کا تصور بھی ناممکن ہے۔ انفرادی سطح پر یہ عمل از روئے قرآن شخصیت کا توازن بگاڑ دیتا ہے وہ توازن جس پر اللہ نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ اسی طرح اجتماعی سطح پر اگر کسی قوم کی مجموعی استعداد (Overall Efficiency) اور قوم کی سودی آمدنی کا باہمی ربط (Correlation) معلوم کیا جا سکے یعنی کوئی ایسا طریقہ وضع کیا جائے جس کے تحت ان دونوں متغیرات (Variables) کے باہمی ارتباط کی پیائش کی جا سکے تو ان دونوں کے مابین ربط لازماً منفی ہوگا جو قرآن مجید کے دعوے کو ٹھوس ثبوت ہوگا۔

## اخروی نتائج:

جیسا کہ عرض کیا گیا متذکرہ بالا آیت (۲/۲۷۵) میں فعل مضارع استعمال کیا گیا جو

Marfat.com

حال اور مستقبل دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس بنیاد پر رباخور کا روز قیامت بھی یہی حشر ہوگا جو دنیا میں ہوتا ہے یعنی مکمل تباہی۔ اس آیت کی رو سے رباخور روز قیامت کھڑا بھی نہیں ہو سکے گا۔ اس کی یہ بربادی اس قرآنی اصول کے مطابق ہوگی جس کے تحت دنیا کا اندھا آخرت کا بھی اندھا ہوگا۔ بالفاظِ دیگر اس اصول کے تحت جس شخص نے دنیا میں اللہ کے احکام و قوانین بھلا دیا اور اللہ کی آیات سے صرف نظر کرتا رہا اس کو قیامت میں بھی آنکھیں رکھنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اور جیسا کہ متذکرہ بالا آیت (۲۰/۱۲۵) میں بھی بیان کیا گیا ہے کہ ان قوانین سے منحرف شخص کو قیامت میں بھی اندھا کر کے اٹھایا جائے گا خواہ وہ دنیا میں دیکھتا بھالتا کیوں نہ ہو۔

قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْٓ اَعْمٰى وَ قَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا ۝ قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا ۚ وَ كَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى ۝ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ اَسْرَفَ وَ لَمْ يُؤْمِنْۢ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ؕ وَ لَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَ اَبْقٰى ۝ (۲۰/۱۲۵۔۱۲۷)

وہ کہے گا کہ میرے رب تو نے مجھے اندھا کر کے کیوں اٹھایا میں تو دیکھتا بھالتا تھا۔ اللہ کہے گا کہ ایسا ہی ہونا چاہیئے تھا۔ تیرے پاس ہماری آیات آئیں تو تو نے انہیں بھلا دیا اسی طرح آج ہم تجھ کو بھلا دیں گے اور جو شخص حد سے نکل جائے اور اپنے رب کی آیات پر ایمان نہ لائے تو ہم اس کو ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں اور آخرت کا عذاب بہت سخت اور دیر تک رہنے والا ہے۔

یہ ساری صورتِ حال صرف اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ ایسے لوگ عقل و شعور سے کام نہیں لیتے اور محض دنیاوی عارضی مفادات کی خاطر اندھے ہو جاتے ہیں۔ دنیا اور محض دنیا ان کی کل کائنات ہو جاتی ہے اور اس مقصد کے لیے وہ کسی قاعدے قانون کی پرواہ نہیں کرتے۔ یہ محض حیوانیت ہے بلکہ اس سے بھی نچلی سطح۔ قرآنی الفاظ میں وہ آنکھیں جو

Marfat.com

چہرے پر ہیں وہ اندھی نہیں ہوتیں بلکہ دل جو سینوں میں ہیں وہ اندھے ہو جاتے ہیں۔

فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِیْ فِی الصُّدُوْرِ ط
(۲۲/۴۶)

بات یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ دل جو سینوں میں ہیں (وہ) اندھے ہو جاتے ہیں۔

یہ صورتِ حال اس وقت پیدا ہوتی ہے جب انسان حد اعتدال سے نکل جائے۔ اس صورت میں دنیا اور آخرت دونوں تباہ ہو جاتے ہیں۔

یہاں ایک امر کی صراحت لازمی ہے کہ اس دنیا اور آخرت کی تباہی میں کسی کے لیے کوئی تخصیص نہیں ہے اگر ایک مسلم اور غیر مسلم دونوں ربا لیتے ہیں تو وہ اسی انجام کے مستحق ہوں گے جس کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ یہاں اس حوالے سے کسی کو کوئی استثنٰی حاصل نہیں ہے۔ اس کا ثبوت پھر آیت (۲/۲۷۵) کے ابتدائی الفاظ ہیں "جو لوگ ربا کھاتے ہیں" بالفاظِ دیگر بلا کسی استثنٰی کے جو لوگ بھی ربا وصول کریں گے وہ اسی انجام سے دوچار ہوں گے۔

## دوسرا قانون: ناشکری سے رزق تنگ ہو جاتا ہے

شکر سے مراد جیسا کہ گذشتہ باب میں عرض کیا گیا اعمال صالحہ ہیں۔ بالفاظِ دیگر اللہ کی عطا کردہ نعمت یا نعمتوں کا اس طرح استعمال میں لانا کہ وہ اپنے سے زیادہ دوسروں کے لیے باعث منفعت ہو شکر کہلاتا ہے۔ ناشکری اس کا برعکس عمل ہے یعنی اللہ کی جانب سے عطا ہونے والی نعمت یا نعمتوں کو صرف اپنے ذاتی مفاد کے لیے روک لینا اور کسی دوسرے کو اس فائدہ نہ پہنچنے دینا۔ کسی بھی فرد یا قوم کا اس کو ملنے والی نعمت/نعمتوں کے بارے میں یہ طرزِ عمل ناشکری کہلاتا ہے اور ناشکری رزق کی تنگی کے بنیادی اسباب میں سے ایک ہے جس کے نتیجے میں بھوک اور خوف عذاب کی صورت میں مسلط ہو جاتے ہیں۔ یہ ایک بدیہی

Marfat.com

قانون ہے جس سے انحراف ممکن نہیں۔

وَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ۝ وَ لَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْهُمْ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ وَ هُمْ ظٰلِمُوْنَ (۱۶/۱۱۲-۱۱۳)

اور خدا ایک بستی کی مثال بیان فرماتا ہے کہ ہر طرح امن چین سے تھی۔ ہر طرف سے رزق با فراغت چلا آتا تھا مگر ان لوگوں نے خدا کی نعمت کی ناشکری کی تو خدا نے ان کو ان کے اعمال کے سبب انہیں بھوک اور خوف کا لباس پہنا دیا۔ اور ان کے پاس انہی میں سے ایک پیغمبر آیا تو انہوں نے اس کو جھٹلایا سو ان کو عذاب نے آن پکڑا اور وہ ظالم تھے۔

ان دونوں آیات ربانی میں متعدد نکات پر تدبر لازمی ہے جو مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ ایک عمومی کلیہ
۲۔ خدا کی ناشکر گذاری
۳۔ بھوک اور خوف کا لباس
۴۔ اپنے اعمال کے سبب تباہی
۵۔ رسولوں کی تکذیب کے نتیجے میں عذاب
۶۔ تباہی کا بنیادی سبب ظلم

ان نکات کی انفرادی وضاحت مندرجہ ذیل ہے۔

## ۱۔ ایک عمومی کلیہ

ان آیات میں سب سے پہلا نکتہ جو بنیادی اہمیت کا حامل ہے وہ یہ ہے کہ آیات مذکور میں کسی خاص بستی یا انسانوں کے گروہ کا تذکرہ نہیں ہے بلکہ ایک عمومی بستی کی بابت بیان

Marfat.com

ہے لہٰذا اس بستی کے حوالے سے جو کلیہ یا کلیات مستنبط ہوں گے وہ ایک عمومی کلیہ کی حیثیت رکھیں گے اور بلا لحاظ وقت اور مقام جو صورتِ حال اس آیت میں بیان کی گئی ہے اس جیسی کسی بھی دیگر صورت میں قابل اطلاق ہوں گے۔

## ۲۔ خدا کی ناشکر گذاری

آیات کی رو سے یہ ایک ایسی بستی تھی جو بے خوف اور مطمئن تھی اور رزق کی فراوانی تھی مگر انہوں نے اللہ کی نعمت کی ناشکری کی یا بالفاظِ دیگر کفران نعمت کیا۔ یہاں یہی بنیادی نکتہ ہے کہ وہ کون سے اعمال ہیں جو کفرانِ نعمت میں شامل ہیں جن کی وجہ سے اس بستی کو خوف اور بھوک کا لباس پہننا پڑا۔ از روئے قرآن مندرجہ ذیل افعال کفران نعمت میں شمار ہوتے ہیں۔

### ا۔ شرک ناشکری ہے

از روئے قرآن شرک ناشکری ہے۔ شرک سے مراد ہے غیر خدائی قوتوں کو خدا کا ہمسر سمجھنا یا اللہ کی ذات وصفات میں کسی بھی نوعیت کی شرکت کا تصور شرک ہے۔ کسی بھی انسان یا کسی بھی ہستی کو خواہ وہ کوئی ہو اس کے متعلق یہ فرض کرنا کہ اسے کسی قسم کا خدائی اختیار یا اختیارات حاصل ہیں شرک ہے۔ اور شرک بدترین ناشکری ہے۔

وَ لَقَدْ اُوْحِیَ اِلَیْکَ وَ اِلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکَ ۚ لَئِنْ اَشْرَکْتَ لَیَحْبَطَنَّ عَمَلُکَ وَ لَتَکُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ○ بَلِ اللّٰہَ فَاعْبُدْ وَکُنْ مِّنَ الشّٰکِرِیْنَ ؁ (۳۹/۶۵-۶۶)

یقیناً آپ کی طرف بھی اور آپ سے پہلے (کے تمام انبیاء) کی طرف بھی وحی کی گئی ہے کہ اگر تم نے شرک کیا تو بلاشبہ تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں گے اور بالیقین تو زیاں کاروں میں سے ہو جائے گا بلکہ تو اللہ ہی کی عبادت کر اور شکر کرنے والوں میں سے ہو جا۔

Marfat.com

اس طرح سورۂ یوسف میں ارشادِ ربانی ہے۔

وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِیْٓ اِبْرٰهِیْمَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ ؕ مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ؕ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَیْنَا وَعَلَی النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَشْكُرُوْنَ ؕ (۱۲/۳۸)

اور میں (یوسفؑ) اپنے باپ دادوں کے دین کا پابند ہوں یعنی ابراہیم واسحٰق اور یعقوب کے دین کا ہمیں ہرگز یہ سزاوار نہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو بھی شریک کریں ہم پر اور تمام لوگوں پر اللہ کا یہ خاص فضل ہے لیکن اکثر لوگ ناشکری کرتے ہیں۔

ان آیات ربانی میں صریحاً اس امر کی وضاحت کردی گئی ہے کہ اطاعت وعبادت صرف اللہ کی کی جانی چاہیئے اور اس میں کسی کو بھی شریک نہیں کیا جانا چاہیے اللہ تعالیٰ کا انسانوں سے مطالبہ اس کی احدیت کو تسلیم کرنے اور اس کی نعمتوں کا شکر بجالانے کا ہے اور جو لوگ ایسا نہیں کرتے یعنی جو اللہ کی ذات میں شرک کرتے ہیں وہ کھلی کھلی ناشکری کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

ازروئے قرآن اللہ واحد ہے(۱۱۲/۱) پوری کائنات کا یکہ وتنہا مالک وہی اوّل ہے وہی آخر (۵۷/۳)، پوری کائنات میں صرف اور صرف اس کا حکم چلتا ہے وہی احکم الحاکمین ہے (۹۵/۸)۔اس کا کوئی شریک نہیں ہے (۶/۱۶۴)، (۲۳/۱۱۶) نہ ہی وہ اپنی حکومت میں کسی کو شریک کرتا ہے (۱۸/۲۶) اس کا کوئی ہمسر ہو ہی نہیں سکتا (۱۹/۶۵) یہ ممکن ہی نہیں ہے لہٰذا کوئی ہستی ایسی نہیں جو اس کی شریک ہو (۱۳/۱۶)، (۱۷/۱۱۱)، (۱۸/۲۶)، (۱۸/۱۱۰)، (۲۱/۲۳)، (۲۱/۴۲)، (۲۵/۲)، (۳۵/۳)، (۳۹/۳۸)، (۱۱/۴۸) اور (۲۱-۶۷/۲۰) وغیرہ۔وہ واحد جامع الصفات ہستی ہے۔

یہ تصور کرنا کہ کوئی بھی ہستی زندہ یا مردہ اس کی شریک ہوسکتی ہے شرک ہے

Marfat.com

(۱۳/۳۳)۔ اس قسم کی ہستیوں کو جن کو انسان خود ساختہ طور پر اس قسم کا کردار تفویض کر دیتا ہے ان کا اس کائنات میں کسی قسم کا حصہ یا کردار نہیں ہے۔ (۳۴/۲۲)، (۳۴/۵۰)، (۴/۶۴)۔ ایسی تمام ہستیاں قیامت کے دن انسانوں کے شرک سے انکار کر دیں گی (۳۵/۱۴)۔

پوری کائنات میں کوئی ہستی ایسی نہیں جو اس کے پاس کسی کی سفارش کر سکے لہذا شفاعت کا تصور کھلا کھلا شرک ہے (۱۸/۱۰)۔ اسی طرح کسی بھی زندہ یا مردہ ہستی کو اللہ اور بندے کے درمیان ''واسطہ'' تصور کرنا بھی کھلا کھلا شرک ہے یا کسی کو اس کا شریک بنانا بھی شرک ہے (۱۳/۳۳)۔

## شرک کا انجام

شرک وہ سب سے بدترین فعل ہے جو کوئی انسان انجام دے سکتا ہے۔ قرآن مجید نے اسے ظلم عظیم (سب سے بڑا ظلم) کہہ کر پکارا ہے (۳۱/۱۳)۔ اس کے نتیجے میں تمام انسانی اعمال ضائع ہو جاتے ہیں (۶/۸۹)۔ شرک کرنے والوں کی مثال از روئے قرآن ایسی ہے جیسے کوئی آسمان کی بلندیوں سے زمین کی پستی میں آ گرے یا کسی نوزائیدہ پرندے کے بچے کو چیل جھپٹ کر لے جائے یا ہوا کا جھکڑ پر کاہ کو اڑائے پھرے (۲۲/۳۱)۔ اس فعل کے نتیجے میں انسان پر جنت حرام ہو جاتی ہے (۵/۷۲) کیونکہ یہ خدا پر افتراء ہے (۴/۴۸)۔ اس فعل کے لیے خدا نے کوئی سند نازل نہیں کی (۷/۳۳)، (۲۲/۷۱)، (۳۰/۳۵)۔ اس فعل کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے (۶/۱۵۲)، (۷/۳۳)۔ اس فعل کا انجام صرف اور صرف عذاب ہے جو کسی بھی شکل میں آ سکتا ہے اور اس کی ایک شکل بہر حال معاشی تباہی بھی ہے۔

فَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَكُوْنَ مِنَ الْمُعَذَّبِيْنَ ۚ (۲۶/۲۱۳)

پس اللہ کے سوا کسی اور معبود کو نہ پکارو کہ تم مبتلائے عذاب لوگوں میں سے ہو جاؤ۔

Marfat.com

اس آیت کریمہ میں واضح اور دوٹوک انداز میں واضح کر دیا گیا ہے کہ اللہ کے سوا کسی اور کو بہ حیثیت معبود پکارنے کا نتیجہ سوائے عذاب کے اور کچھ نہیں ہے۔ عذاب کا لفظ بھوک، پیاس، تکلیف، خانماں بربادی وغیرہ کے لیے استعمال ہوتا ہے اس کے معنی کسی چیز سے روکنے کے بھی آتے ہیں۔ قرآن مجید نے ان تمام سختیوں، مصیبتوں اور تکالیف کے لیے جو قوم فرعون بنی اسرائیل پر ڈھاتی تھی عذاب کا لفظ استعمال کیا ہے (۲۰/۴۷)۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں سے محرومی بھی عذاب ہے (۲/۷)۔ دنیاوی زندگی مین ذلت و رسوائی بھی عذاب ہے (۲۰/۱۳۴)، بھوک اور خوف عذاب خداوندی ہے (۱۶/۱۱۲)، آسمان اور زمین کی برکات کے دروازوں کا بند ہو جانا عذاب ہے (۷/۹۶)، آپس مین تفرقہ بازی، گروہ بندی خدا کا عذاب ہے (۶/۶۵)۔

یہ تو محض عذاب کی چند شکلوں کا بیان ہے ورنہ قرآن مجید میں مختلف مقامات پر عذاب کی کئی صورتیں بیان کی گئی ہیں بالخصوص اقوام گذشتہ کے قصص اس حوالے سے اہمیت کے حامل ہیں۔ گویا شرک نعمائے خداوندی کی سب سے بڑی ناشکر گزاری ہے اور لامحالہ اس کی سزا بھی اتنی ہی بڑی یعنی عذاب کی کسی بھی شکل میں گرفتاری ہے۔

## ii۔ اللہ کے ذکر سے اعراض ناشکری ہے

اللہ کے ذکر سے اعراض ناشکری ہے اس حقیقت کی صراحت مندرجہ ذیل آیت قرآنی سے ہوتی ہے۔

فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ (۲/۱۵۲)

سو تم مجھے یاد کیا کرو میں تمہیں یاد کیا کروں گا اور میرا شکر ادا کرتے رہنا اور ناشکری نہ کرنا۔

جہاں تک اللہ تعالیٰ کے ذکر کا تعلق ہے اس کی صراحت کی جا چکی ہے کہ اس سے مراد وہ عمومی احکام بھی ہیں جو قرآن مجید میں بیان کیئے گئے ہیں جو شخص بھی اللہ کی اطاعت

Marfat.com

کرے گا وہ اللہ کے قوانین کے مطابق اس کا پھل پائے گا یہ پھل دنیا اور آخرت دونوں جگہ ملتا ہے اور جو ایسا نہیں کرے گا یعنی اس کے احکام سے اعراض کرے گا باالفاظِ دیگر ناشکری کرے گا اس کی معیشت تنگ ہو جائے گی۔

## iii۔ سہولت کی بجائے زحمت طلب کرنا ناشکر گذاری ہے

اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ اس کی نعمتوں کے حصول کا متمنی رہنا چاہیئے اور اسی کے لیے دعا بھی کرنی چاہیئے لیکن بعض بد بخت ایسے بھی ہوتے ہیں جو یہ فعل الٹا انجام دیتے ہیں یعنی جو نعمائے خداوندی ان کو دستیاب ہیں ان کے لیے الٹا رب سے درخواست کرتے ہیں کہ ان رحمتوں کو زحمتوں میں بدل دے۔ یہ امر کھلی کھلی ناشکری ہے اور عذاب الٰہی کو دعوت دینے والی بات ہے۔

وَ جَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَ بَيْنَ الْقُرَى الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا قُرًى ظَاهِرَةً وَّ قَدَّرْنَا فِيْهَا السَّيْرَ ؕ سِيْرُوْا فِيْهَا لَيَالِيَ وَ اَيَّامًا اٰمِنِيْنَ۝ فَقَالُوْا رَبَّنَا بٰعِدْ بَيْنَ اَسْفَارِنَا وَ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ وَ مَزَّقْنٰهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ؕ (۳۴/۱۸۔۱۹)

اور ہم نے ان کے اور ان بستیوں کے درمیان جن میں ہم نے برکت دے رکھی تھی چند بستیاں اور (آباد) رکھی تھیں جو بر سر راہ ظاہر تھیں اور ان میں چلنے کی منزلیں مقرر کر دی تھیں ان میں راتوں اور دنوں کو بہ امان چلتے پھرتے رہو۔ لیکن انہوں نے پھر کہا کہ اے ہمارے رب ہمارے سفر دور دراز کر دے چونکہ خود انہوں نے اپنے ہاتھوں اپنا برا کیا اس لیے ہم نے انہیں افسانوں کی صورت کر دیا اور ان کے ٹکڑے اڑا دیئے بلا شبہ ہر صابر و شاکر کے لیے اس میں عبرت کا سامان ہے۔

مفسرین کے مطابق یمن اور شام کے درمیان لب شاہراہ کئی بستیاں آباد تھیں اور یہ

Marfat.com

بستیاں چونکہ ایک دوسرے سے متصل اور مسلسل تھیں جس کی وجہ سے ان بستیوں کے سفر کرنے والوں کو نمایاں سہولت تھی انہیں لمبا چوڑا زادِ راہ نہیں لینا ہوتا تھا دوم لوٹ مار اور رہزنی سے محفوظ تھے۔ یہ ان پر اللہ کا خاص انعام تھا۔ لیکن انہوں نے اس نعمت کی قدر نہیں کی بلکہ الٹا اللہ سے دعا کی کہ "اے ہمارے رب ہمارے راستوں کو طویل کردے" یعنی جس طرح طویل سفر میں سفر کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں رہزنی کے خطرات ہوتے ہیں، موسم کی سختیاں برداشت کرنی ہوتی ہیں یہ سارا سب کچھ ہمارے لیے بھی کردے۔ نتیجہ صاف ظاہر ہے ان کی اس ناشکری کے نتیجے میں انہیں اللہ تعالیٰ نے نسیاً منسیا کردیا اور انہیں تاریخ کے اوراق میں دفن کردیا۔ یہ دعا بالکل اسی طرح کی دعا ہے جس طرح بنی اسرائیل نے من سلویٰ اور دیگر سہولتوں کے مقابلے میں دالوں اور سبزیوں کا مطالبہ کیا تھا۔ نتیجتاً تباہی ان کا مقدر بن گئی تھی۔ لہٰذا سہولت کی بجائے زحمت طلب کرنا ناشکری ہے جس کا انجام محض تباہی ہے۔

## iv۔ مصائب سے نجات کے بعد شرک کفرانِ نعمت ہے

انسان جب بھی کبھی کسی مصیبت میں پھنستا ہے تو گڑگڑا کر اللہ کو یاد کرتا ہے اور جب اللہ انسان کو اس مصیبت سے نجات دے دیتا ہے تو اکڑنے اور شرک کرنے لگتا ہے یہ صریحاً ناشکری ہے۔

فَإِذَا رَكِبُوا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ فَلَمَّا نَجَّاهُمْ إِلَى الْبَرِّ إِذَا هُمْ يُشْرِكُونَ ۝ لِيَكْفُرُوا بِمَا آتَيْنَاهُمْ وَلِيَتَمَتَّعُوا فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ ۝ (۲۹/۶۵۔۶۶)

پس یہ لوگ جب کشتیوں میں سوار ہوتے ہیں تو بڑے خلوص سے خدا کی بندگی کا اظہار کرکے اسی کو پکارتے ہیں پھر جب (اللہ) ان کو نجات دے کر خشکی پر پہنچا دیتا ہے تو نجات پاتے ہی شرک کرنے لگ جاتے ہیں تاکہ جو

Marfat.com

نعمتیں ان کو ہم نے دے دی ہیں ان کی ناشکری کریں اس (عارضی توبہ) کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ (اللہ تعالیٰ ان کو چھوڑ دیتا ہے اور) وہ ایک عرصہ تک دنیاوی سامان سے فائدہ اٹھاتے ہیں پس (ایک دن یہ بخشش ختم ہو جائے گی اور) وہ (اپنی حقیقی سزا کو) دیکھ لیں گے۔

اسی طرح سورۃ الروم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَ اِذَا مَسَّ النَّاسَ ضُرٌّ دَعَوْا رَبَّهُمْ مُّنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ ثُمَّ اِذَآ اَذَاقَهُمْ مِّنْهُ رَحْمَةً اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ ۙ لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ ۭ فَتَمَتَّعُوْا ۪ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۭ (۳۰/۳۳-۳۴)

لوگوں کو جب بھی کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو اپنے رب کی طرف (پوری طرح) رجوع ہو کر دعائیں کرتے ہیں پھر جب وہ اپنی طرف سے رحمت کا ذائقہ چکھاتا ہے تو ان میں سے ایک جماعت اپنے رب کے ساتھ شرک کرنے لگتی ہے۔ تاکہ وہ اس چیز کی ناشکری کریں جو ہم نے انہیں دی ہے اچھا تم فائدہ اٹھا لو تمہیں بہت جلد معلوم ہو جائے گا۔

متذکرہ بالا آیات (۶۶-۶۵/۲۹) میں توجہ طلب امر متاع کا پہلو ہے جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ جو لوگ اللہ پر ایمان نہیں رکھتے وہ اس دنیا کی اشیاء سے صرف متمتع ہوتے ہیں یا عارضی فائدہ اٹھاتے ہیں متاع کے معنی ایسی شے کے ہوتے ہیں جس سے تھوڑا فائدہ اٹھایا جائے لیکن وہ باقی رہنے والی نہ ہو بلکہ جلد ختم ہو جائے جبکہ اس کے برعکس وہ رزق جو اللہ مومنین کو دیتا ہے اس کے متعلق کہا گیا کہ وہ بہتر اور باقی رہنے ولا ہے (۲۰/۱۳۱)۔ لہٰذا یہاں اسی کلیئے کا اطلاق کیا گیا ہے ایسے لوگ جو مصیبت میں تو خدا کو خلوص سے یاد کریں اور مصیبت سے نجات ملتے ہی شرک پر اتر آئیں انہیں کفار ہی کے ذیل میں شمار کیا جائے گا اور ان پر اسی تقدیر کا اطلاق ہو گا جو کفار کے لیے مخصوص ہے یعنی اس دنیا سے وہ صرف عارضی

فائدہ اٹھا سکتے ہیں اس سے زائد نہیں۔

لہٰذا مصیبت میں تو خدا کو پکارنا اور نجات ملتے ہی خدا سے شرک کرنے لگ جانا کفران نعمت ہے۔

## ۷۔ اللہ کے دیئے ہوئے رزق کو اپنے اوپر حرام کر لینا ناشکری ہے

قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّ حَلٰلًا ؕ قُلْ آٰللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ ۝ وَمَا ظَنُّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ ؑ (۱۰/۵۹-۶۰)

آپ کہیئے کہ یہ تو بتاؤ کہ اللہ نے تمہارے لیے جو رزق اتارا ہے تم نے اس کا کچھ حصہ حلال اور کچھ حصہ حرام قرار دے لیا آپ پوچھئے کہ کیا تم کو اللہ نے حکم دیا یا اللہ پر افتراء ہی کرتے ہو۔ اور جو لوگ اللہ پر افتراء باندھتے ہیں ان کا قیامت کی نسبت کیا گمان ہے واقعی لوگوں پر اللہ کا بڑا فضل ہے لیکن ان میں سے اکثریت شکر ادا نہیں کرتی۔

ان آیات کریمہ میں واضح ارشاد ربانی ہے کہ ایسے لوگ جو بلا وجہ نعمائے ربانی میں سے بعض کو اپنے اوپر حرام قرار دے لیتے ہیں وہ ان نعمتوں کے کفران کے مرتکب ہوتے ہیں۔ لہٰذا بغیر کسی وجہ کے اللہ کی نعمتوں میں سے بعض کے دروازے خود اپنے اوپر بند کر لینا ناشکری ہے۔

## ۱۷۔ اللہ تعالیٰ کے فضل کی ناقدری بھی کفران نعمت ہے

مندرجہ بالا آیات کریمہ جہاں اس امر کی شہادت دیتی ہیں کہ بلا وجہ نعمائے خداوندی سے منہ موڑنا کفران نعمت ہے وہیں اس امر پر بھی شاہد ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے فضل کی ناقدری بھی کفران نعمت ہے۔

فضل کے بنیادی معنی کسی چیز کے متوسط ضرورت سے زائد ہونے کے ہوتے ہیں اور بھلائی کی کثرت یا زیادتی کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔قرآن مجید میں دیگر معنوں کے علاوہ اسے بیشتر مقامات پر معاشی خوشحالی کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے اس کا عمومی مفہوم معاشی خوشحالی اور فارغ البالی ہے جس کو حاصل کرنے کی مومنین کو تاکید کی گئی ہے(۶۲/۱۰)۔

تاہم اللہ کا فضل حاصل ہونے کے بعد اس کی ناقدری بھی کفرانِ نعمت ہے اس حوالے سے بنی اسرائیل کی مثال دی جا سکتی ہے جنہیں اللہ نے بہترین رزق سے نوازا تھا لیکن انہوں نے اس کی قدر نہیں کی۔اس ناقدری سے خود انہوں نے اپنا ہی نقصان کیا۔

وَ ظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَ السَّلْوٰى كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَ مَا ظَلَمُوْنَا وَ لٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (۲/۵۷)

اور بادل کا تم پر سایہ کیے رکھا اور (تمہارے لیے) من و سلویٰ اتارتے رہے کہ جو پاکیزہ چیزیں تم کو عطا فرمائی ہیں ان کو کھاؤ (پیو) مگر تمہارے بزرگوں نے ان نعمتوں کی کچھ قدر نہ جانی اور وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑتے تھے بلکہ اپنا ہی نقصان کرتے تھے۔

بنی اسرائیل کے اس طرزِ عمل کا تذکرہ (۷/۱۶۰) میں بھی کیا گیا ہے۔اس طرزِ عمل کا نتیجہ یہ نکلا کہ ذلت اور رسوائی ان سے چمٹ گئی اور حد سے بڑھ جانے والوں کا انجام یہی ہوا کرتا ہے۔

وَ اِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَ قِثَّآئِهَا وَ فُوْمِهَا وَ عَدَسِهَا وَ بَصَلِهَا قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِيْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِيْ هُوَ خَيْرٌ اِهْبِطُوْا

Marfat.com

مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَ
بَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ
يَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ؕ

(۲/۶۱)

اور جب تم نے کہا: موسیٰ! ہم سے ایک کھانے پر صبر نہیں ہوسکتا تو اپنے رب سے دعا کیجیے کہ ترکاری اور ککڑی اور گیہوں اور مسور اور پیاز جو نباتات زمین سے اُگتی ہیں ہمارے لیے پیدا کردے انہوں نے کہا بھلا عمدہ چیزیں چھوڑ کر ان کے بدلے ناقص چیزیں کیوں چاہتے ہو (اگر یہی چیزیں مطلوب ہیں) تو کسی شہر میں جا اترو وہاں جو مانگتے ہو وہ مل جائے گا اور آخر کار ذلت و مسکنت ان سے چمٹادی گئی وہ خدا کے غضب میں گرفتار ہوگئے یہ اس لیے کہ وہ اللہ کی آیات سے انکار کرتے تھے اور اس کے نبیوں کو ناحق قتل کردیا کرتے تھے اور اس لیے کہ نافرمانی کیے جاتے اور حد سے بڑھے جاتے تھے۔

لہٰذا اللہ تعالیٰ کے ہر قسم کے فضل کی شکر گزاری لازمی ہے جو لوگ ایسا نہیں کرتے وہ ناشکرے ہیں۔لہٰذا اللہ کے فضل کی قدر نہ کرنا بھی ناشکری ہے۔

## vii۔ سوچنے سمجھنے کی نعمتوں کا عدم استعمال بھی ناشکری ہے

اللہ تعالیٰ نے انسان کو سوچنے سمجھنے اور فکر و تدبر کی صلاحیتوں سے نوازا ہے اور پورے قرآن مجید میں جا بجا ان صلاحیتوں کے استعمال کی دعوت دی گئی ہے اللہ کی آیات پر تدبر کی دعوت قرآن مجید میں ایمان لانے کی دعوت دینے کے بعد دوسری سب سے بڑی دعوت ہے ایک اندازے کے مطابق قرآن مجید کی نو سو (۹۰۰) سے زائد آیات مظاہر قدرت پر غور و فکر کی دعوت دیتی ہیں۔

وہ لوگ جو نعمائے خداوندی کی قدر نہیں کرتے یعنی کائنات میں جا بجا بکھری ہوئی آیات الٰہی پر تدبر نہیں کرتے انہیں قرآن جانوروں سے بھی بدتر قرار دیتا ہے۔(۸/۲۲)
یہی وجہ ہے کہ ان نعمتوں کے عدم استعمال کو کفران نعمت متصور کیا گیا ہے۔

إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعًا بَصِيرًا ○ إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا (۷۶/۲-۳)

بے شک ہم نے انسان کو نطفہ مخلوط سے امتحان کے لیے پیدا کیا اور اس کو سنتا دیکھتا بنایا، ہم نے اسے راہ دکھائی اب خواہ وہ شکر گذار بنے یا ناشکرا۔

ان آیات قرآنی کی رو سے انسان میں مختلف النوع قسم کی قوتیں مجتمع ہیں اور انسانی پیدائش کا مقصد ہی اس کا یہ امتحان ہے کہ وہ ان قوتوں کو کیسے اور کس طرح استعمال کرتا ہے (امتحان یا آزمائش کے تصور کی وضاحت آٹھویں باب میں کی گئی ہے) وہ لوگ جو اپنی ان قوتوں کو کائنات پر غور وفکر کے لیے استعمال کرتے ہیں وہ ان معنوں میں شکر گزار ہیں کہ وہ ان صلاحیتوں کا صحیح اور جائز استعمال کرتے ہیں جبکہ وہ لوگ جو ان کے استعمال کی زحمت نہیں کرتے وہ ناشکرے ہیں۔ لہٰذا سمع وبصر کا عدم استعمال بھی ناشکرا پن ہے۔

## viii۔ اللہ کی راہ میں انفاق نہ کرنا بھی ناشکری ہے

ازروئے قرآن انفاق نہ کرنے والے ناشکر گزار ہوتے ہیں۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ أَنفِقُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ قَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا أَنُطْعِمُ مَن لَّوْ يَشَاءُ اللَّهُ أَطْعَمَهُ إِنْ أَنتُمْ إِلَّا فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ (۳۶/۴۷)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو رزق اللہ نے تم کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرو تو کفران نعمت کرنیوالے (کفار) مومنوں سے کہتے ہیں کہ بھلا ہم ان لوگوں کو کھانا کھلائیں جن کو اگر خدا چاہتا تو خود کھلا دیتا تم تو صریح غلطی پر ہو۔

Marfat.com

یہ آیت صریحاً اس امر کی دلیل ہے کہ اللہ کے دیئے ہوئے رزق میں سے انفاق نہ کرنا ناشکری ہے۔

## ix۔ علم کا ایسا استعمال جو باعث ضرر ہو ناشکری ہے

سورۃ الانبیاء میں حضرت داؤد علیہ السلام پر نعمائے خداوندی کی عنایات کے حوالے سے ارشاد ربانی ہے۔

وَ عَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ فَهَلْ اَنْتُمْ شٰكِرُوْنَ ؁ (۲۱/۸۰)

اور ہم نے اسے تمہارے لیے لباس بنانے کی کاریگری سکھائی تاکہ لڑائی کے ضرر سے تمہارا بچاؤ ہو کیا تم شکر گزار بنو گے؟

اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو وہ علم دیا تھا جس سے وہ جنگی لباس اور لوہے کی زرہیں تیار کرتے تھے جس سے جنگ میں حفاظت کا سامان بہم ہو جاتا تھا۔ یہ علم کا مثبت اور صحیح استعمال ہے جو انسانیت کو ضرر سے بچانے کے لیے ہے اس علم کے عطا ہونے پر انسانوں کو اللہ کا شکر گذار ہونا چاہیے۔ بالفاظِ دیگر علم خواہ اس کی نوعیت کچھ ہی کیوں نہ ہو ایک نعمت خداوندی ہے جس کا شکر لازمی ہے لیکن اگر اسی علم کو اس طرح استعمال کیا جائے کہ اس سے خلق خدا کو ضرر پہنچے یا اس سے انسانوں کی تباہی کا سامان کیا جائے تو یہ اس نعمت کی ناشکری ہے۔ لہٰذا علم کا غلط استعمال ناشکری ہے۔

## x۔ اللہ کا تقویٰ اختیار نہ کرنا ناشکری ہے:

از روئے قرآن جن و انس کی تخلیق کا بنیادی مقصد اللہ کی عبدیت اختیار کرنا ہے یعنی احکام الٰہی کی کامل تابعداری۔

وَ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ؁ (۵۱/۵۶)

اور ہم نے جن و انس کو اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔

Marfat.com

عبادت سے مراد اللہ کے احکام کی کامل تابعداری ہے کیونکہ قرآن مجید میں "خدا کی عبادت" کی اصطلاح اطاعت کے معنوں میں استعمال کی گئی ہے۔

وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ؕ (۱۸/۱۱۰)

ان کو چاہیئے کہ اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کریں۔

ایک دوسری جگہ ارشاد ربانی ہے:

وَّلَا يُشْرِكُ فِىْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا ؕ (۱۸/۲۶)

وہ اپنی حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔

اسی طرح سورۃ الیوسف میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۱۲/۴۰)

اللہ کے سوا کسی کی حکومت نہیں ہے اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو یہی سیدھا راستہ ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

(۴۷/۲۳) اور (۲۶/۲۲) میں اسے محکومیت کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔

اللہ کے احکامات کی تابعداری صرف شکر گذار لوگ ہی کرتے ہیں۔

بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ ؕ (۳۹/۶۶)

بلکہ اللہ کی عبادت کرو اور شکر گذاروں میں ہو۔

باالفاظِ دیگر اللہ کے احکامات کی تابعداری اس کا شکر ہے اور جو ایسا نہیں کرتے وہ ناشکر گذار ہیں۔ لہٰذا اللہ کے احکامات سے روگردانی ناشکری ہے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا شکر قرآن مجید کی ایک بہت جامع اصطلاح ہے وہ تمام تر افعال جو اعمال صالحہ میں شامل ہیں شکر کے دائرے میں آتے ہیں اور ان تمام افعال کی ضد ناشکری شمار ہوگی۔

متذکرہ بالا افعال جن کا ناشکری کے عنوان کے تحت تذکرہ کیا گیا ہے وہ ہیں جن کو خود

Marfat.com

قرآن مجید نے ناشکری کے دائرہ میں رکھا ہے بالفاظِ دیگر جن پر زیادہ زور دیا گیا ہے ورنہ ناشکری یا کفرانِ نعمت کی ایک سطحی تعریف تو یوں بھی ممکن ہے کہ اعمال صالحہ کی ضد ناشکری یا کفرانِ نعمت ہے اور ان تمام افعال کا نتیجہ بھوک اور خوف کا لباس ہے جیسا کہ اس قانون کی ابتدا میں آیات (۱۱۳۔۱۱۲/۱۶) کے حوالے سے عرض کیا گیا ہے۔

## ۳۔ بھوک اور خوف کا لباس

متذکرہ بالا آیات اس امر پر شاہد ہیں کہ مشیت الٰہی کے طے شدہ قانون کے مطابق جو بستی بھی اس کی نعمتوں کا کفران کرے گی اسے بھوک اور خوف کا لباس پہننا ہوگا۔ یہاں اس امر کی صراحت لازمی ہے کہ بھوک اور خوف کے لباس سے کیا مراد ہے؟

جوع کا لفظ قرآن مجید میں بھوک کے لیے آیا ہے (۲/۱۵۵) از روئے قرآن رزق کی فراوانی اللہ کی نعمت ہے اور رزق کی تنگدستی اس کا عذاب ہے۔ لہٰذا ایسی قومیں جو رزق کے لیے دوسروں کی محتاج ہوں وہ عذابِ الٰہی کا شکار ہوتی ہیں۔

خوف سے مراد یہ ہوتی ہے کہ قرآئن و شواہد سے کسی آنے والے خطرہ یا نقصان کا اندیشہ کرنا۔ چھٹے باب میں رزق کی کشاد کے دوسرے قانون بعنوان "اللہ پر ایمان اور اعمال صالح کے نتیجے میں باعزت رزق" کی وضاحت کرتے ہوئے مغفرت کی اصطلاح پر بحث کی جا چکی ہے قند مکرر کے طور پر مختصراً یوں سمجھ لیجیے کہ مغفرت سے مراد انسان کے اعمال بد کے منفی نتائج سے تحفظ ہے۔ جب انسان ایمان کے ساتھ اعمال صالح انجام دیتا ہے تو اس کے منفی اعمال سے تحفظ اسے منجانب اللہ مل جاتا ہے لیکن ناشکری کی صورت میں یہ تحفظ اللہ تعالیٰ اٹھا لیتا ہے اور افراد و اقوام دونوں گوناگوں اقسام کے خوف میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ خوف کے معنی قتل اور جنگ کے بھی آتے ہیں یا خوف اور دہشت کے کسی بھی موقع کے جیسا کہ (۳۳/۱۹) میں اسے استعمال کیا گیا ہے۔ اسے بتدریج کم کرتے ہوئے تباہ کرنے یا خوف اور ہوشیاری کے باوجود گرفت میں لینے کے معنی میں (۱۶/۴۷) میں استعمال کیا گیا

Marfat.com

ہے۔ اس کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ افراد یا اقوام جنگ کے خوف میں مبتلا رہتے ہیں۔ تاہم اس خوف کی نوعیت کچھ بھی ہوسکتی ہے جو صرف اس امر کا نتیجہ ہوتا ہے کہ جو افراد یا اقوام اللہ کی نعمتوں کی ناشکر گزاری کرتے ہیں ان پر اللہ تعالیٰ بھوک اور خوف کو لباس کی مانند مسلط کر دیتا ہے جس طرح انسان لباس سے جدا نہیں ہوتا اسی طرح بھوک اور خوف ناشکروں پر عذاب کی صورت مسلط ہو جاتے ہیں۔

## ۴۔ اپنے اعمال کے سبب تباہی:

متذکرہ بالا تباہی جو چاہے بھوک اور خوف کی شکل میں ہو یا کسی بھی دیگر شکل میں جو ناشکروں کا لازمی مقدر ہوتی ہے کسی خارجی وجہ سے نہیں ہوتی بلکہ خود ان کے اپنے اعمال کی وجہ سے ہوتی ہے۔ انسان خود اپنے آپ پر ظلم کرتا ہے اپنی تباہی کو خود دعوت دیتا ہے۔ یہ انسان کے اپنے منفی اعمال ہوتے ہیں جو عذاب کی صورت اس پر مسلط ہو جاتے ہیں۔ اس میں کسی کا کوئی دوش نہیں ہوتا۔ ناشکرے اگر بھوک اور خوف کا شکار ہوتے ہیں تو اس کی وجہ ان کا اپنا ناشکرا پن ہوتا ہے جو ان کی تباہی کا سبب ہوتا ہے۔

## ۵۔ رسولوں کی تکذیب کے نتیجے میں عذاب:

متذکرہ بالا آیات (۱۱۳۔۱۱۲/۱۶) پر تدبر کرنے سے یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ اگر صرف ناشکری کی جائے تو خوف اور بھوک کا عذاب مسلط ہو جاتا ہے لیکن جب اصلاح احوال کے لیئے اللہ کی جانب سے پیغمبر بھیجے جائیں اور ان بستیوں میں رہنے والے جو پہلے ہی بھوک اور خوف کے عذاب میں مبتلا تھے انہوں نے جب اللہ کی رسولوں کی تکذیب کی تو ان کی تباہی پر مہر تصدیق ثبت ہوگئی کیونکہ انہوں نے راہ ہدایت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا لہٰذا وہ مکمل تباہ اور برباد ہو گئے اور اللہ نے ان کو نسیاً منسیاً کر دیا۔ اس تمام عمل کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ وہ لوگ ظالم تھے۔

Marfat.com

## ۶۔ تباہی کا بنیادی سبب ظلم

ظلم کے بنیادی معنی کسی دوسرے کی ملکیت میں بے جا تصرف کرنا، حد سے تجاوز کرنا، کسی چیز کو اس کے مخصوص مقام پر نہ رکھنا ہیں یہ تبدیلی مقام یا وقت یا کسی بھی دیگر شکل میں ہو سکتی ہے۔

قرآن مجید میں ظالمین کا لفظ بکثرت آیا ہے اور بالعموم قانون شکنی، حدود فراموشی، ناجائز تصرف، واجبات کی پوری پوری ادائیگی نہ کرنا، ناجائز قابضین وغیرہ کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ بنیادی نکتہ بہرحال حدود فراموشی ہے وہ لوگ جو اللہ کے احکامات کو تسلیم نہیں کرتے اور اس کی متعین کردہ حدود سے باہر نکل جاتے ہیں وہ ظالم ہیں۔ ناشکرا پن ظلم ہے اور ظلم کا انجام محض تباہی۔ ایک بنیادی کلیہ قرآن مجید نے بیان کر دیا ہے۔

لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ط (۲/۲۷۹)

نہ تم کسی پر ظلم کرو گے نہ تم پر ظلم کیا جائے گا۔

کفران نعمت کرنے والے چونکہ کفران نعمت کی شکل میں ظلم کرتے ہیں لہٰذا ان پر بھی ظلم واجب ہو جاتا ہے اس قانون کے اطلاق کی ایک عملی مثال ہمیں قوم سبا کی شکل میں ملتی ہے جس کو اللہ نے اپنی نعمتوں سے نوازا تھا لیکن انہوں نے ناشکری کی نتیجے کے طور پر پوری قوم معاشی لحاظ سے تباہ ہو گئی۔ اس حوالے سے ارشاد ربانی ہے:

لَقَدْ كَانَ لِسَبَاٍ فِيْ مَسْكَنِهِمْ اٰيَةٌ جَنَّتٰنِ عَنْ يَّمِيْنٍ وَّ شِمَالٍ كُلُوْا مِنْ رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوْا لَهٗ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَّ رَبٌّ غَفُوْرٌ ○ فَاَعْرَضُوْا فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ سَيْلَ الْعَرِمِ وَ بَدَّلْنٰهُمْ بِجَنَّتَيْهِمْ جَنَّتَيْنِ ذَوَاتَيْ اُكُلٍ خَمْطٍ وَّاَثْلٍ وَّ شَيْءٍ مِّنْ سِدْرٍ قَلِيْلٍ ○ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِمَا كَفَرُوْا وَهَلْ نُجٰزِيْٓ اِلَّا الْكَفُوْرَ ط (۳۴/۱۵۔۱۷)

Marfat.com

سبا کے لیے ان کے اپنے ملک میں ایک بڑی نشانی موجود تھی اور (وہ) دو باغوں کی شکل میں تھی جن میں سے ایک دائیں طرف تھا اور ایک بائیں طرف (اور ہم نے ان سے کہہ رکھا تھا کہ) اپنے رب کا دیا ہوا رزق کھاؤ اور اس کا شکر ادا کرو تمہارا شہر ایک پاکیزہ شہر ہے اور تمہارا رب بخشنے والا ہے۔ پھر بھی انہوں نے (حق سے) اعراض کیا پس ہم نے ان پر تباہ کن سیلاب بھیج دیا اور انہیں ان کے باغوں کے بدلے دو ایسے باغ دیئے جن کے میوے بدمزہ تھے جن میں کچھ تو جھاؤ تھا اور تھوڑی سی بیریاں۔ یہ ہم نے ان کی ناشکری کی ان کو سزا دی اور ناشکروں کو ہی ہم ایسا بدلہ دیا کرتے ہیں۔

یہ مثال متذکرہ بالا قانون کی ایک عملی مثال ہے۔ قوم سبا کے حوالے سے کہا گیا کہ انہوں نے حق سے اعراض کیا با الفاظِ دیگر احکامِ خداوندی کی نافرمانی کی۔ نتیجے کے طور پر تباہی ان کا مقدر بن گئی۔

## تیسرا قانون: معیشت کی افراط سے متکبر بستیاں تباہ کردی جاتی ہیں

مشیت الٰہی سے طے شدہ اس قانون کے تحت معیشت کی افراط سے متکبر ہو جانے والی بستیاں تباہ کر دی جاتی ہیں۔ اس حوالے سے ارشاد ربانی ہے:

وَ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍۭ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا ۚ فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْۢ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا ۚ وَ كُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ○ وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْۤ اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۚ وَ مَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰۤى اِلَّا وَ اَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ○ وَمَاۤ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ زِيْنَتُهَا ۚ وَ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ؕ (۲۸/۵۸-۶۰)

Marfat.com

اور ہم نے بہت سی وہ بستیاں تباہ کر دیں جو اپنے عیش وعشرت میں اترانے لگیں تھیں یہ ہیں ان کی رہائش کی جگہیں جو ان کے بعد بہت ہی کم آباد کی گئیں اور ہم ہی ہیں آخر میں سب کچھ کے وارث۔ تیرا رب کسی بستی کو بھی اس وقت تک ہلاک نہیں کرتا جب تک کہ ان کی کسی بڑی بستی میں اپنا کوئی پیغمبر نہ بھیج دے جو انہیں ہماری آیات پڑھ کر سنا دے۔اور ہم بستیوں کو اسی وقت ہلاک کرتے ہیں جبکہ وہاں کے رہنے والے ظلم وستم پر کمر کس لیں اور تمہیں جو کچھ دیا گیا ہے وہ صرف دنیا کی زندگی کا سامان اور اس کی رونق ہے ہاں اللہ کے پاس جو ہے وہ بہت بہتر اور دیر پا ہے کیا تم نہیں سمجھتے۔

متذکرہ بالا آیات میں متعدد نکات پر تدبر لازمی ہے جو مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ تکبر سے تباہی

۲۔ تباہی سے پہلے اتمام حجت

۳۔ قوم کی اجتماعی تباہی

۴۔ متاع کا تصور

ان نکات کی انفرادی وضاحت مندرجہ ذیل ہے۔

## ۱۔ تکبر سے تباہی

متذکرہ بالا آیات میں سے پہلی آیت میں آنے والے الفاظ بَطِرَتْ مَعِیْشَتَهَا پر تدبر لازمی ہے۔ بطرت بنیادی طور پر کسی نااہل کے اس اوچھے طرزِ عمل کا نام ہے۔ جس کا وہ دولت اور قوت مل جانے پر مظاہرہ کرتا ہے۔ اس موقع پر جس تکبر، اکڑفوں، اوچھے پن اور اتراہٹ کا وہ مظاہرہ کرتا ہے وہ بطر کہلاتی ہے۔ اس کی وضاحت ایک دوسرے مقام پر قرآن مجید نے ان الفاظ میں کی ہے۔

Marfat.com

وَلَا تَكُونُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا (۸/۴۷)

ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو اپنے گھروں سے اکڑتے اور اتراتے ہوئے نکلے۔

اسباب زیست کی فراوانی کو کم ظرف سنبھال نہیں پاتے اور اوچھی حرکتوں پر اتر آتے ہیں بلاوجہ تکبر کا مظاہرہ کرتے ہیں جبکہ تکبر صرف ذات باری تعالیٰ کو زیبا ہے اس کے سوا کسی کو نہیں۔ اگر انسان تکبر کرے تو اس کا یہ تکبر اس کو لے ڈوبتا ہے۔ اس قسم کے لوگ کس قسم کے طرزِ عمل کا مظاہرہ کرتے ہیں اس کا نقشہ قرآن مجید نے دو مختلف مقامات پر اس انداز میں کھینچا ہے۔

وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ ۝ هَمَّازٍ مَّشَّاءٍ بِنَمِيْمٍ ۝ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ۝ عُتُلٍّ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ ۝ اَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَّبَنِيْنَ ۝ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ (۶۸/۱۰-۱۵)

اور کسی ایسے شخص کے کہے میں نہ آ جانا جو بہت قسمیں کھانے والا ہو، بے وقار، کمینہ، عیب گو، چغل خور، بھلائی سے روکنے والا، حد سے بڑھ جانے والا گنہگار، گردن کش پھر ساتھ ہی بے نسب ہو اس کی سرکشی صرف اس لیے ہے کہ وہ مال والا اور بیٹوں والا ہے جب اس کے سامنے ہماری آیات پڑھی جاتی ہیں تو کہتا ہے کہ یہ تو اگلے لوگوں کے افسانے ہیں۔

سورۃ المدثر میں ان امرا کے طرزِ عمل کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

ذَرْنِيْ وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيْدًا ۝ وَّجَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا ۝ وَّبَنِيْنَ شُهُوْدًا ۝ وَّمَهَّدْتُّ لَهٗ تَمْهِيْدًا ۝ ثُمَّ يَطْمَعُ اَنْ اَزِيْدَ ۝ كَلَّا اِنَّهٗ كَانَ لِاٰيٰتِنَا عَنِيْدًا ۝ سَاُرْهِقُهٗ صَعُوْدًا ۝ اِنَّهٗ فَكَّرَ وَقَدَّرَ ۝ فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ۝ ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ۝ ثُمَّ نَظَرَ ۝ ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ۝ ثُمَّ اَدْبَرَ

وَاسْتَکْبَرَ۝ فَقَالَ اِنْ ھٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ یُّؤْثَرُ۝ اِنْ ھٰذَآ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ۝ (۲۵-۱۱/۷۴)

مجھے اور اسے چھوڑ دے جسے میں نے اکیلا پیدا کیا ہے۔ اور اسے بہت سا مال دے رکھا ہے اور حاضر باش بیٹے بھی۔ اور میں نے اسے بہت کشادگی دے رکھی ہے پھر بھی اس کی چاہت ہے کہ میں اسے اور زیادہ دوں۔ نہیں نہیں وہ ہماری آیات کا مخالف ہے۔ عنقریب میں اسے سخت چڑھائی چڑھاؤں گا اس نے غور کر کے تجویز کی اسے ہلاکت ہو کیسی (تجویز) سوچی وہ پھر غارت ہو کس طرح (کا) اندازہ کیا اس نے پھر دیکھا پھر تیوری چڑھائی اور منہ بنایا پھر پیچھے ہٹ گیا اور غرور کیا اور کہنے لگا کہ یہ تو صرف جادو ہے جو نقل کیا جاتا ہے (یہ) سوائے انسانی کلام کے کچھ بھی نہیں۔

متذکرہ بالا آیات میں اللہ تعالیٰ نے دو مختلف مقامات پر ایسے امراء کی خصوصیات بیان کی ہیں جو دولت کے نشے میں بدمست ہو جاتے ہیں۔ اگر متذکرہ بالا دونوں مقامات کی آیات کا تجزیہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ ایسے امراء یا طبقہ مترفین کے افراد جو اخلاقی رذائل کا شکار ہوں ان کی سرکشی کی بنیادی وجہ معیشت کی افراط ہوتی ہے یہ لوگ دولت کو ہی سب کچھ سمجھ کر اس کی بنیاد پر دیگر انسانوں کو حقیر سمجھنے لگتے ہیں اور ان سے اس قسم کا سلوک روا رکھتے ہیں جو کسی صورت روا نہیں رکھنا چاہیئے۔ یہ اپنے مال اور بیٹوں پر اتنا اترانے لگتے ہیں کہ حد سے گذر جاتے ہیں اور اللہ کی آیات کی تکذیب پر اتر آتے ہیں۔ اللہ کی آیات کی اس سے بڑی تکذیب اور کیا ہوگی کہ کلام الٰہی کو انسانی کلام قرار دے دیا جائے اور یہ کہہ کر قبول کرنے سے انکار کر دیا جائے کہ یہ تو اگلے وقتوں کے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔ کلامِ الٰہی کی تکذیب بہت بڑا گناہ ہے جس کا یہ لوگ سرے سے شعور ہی نہیں رکھتے جس کا تذکرہ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر کیا گیا ہے متذکرہ بالا آیات (۲۵-۱۲/۷۴)

Marfat.com

میں ان امیر لوگوں کی متذکرہ بالا خصوصیات کے بیان کے بعد ان لوگوں کا انجام بھی بتایا گیا ہے جو مندرجہ ذیل ہے۔

سَاُصْلِیْهِ سَقَرَ ○ وَ مَآ اَدْرٰکَ مَا سَقَرُ ○ لَا تُبْقِیْ وَلَا تَذَرُ ○ لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ ○ (۷۴/۲۶-۲۹)

میں عنقریب اسے سقر میں داخل کروں گا اور تجھے کیا خبر کہ سقر کیا چیز ہے؟ (وہ آگ ہے کہ) نہ وہ باقی رکھتی ہے نہ چھوڑتی ہے اور بدن کو جھلسا کر سیاہ کر دیتی ہے۔

یہ تو صرف ایک مقام کا تذکرہ ہے جہاں آیات الٰہی کی تکذیب کرنے والوں کا ایک انجام بتایا گیا ہے ورنہ قرآن مجید میں مختلف مقامات پر ان کے لیے اسی طرح کی شدید سزائیں تجویز کی گئی ہیں۔

بنیادی طور پر دولت کی اپنی ایک خاص نفسیات ہوتی ہے۔ دولتمند انسان اپنے آپ کو عقل کل سمجھنے لگتے ہیں۔ حق کی باتوں پر غور و فکر سے انکار اور آیات الٰہی کی تکذیب کو اپنا شیوہ بنا لیتے ہیں، حق سے چڑنا ان کی فطرت بن جاتی ہے۔

ان کے اس طرز عمل کی نشاندہی قرآن مجید میں ان الفاظ میں کی گئی ہے:

حَتّٰٓی اِذَآ اَخَذْنَا مُتْرَفِیْهِمْ بِالْعَذَابِ اِذَا هُمْ یَجْئَرُوْنَ ○ لَا تَجْئَرُوا الْیَوْمَ اِنَّکُمْ مِّنَّا لَا تُنْصَرُوْنَ ○ قَدْ کَانَتْ اٰیٰتِیْ تُتْلٰی عَلَیْکُمْ فَکُنْتُمْ عَلٰٓی اَعْقَابِکُمْ تَنْکِصُوْنَ ○ مُسْتَکْبِرِیْنَ بِهٖ سٰمِرًا تَهْجُرُوْنَ ○ اَفَلَمْ یَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ اَمْ جَآءَهُمْ مَّا لَمْ یَاْتِ اٰبَآءَهُمُ الْاَوَّلِیْنَ ○ اَمْ لَمْ یَعْرِفُوْا رَسُوْلَهُمْ فَهُمْ لَهٗ مُنْکِرُوْنَ ○ اَمْ یَقُوْلُوْنَ بِهٖ جِنَّةٌ بَلْ جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ وَ اَکْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ کٰرِهُوْنَ ○ وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَ مَنْ فِیْهِنَّ بَلْ اَتَیْنٰهُمْ بِذِکْرِهِمْ فَهُمْ عَنْ ذِکْرِهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ط (۲۳/۶۴-۷۱)

Marfat.com

یہاں تک کہ جب ہم نے ان کے آسودہ حال لوگوں کو عذاب میں پکڑ لیا تو وہ بلبلانے لگے۔ آج مت بلبلاؤ یقیناً ہمارے مقابلے پر تمہاری کوئی مدد نہیں کی جائے گی۔ جب میری آیات تمہارے سامنے پڑھی جاتی تھیں تو تم اپنی ایڑیوں کے بل بھاگتے تھے اکڑتے، اینٹھتے، افسانہ گوئی کرتے اسے چھوڑ دیتے تھے کیا انہوں نے اس بات پر غور و فکر نہیں کیا؟ بلکہ ان کے پاس وہ آیا جو ان کے اگلے باپ دادوں کے پاس نہیں آیا تھا؟ یا انہوں نے پیغمبر کو پہچانا نہیں کہ اس کے منکر ہو رہے ہیں؟ یا یہ کہتے ہیں کہ اسے جنون ہے؟ بلکہ وہ تو ان کے پاس حق لایا ہے ہاں ان میں سے اکثر حق سے چڑنے والے ہیں اگر حق ہی ان کی خواہشات کی پیروی کرنے لگ جائے تو زمین اور آسمان اور ان کے درمیان کی ہر چیز درہم برہم ہو جائے حق تو یہ ہے کہ ہم نے ان کو نصیحت پہنچا دی ہے لیکن وہ نصیحت سے منہ موڑنے والے ہیں۔

یہ طرزِ عمل صرف کسی مخصوص ایسے گروہ امراء کا نہیں جو حق کی تکذیب پر کمر باندھ لیں بلکہ یہ ایک عمومی طرزِ عمل ہے اس کی گواہی قرآن مجید نے ان الفاظ میں دی ہے۔

وَ مَآ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَۃٍ مِّنْ نَّذِیْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ○ وَ قَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّ اَوْلَادًا وَّ مَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِیْنَ ط

(۳۴/۳۴-۳۵)

اور ہم نے تو جس بستی میں جو بھی آگاہ کرنے والا بھیجا وہاں کے خوشحال لوگوں نے یہی کہا کہ جس چیز کے ساتھ تم بھیجے گئے ہو ہم اس کے ساتھ کفر کرنے والے ہیں اور کہا ہم مال و اولاد میں بہت بڑھے ہوئے ہیں یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم عذاب میں مبتلا ہوں۔

بالفاظِ دیگر مال و دولت اور بیٹوں کی کثرت امراء کے دماغوں میں یہ خناس بھر دیتی

Marfat.com

ہے کہ وہ اپنی دانست میں خود کو خدا کے چہیتے فرض کر بیٹھتے ہیں اور یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ مال و اولاد کی کثرت کی وجہ سے ہم پر کوئی عذاب نہیں آئے گا۔ اس خوش فہمی میں حد سے باہر نکل جاتے ہیں حق کی بات سننے سے انکاری ہو جاتے ہیں بلکہ حق کی بات سے چڑنے لگتے ہیں۔ ان کو لاکھ نصیحت کی طرف بلایا جائے مگر یہ اس سے بھاگتے ہیں۔ نتیجتاً ایک بھیانک تباہی انہیں دبوچ لیتی ہے جو اس طرزِ عمل کا منطقی نتیجہ ہوتی ہے۔ تاہم اس تباہی سے پہلے اتمام حجت کی تکمیل کے لیے ہدایت کی راہ روشن کی جاتی ہے۔

## ۲۔ تباہی سے پہلے اتمام حجت

زیر بحث تیسرے قانون کو قرآن مجید کی جن آیات سے مستنبط کیا گیا ہے اگر ان آیات (۶۰۔۵۸/۲۸) پر مزید تدبر کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ کسی بھی بستی کی مکمل تباہی اس وقت عمل میں آتی ہے جب معیشت کی افراط سے اہل معیشت کا تکبر حد سے بڑھ جائے تاہم اس سے قبل کہ اس بستی کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے اتمام حجت کی تکمیل کے لیے پہلے پیغمبر بھیجے جاتے تھے جو لوگوں کو راہ ہدایت کی تلقین کرتے لیکن خود قرآن مجید شاہد ہے کہ بہت کم لوگ اس مرحلے پر راہ ہدایت قبول کرتے اور جب ان کی راہ ہدایت پر آنے کی تمام امیدیں معدوم ہو جاتیں تو ان پر عذاب کا کوڑا برسا دیا جاتا۔ جس طرح حضرت نوح علیہ السلام کے الفاظ شاہد ہیں۔

قَالَ رَبِّ اِنِّیْ دَعَوْتُ قَوْمِیْ لَیْلًا وَّ نَهَارًاۙ۰ فَلَمْ یَزِدْهُمْ دُعَآءِیْۤ اِلَّا فِرَارًا۰ وَ اِنِّیْ كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوْۤا اَصَابِعَهُمْ فِیْۤ اٰذَانِهِمْ وَ اسْتَغْشَوْا ثِیَابَهُمْ وَ اَصَرُّوْا وَ اسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا۰ ثُمَّ اِنِّیْ دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا۰ ثُمَّ اِنِّیْۤ اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَ اَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًا۰ فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ط (۱۰۔۵/۷۱)

(نوح علیہ السلام نے) کہا اے میرے رب میں نے اپنی قوم کو رات دن

تیری طرف بلایا۔ مگر میرے بلانے سے یہ لوگ اور زیادہ بھاگنے لگے۔ میں نے جب بھی انہیں تیری بخشش کے لیے بلایا انہوں نے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ڈال لیں اور اپنے کپڑوں کو اوڑھ لیا اور اڑ گئے اور بڑا تکبر کیا پھر میں نے انہیں بآواز بلند بلایا اور بے شک میں نے انہیں اعلانیہ بھی کہا اور چپکے چپکے بھی اور میں نے کہا اپنے رب سے اپنے گناہوں کی بخشش مانگو وہ یقیناً بڑا بخشنے والا ہے۔

لیکن ان کی قوم پر دیگر اقوام کی طرح جب کسی قسم کا کوئی اثر نہیں ہوا اور وہ اپنی جاہلیت پر اسی طرح اڑے رہے تو پھر مجبوراً حضرت نوح علیہ السلام کو خود اپنے رب سے کہنا پڑا کہ:

وَقَالَ نُوحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ دَيَّارًا ۝

(۷۱/۲۶)

اور (حضرت) نوح (علیہ السلام) نے کہا اے میرے رب! تو روئے زمین پر کسی کافر کو بستا نہ رہنے دے۔

اور پھر یقیناً طوفانِ نوح نے حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کو آنے والوں کے لیے سامانِ عبرت بنادیا۔

اللہ تعالیٰ کی یہ سنت آج بھی بدستور جاری ہے کیونکہ ظاہر ہے اس کی سنت کبھی تبدیل نہیں ہوتی (۳۳/۶۲) لیکن اب جبکہ باب نبوت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند ہو چکا ہے لہٰذا اب اس سنت کی تکمیل کی صورت یہ ہوتی ہے کہ کسی بھی قوم کی تباہی سے قبل اسے مختلف حادثات و واقعات کی شکل میں وارننگ دی جاتی ہے اگر وہ قوم اس وارننگ کو بروقت سمجھ کر اپنے غلط افعال سے رجوع کرلے اور راہ ہدایت قبول کرلے تو صورتِ حال تبدیل ہوجاتی ہے لیکن اگر اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں ماؤف ہوچکی ہوں اور وہ بدستور گمراہی کی راہ پر چلتی چلی جائے تو پھر حتمی تباہی اس کا مقدر بن جاتی ہے۔

## ۳۔ قوم کی اجتماعی تباہی

نہ صرف متذکرہ بالا آیات (۶۰۔۵۸/۲۸) بلکہ دیگر انبیاء کی اقوام کی تباہی کی داستانیں بھی اس امر پر گواہ ہیں کہ کسی بستی یا قوم کی حتمی تباہی اسی وقت ہوتی ہے جب اس بستی یا قوم میں رہنے والے افراد من حیث القوم ظلم پر کمربستہ ہو جائیں۔ بالفاظِ دیگر جب تک کوئی ذرا سی بھی امید باقی ہوتی ہے اللہ کا عذاب ادھر کا رخ نہیں کرتا۔ عذاب صرف آخری چراغ کے گل ہو جانے پر ہی آتا ہے۔

وَ مَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّ اَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ (۱۱/۱۱۷)

اور آپ کا رب ایسا نہیں کہ کسی بستی کو ظلم سے ہلاک کر دے جبکہ وہاں کے باشندے نیکوکار ہوں۔

## ۴۔ متاع کا تصور:

متذکرہ بالا آیات جن سے تیسرا قانون اخذ کیا گیا ہے یعنی (۶۰۔۵۸/۲۸) سے ایک اور اہم نتیجہ یہ بھی اخذ ہوتا ہے کہ دنیاوی ساز و سامان محض متاع ہے یعنی عارضی منفعت کی اشیاء یا ضرورت کا ساز و سامان بالفاظِ دیگر تمام ایسی اشیاء ضرورت جن سے منفعت حاصل ہو لیکن وہ باقی رہنے والی نہ ہوں بلکہ ختم ہو جائیں۔

یہاں توجہ طلب امر یہ ہے کہ ایسی بستیاں جو معیشت کی افراط سے متکبر ہو جاتی ہیں ان کی تباہی کے بعد یہ کہا گیا ہے کہ انسانوں کو جو کچھ دیا گیا ہے وہ محض دنیا میں ضرورت کی اشیاء ہیں ان سے فائدہ اٹھانا اور انہیں اپنے مفاد کے لیے استعمال کرنا تو بجا ہے لیکن ان کو باعث فخر بنا لینا اور ان پر اترانے لگ جانا محض نادانی ہے۔ سفر کے سامان کی حیثیت محض سفری سامان کی ہی ہوتی ہے اس کے متعلق یہ تصور کر لینا کہ یہی منزل مقصود ہے زندگی کے اعلیٰ اور ارفع مقاصد کی صریحاً توہین ہے اور یہ توہین جہالت بلکہ بدترین جہالت ہے۔ جس کا انجام محض تباہی ہے لہٰذا دنیاوی حیات کی اشیاء کو وہی مقام دینا چاہیے جو ان کے لیے روا

ہے۔ زندگی اتنی بے کار شے نہیں کہ اسے چند عارضی اشیاء کی تعداد گننے میں ضائع کر دیا جائے۔ زندگی بلند اور اعلیٰ مقاصد کے حصول کی جدوجہد کا نام ہے اور جو اسے محض ضروریات کی اشیاء کی تعداد میں اضافے کو گننے اور اس پر استکبار کرنے پر ضائع کر دیں وہی خسارے میں رہ جانے والے ہیں۔

## چوتھا قانون: بخل سے معیشت تنگ ہو جاتی ہے

بخل سے مراد یہ ہے کہ انسان اپنی چیزوں کو ایسی جگہوں پر روک لے جہاں انہیں روکنا نہیں چاہئے۔ اس کی دو صورتیں ممکن ہیں ایک یہ کہ انسان خود ایسا کرے اور دوسرے یہ کہ دوسروں کو بھی ایسا کرنے کا حکم دے۔ اسی حوالے سے شح اس جذبے کو کہتے ہیں جس کے تحت انسان ایسا کرتا ہے یعنی شح میں حرص اور بخل دونوں جذبے شامل ہو جاتے ہیں۔

بخل، انفاق کی ضد ہے۔ انفاق سے مراد ہے اپنی ضرورت سے زائد ہر چیز کو اللہ کی راہ میں کھلا رکھنا جبکہ بخل کے تحت انسان ضرورت کے تحت بھی اپنی زائد از ضرورت اشیاء (مال و دولت) دوسروں کو نہیں دینا چاہے دوسرا کتنا ہی ضرورت مند کیوں نہ ہو اور خود انسان کے پاس کتنا ہی زائد از ضرورت مال و دولت کیوں نہ ہو۔ بخل کرنے والا، بخیل کہلاتا ہے۔ بخل ایک سخت ناپسندیدہ فعل ہے اور قرآن مجید میں کم از کم بارہ (۱۲) مقامات پر اس فعل کی مذمت کی گئی ہے اور اس کا بھیانک انجام بتایا گیا ہے۔

وَ اَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَ اسْتَغْنٰیۙ۝ وَ كَذَّبَ بِالْحُسْنٰیۙ۝ فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰیؕ۝ وَمَا یُغْنِیْ عَنْهُ مَالُهٗۤ اِذَا تَرَدّٰیؕ (۹۲/۸-۱۱)

اور جس نے بخیلی کی اور لا پرواہی برتی اور نیک بات کی تکذیب کی تو ہم بھی اس کے لیے تنگی اور مشکل کا سامان میسر کر دیں گے اس کا مال اسے (اوندھا) گرنے کے وقت کچھ کام نہیں آئے گا۔

ان آیات کریمہ کی رو سے تین افعال یعنی بخل، لاپرواہی اور نیک باتوں کی تکذیب کا

Marfat.com

نتیجہ بیان کیا گیا ہے جو تنگی اور مشکلات کی شکل میں سامنے آتی ہیں۔

نیز یہ افعال انسان کو منہ کے بل نیچے بھی گرا بھی دیتے ہیں۔ بخل کی وضاحت اوپر کی جا چکی ہے۔ استغنیٰ کے لفظی معنی ہوتے ہیں بے نیازی، تونگری، آسودگی، خوشحالی وغیرہ۔ اس کا مادہ غ ن ی ہے جس کے معنی کافی ہونا کے آتے ہیں۔ جب یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے لیے استعمال ہوگا تو اس سے مراد یہ ہوگی کہ اللہ تعالیٰ کسی بھی شے کی ضرورت سے بے نیاز ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ لَغَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ ؕ (۲۹/۶)

بے شک اللہ تمام جہانوں سے بے نیاز ہے۔

باالفاظِ دیگر وہ کسی بھی قسم کی حاجت سے بے نیاز ہے۔ تاہم متذکرہ بالا آیات (۹۲/۸۔۱۱) میں اس سے مراد لا پرواہی ہے یعنی کسی امر کی استطاعت رکھتے ہوئے اس سے بے نیاز ہو جانا۔ باالفاظِ دیگر کسی دوسرے کو منفعت نہ پہنچانا۔ بخل کا تعلق تو پھر مال و دولت کو روک لینے سے ہے لیکن یہاں استغنیٰ بہت وسیع مفہوم کا حامل ہے اس میں وہ تمام افعال شامل ہو جائیں گے جہاں کوئی شخص کسی دوسرے شخص کو کسی بھی حوالے سے منفعت پہنچانے یا اس کی تکلیف دور کرنے یا اسے سہولت پہنچانے کی پوزیشن میں ہو اور اس کے باوجود ایسا نہ کرے اور لا پرواہی یا بے نیازی کا رویہ اختیار کرے۔

اسی طرح نیک باتوں کی تکذیب سے کیا مراد ہے؟ اس کو جاننے سے پہلے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ بذات خود تکذیب سے کیا مراد ہے؟ تکذیب کا مادہ ک ذ ب ہے جس کے معنی ہیں جانتے بوجھتے کسی چیز کے متعلق خلاف حقیقت خبر دینا۔ اس کے علاوہ تکذیب یہ بھی ہے کہ انسان جس بات کی صداقت کا قائل ہو اس پر ایمان کا مدعی بھی لیکن اس کا عمل اس کے ایمان کی شہادت نہ دے اس بنیاد پر نیک باتوں کی تکذیب سے مراد یہ ہوگی کہ ایسی چیزیں جن پر انسان ایمان کا مدعی تو ہو لیکن عملی طور پر یا تو انہیں کرنے سے انکاری ہو یا کرتا بھی ہو تو بے دلی اور بوجھ کے ساتھ۔ اس کی بہترین وضاحت سورۃ الماعون میں کر دی گئی

جہاں ارشاد ربانی ہے۔

اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ۝ فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ ۝ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ۝ وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ۝

(۱۰۷/۱۔۷)

بھلا آپ نے اس شخص کو دیکھا ہے جو روز جزا کو جھٹلاتا ہے یہ وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتا تو ایسے نمازیوں کے لیے خرابی ہے جو نماز کی طرف سے غافل رہتے ہیں اور برتنے کی چیزیں عاریتاً (بھی) نہیں دیتے۔

متذکرہ بالا سورۃ میں تین باتوں پر زور دیا گیا ہے اوّل روز قیامت کا انکار، دوم بخل اور سوم نمازوں سے غفلت جہاں تک ان تین افعال کو انجام دینے والوں کے انجام کا تعلق ہے متذکرہ بالا آیات (۹۲/۸۔۱۱) سے دو باتیں بالکل واضح ہیں۔ اوّل یہ کہ ان لوگوں کو تنگی اور مشکلات کا سامنا کرنا ہوگا دوم یہ کہ ان کا مال جو وہ بخل سے بچاتے ہیں خود ان کے لیے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی تباہی کا سبب بن جاتا ہے۔ ان دونوں نتائج کا انفرادی تجزیہ مندرجہ ذیل ہے۔

## ا۔ بخل کے نتیجے میں تنگی اور مشکلات

اس پہلے نتیجے کے لیے ان آیات میں جو الفاظ استعمال کیے گئے ہیں وہ فسینسرہ اور للیسری کے ہیں۔ فسینسرہ کا مادہ ی س ر ہے جس کے بنیادی معنی نرمی، سہولت آسانی، فراخی، آسودگی کے ساتھ ساتھ معاملے کے آسان اور سہل ہونے کے یا با آسانی مہیا ہونے کے بھی ہیں۔ سورۃ المزمل کی بیسویں آیت میں اسے آسانی کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ سورۃ البقرہ میں خمر اور میسر کے متعلق ارشاد ربانی ہے:

Marfat.com

فِیْهِمَآ اِثْمٌ كَبِیْرٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَ اِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا (۲/۲۱۹)

ان میں نقصانات زیادہ ہیں اور لوگوں کے لیے کچھ فوائد بھی ہیں مگر ان کے نقصانات فوائد سے کہیں زیادہ ہیں۔

یہاں میسر، یسر سے ہے جس کے بنیادی معنی آسانی کے ہیں۔ اسی طرح عسر کا مادہ ع س ر ہے جس کے معنی تنگی، سختی، مصیبت اور مشقت وغیرہ کے ہیں۔ سورۃ الفرقان میں ارشاد ربانی ہے۔

وَ كَانَ یَوْمًا عَلَى الْكٰفِرِیْنَ عَسِیْرًا (۲۵/۲۶)

وہ دن کافروں کے لیے بڑی سختی کا ہوگا۔

اس کے علاوہ معاملات میں کشادگی کی کمی اور باہمی کھنچاؤ کو بھی عسر کہتے ہیں۔ مزید برآں معاشی تنگدستی، غربت وافلاس کو عسر کہتے ہیں۔ سورۃ الم نشرح میں ارشاد ربانی ہے:

فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًاۙ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًاؕ (۹۴/۵-۶)

پس یقیناً مشکل کے ساتھ آسانی ہے بے شک مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔

ان دونوں الفاظ کے اس پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے جب متذکرہ بالا آیات (۹۲/۸-۱۱) میں ان الفاظ پر تدبر کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ بخل کی تقدیر جو حق تعالیٰ نے متعین کی ہے وہ یہ ہے کہ بخل، بخیل کے لیے تنگدستی، مشکلات اور مصائب کی راہ آسان کر دیتا ہے۔ یہ ایسی چیزیں ہیں جنہیں کوئی انسان اپنے لیے کبھی بھی پسند نہیں کرتا لیکن بخیل اپنے بخل سے خود ان چیزوں کی طرف آسانی سے کھنچا چلا جاتا ہے۔ ظاہر ہے یہ قادر مطلق کی متعین کردہ تقدیر ہے جسے کوئی تبدیل نہیں کر سکتا۔ یہ ممکن ہی نہیں ہے۔ اس تقدیر کے تحت بخیل آ بیل مجھے مار کے مصداق خود بیل کے لیے راہ ہموار کرتا ہے۔

Marfat.com

## ii۔ بخل کا مال تباہی کا سبب:

بخیل کا یہ حتمی انجام ہے پہلے وہ بتدریج، آہستہ آہستہ، تنگدستی، مشکلات اور مصائب کو اپنے تک پہنچنے کی راہ ہموار کرتا ہے اور اگلے مرحلے میں تباہی کے گڑھے میں جا گرتا ہے جیسا کہ (۹۲/۱۱) میں صراحت کر دی گئی ہے کہ بخیل کا مال اس کو کوئی فائدہ نہیں دے گا جب وہ تباہیوں کے جہنم میں سر کے بل گرے گا۔ متذکرہ بالا آیت میں تردی کے معنی ہیں اپنے آپ کو تباہیوں کے سامنے پیش کر دینا۔ اس لفظ کے معنی تباہی، بربادی اور ہلاکت کے بھی آتے ہیں۔ جیسا کہ سورۃ طٰہٰ میں ہے فتردی (۲۰/۱۶) ''تو ہلاک ہو جائے''۔ اس طرح سورۃ حم السجدہ میں ہے اردٰکم (۴۱/۲۳) ''تباہ و برباد کر دینا''۔ گویا اس ایک لفظ تردی میں ان تمام تباہیوں کو سمو دیا گیا ہے جن کا سامنا ایک بخیل کو کرنا پڑتا ہے۔

اس بحث کی روشنی میں یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ بخل کی تقدیر کتنی بدترین تقدیر ہے جس کا انتخاب کوئی بھی انسان کر سکتا ہے۔ بخیل کے بخل کی وجہ سے اللہ کی رحمت اس سے منہ موڑ لیتی ہے۔

الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ ؕ وَمَنْ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ۔ (۵۷/۲۴)

جو لوگ (خود بھی) بخل کرتے ہیں اور لوگوں کو (بھی) بخل کی تلقین کرتے ہیں اور جو شخص (اس نصیحت) سے روگردانی کرے تو اللہ بھی بے شک بے نیاز اور سزاوار حمد ہے۔

باالفاظِ دیگر بخل کو خدائی احکامات سے روگردانی قرار دیا گیا ہے اور جو خدائی احکام سے روگردانی کرتا ہے تو اللہ بھی اس سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ بخل کتنی بڑی خرابی ہے اس کا اند اس امر سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ بخیل قوم کو دنیا میں رہنے کا حق ہی نہیں دیا گیا ہے بخیل قوم کو ہٹا کر قانونِ قدرت کوئی دوسری قوم لے آتا ہے۔ یہ بھی مشیت ایزدی کی متعین

Marfat.com

کردہ تقدیر ہے جس سے فرار ممکن نہیں۔

هٰاَنْتُمْ هٰؤُلَاۤءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَمِنْكُمْ مَّنْ یَّبْخَلُ وَ مَنْ یَّبْخَلْ فَاِنَّمَا یَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ وَ اللّٰهُ الْغَنِیُّ وَ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ وَ اِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَكُمْ ثُمَّ لَا یَكُوْنُوْۤا اَمْثَالَكُمْ ط (۴۷/۳۸)

خبردار! تم وہ لوگ ہو کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے لیے بلائے جاتے ہو تو تم میں سے بعض بخیلی کرنے لگتے ہیں اور جو بخیلی کرتا ہے تو اپنے نفس سے بخیلی کرتا ہے اور اللہ غنی ہے اور تم فقیر (اور محتاج) ہو اگر تم (ان کے احکام سے) روگردانی کرو گے تو وہ (تم کو ہٹا کر) تمہاری جگہ ایک دوسری قوم لے آئے گا پھر وہ تمہاری طرح نہ ہوں گے۔

بخل کرنے والے کی صرف دنیا ہی برباد نہیں ہوتی بلکہ وہ آخرت میں بھی بدترین عذاب کا حقدار ٹھہرے گا۔

كَلَّا اِنَّهَا لَظٰى o نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى o تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ وَ تَوَلّٰى o وَ جَمَعَ فَاَوْعٰى ط (۷۰/۱۵-۱۸)

ہرگز نہیں وہ بلاشبہ بھڑکتی ہوئی آگ ہے کھال ادھیڑ ڈالنے والی ان لوگوں کو اپنی طرف بلائے گی جنہوں نے (دین حق سے) اعراض کیا اور منہ پھیرا اور مال جمع کر کے (اسے) بند کر کے رکھا۔

وہ مال و دولت اور سونا چاندی جسے اللہ کی راہ میں خرچ نہ کیا جائے اسے روزِ قیامت جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا اور اس سے بخل کرنے والوں کی پیشانیاں، پیٹھیں اور پہلو داغے جائیں گے یہ ان کے مال و دولت جمع کرنے کا انجام ہوگا۔

یَّوْمَ یُحْمٰی عَلَیْهَا فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰی بِهَا جِبَاهُهُمْ وَ جُنُوْبُهُمْ وَ ظُهُوْرُهُمْ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ط

(۹/۳۵)

جس دن وہ (مال) دوزخ کی آگ میں گرم کیا جائے گا پھر اس سے ان (بخیلوں) کی پیشانیاں اور پہلو اور پیٹھیں داغی جائیں گی (اور کہا جائے گا کہ) یہ وہی ہے جو تم نے اپنے لیے جمع کیا تھا سو جو تم جمع کرتے تھے (اب) اس کا مزہ چکھو۔

اس کے علاوہ سورۃ الھمزۃ میں بھی ایسے لوگوں کے لیے بدترین وعید ہے جو ان الفاظ میں دی گئی ہے۔

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِۨ ﴿﴾ الَّذِىْ جَمَعَ مَالًا وَّ عَدَّدَهٗ ﴿﴾ يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخْلَدَهٗ ﴿﴾ كَلَّا لَيُنْۢبَذَنَّ فِى الْحُطَمَةِ ﴿﴾ وَ مَاۤ اَدْرٰىكَ مَا الْحُطَمَةُ ﴿﴾ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ﴿﴾ الَّتِىْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ ﴿﴾ اِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّؤْصَدَةٌ ﴿﴾ فِىْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ﴿﴾ (۱۰۴/۱-۹)

ہر طعن آمیز باتیں کرنے والے چغل خور کے لیے جہنم ہے جو مال جمع کرتا اور اس کو گن گن کر رکھتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ اس کا مال اس کی ہمیشہ کی زندگی کا موجب ہوگا ہرگز نہیں وہ ضرور حطمہ میں ڈالا جائے گا اور تم کیا سمجھے کہ حطمہ کیا ہے؟ وہ خدا کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے جو دلوں پر جا لپٹے گی اور وہ اس میں بند کر دیے جائیں گے یعنی (آگ کے) لمبے لمبے ستونوں میں۔

ان آیات کریمہ کے علاوہ (۳/۱۸۰)، (۴/۳۶-۳۷) اور (۶۹/۲۵-۳۷) میں بھی بخیلوں کے لیے انتہائی سخت عذاب کی وعید موجود ہے۔ لہٰذا ہر لحاظ سے یہ ایک انتہائی بری تقدیر ہے جس کا انجام دنیا اور آخرت دونوں جگہ تباہی ہے بلکہ آخرت کی تباہی تو کہیں زیادہ بڑھ کر ہے۔

Marfat.com

## پانچواں قانون: سماجی تحفظ کے نظام کی عدم موجودگی سے رزق کی تنگی

رزق کی بستگی کے اس قانون کے تحت اگر معاشرہ مجموعی طور پر اپنے معاشی لحاظ سے پس ماندہ طبقات کی دادرسی کا انتظام نہیں کرتا یا آج کی اصطلاح میں سماجی تحفظ کا کوئی جامع نظام وضع نہیں کرتا تو وہ معاشرہ خود اپنا رزق تنگ کر لیتا ہے۔

فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَ نَعَّمَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْۤ اَكْرَمَنِ ؇ وَ اَمَّاۤ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْۤ اَهَانَنِ ؇ كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ ؇ وَ لَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ؇ وَ تَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا ؇ وَّ تُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ؇

(۸۹/۱۵-۲۰)

انسان (کا یہ حال ہے کہ) جب اسے اس کا رب آزماتا ہے اور عزت اور نعمت دیتا ہے تو وہ کہنے لگتا ہے کہ میرے رب نے مجھے عزت دی۔ اور جب وہ اس کو آزماتا ہے اس کی روزی تنگ کر دیتا ہے تو وہ کہنے لگتا ہے کہ میرے رب نے میری اہانت کی (اور ذلیل کیا)۔ ایسا ہرگز نہیں بلکہ (بات یہ ہے) کہ تم (ہی) لوگ یتیموں کی عزت نہیں کرتے اور مسکینوں کو کھلانے کی ایک دوسرے کو ترغیب نہیں دیتے اور میراث کا مال سمیٹ سمیٹ کر کھا جاتے ہو۔ اور مال کو جی بھر کر عزیز رکھتے ہو۔

متذکرہ بالا آیات (۸۹/۱۵-۲۰) میں اللہ تعالیٰ نے انسانی کردار کے ایک پہلو کی انتہائی جامع انداز میں نشاندہی کی ہے۔ جس کے تحت انسان کو جب اللہ تعالیٰ کسی نعمت سے نوازتا ہے تو انسان یہ کہنے لگتا ہے کہ اسے اس کے رب نے عزت دی۔ لیکن جب اس کے اپنے افعال واعمال کے نتیجے میں رزق تنگ ہونے لگتا ہے تو انسان یہ واویلا مچانے لگتا ہے کہ میرے رب نے مجھے ذلیل کیا یا میری اہانت کی ایسا نہیں اللہ کسی پر کبھی کسی صورت ظلم

Marfat.com

نہیں کرتا یہ اس کی شان سے بہت بعید ہے بلکہ یہ خود انسان کے اپنے اعمال ہوتے ہیں جو اس کے سامنے رزق کی بندش کی شکل میں آتے ہیں۔ متذکرہ بالا آیات (۲۰۔۱۵/۸۹) میں کن افعال کو رزق کی بستگی کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے یہ سوال تفصیلی تجزیے کا متقاضی ہے۔ ان آیات کریمہ کی رو سے بنیادی طور پر یہ دو افعال ہیں اوّل یتیموں کی عزت نہ کرنا اور مساکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہ دینا دوم مال سے اندھا دھند محبت اور حصول مال میں حلال و حرام کی تمیز بھی نہ رکھنا۔ ان دونوں وجوہات یا افعال سے اقوام کا رزق تنگ ہو جاتا ہے۔ ان افعال کا تجزیہ مندرجہ ذیل ہے۔

### i۔ یتیموں کی عزت نہ کرنا اور مساکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہ دینا

اس حوالے سے کسی بحث سے قبل یہ ضروری ہے کہ یہ طے کرلیا جائے کہ از روئے قرآن یتیموں اور مساکین سے کون سے افراد مراد ہیں؟

### یتیم:

اس لفظ کا مادہ ی ت م ہے جس کے بنیادی معنی اکیلا اور تنہا رہ جانا ہیں۔ بن باپ کے بچے کو یتیم اس لیے کہا جاتا ہے کیونکہ وہ اکیلا رہ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے معنی کمزور اور ضعیف ہو جانا، قاصر ہو جانا، تھک جانا اور درماندہ ہو جانے کے بھی آتے ہیں۔ نیز اس کے معنی فکر اور غم کرنے، دیر کرنے اور غفلت کرنے کے بھی آتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کے معنی حاجت اور ضرورت کے بھی ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ (۹۳/۶) میں یتیم ان لوگوں کو بھی کہا گیا ہے جو پناہ سے محروم ہوں۔

### مسکین:

مسکین کا مادہ س ک ن ہے اس کے بنیادی معنی ہیں حرکت میں نہ رہنا ٹھہر جانا، سکون کسی چیز کے حرکت کے بعد ساکن ہو جانے کو کہتے ہیں۔ اس بنیاد پر مسکین اسے کہا جاتا ہے جس کی حرکت کو فقر اور محتاجی نے کم کر دیا ہو۔ یہ فقیر سے زیادہ محتاج ہوتا ہے نیز ذلیل اور

کمزور کو بھی مسکین کہتے ہیں۔ سورۃ الکہف میں اسے کمزوری اور ناداری کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے مسکین سے مراد وہ تمام افراد ہوتے ہیں جن کا چلتا ہوا کاروبار رک جائے یا کسی حادثے کی وجہ سے حرکت و عمل سے محروم ہو گئے ہوں نیز ایسے لوگ بھی جو معاشرے میں تنہا رہ گئے ہوں (۱۶۔۱۵/۹۰)۔

تصریحات بالا سے واضح ہے کہ یتیم سے مراد وہ بچے ہی نہیں جو بن باپ کے رہ جائیں بلکہ وہ تمام تر افراد شامل ہیں جو کسی بھی وجہ سے معاشی امداد کے حاجت مند ہوں اور اسی طرح مساکین سے مراد وہ افراد ہیں جو معاشی امداد کے طالب ہوں۔ ان افراد کی مدد یقیناً انفرادی سطح پر ممکن ہے اور لوگ یقیناً اپنی اپنی بساط کے مطابق کرتے بھی ہیں لیکن یہ امداد نہ صرف یہ کہ کافی نہیں ہوتی بلکہ بے شمار لوگ اس سے محروم بھی رہ جاتے ہیں۔ اس کا واحد حل اداروں کا قیام ہے۔ سماجی تحفظ کے مختلف ادارے۔ ان اداروں کا قیام ظاہر ہے حکومتی سطح پر ممکن ہے لہٰذا یہ ایک انفرادی سے زیادہ اجتماعی ذمے داری ہے اور معاشرے کی اپنی معاشی بقا کے لیے یہ لازمی ہے۔ یہ ایک سیدھی سادی معاشی حقیقت ہے کہ صرف ایک دوکان بند ہونے یا صرف ایک آدمی کے بے روزگار ہونے سے صرف ایک دوکان یا ایک فرد بے روزگار نہیں ہوتا بلکہ اس وجہ سے کئی افراد منفی طور پر متاثر ہوتے ہیں اور اگر اس پر بند نہ باندھا جائے تو معیشت میں پھیلنے والا یہ ڈیپریشن آسیب کی طرح پوری معیشت کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ جدید مغربی معیشتوں میں تجارتی چکر کی شدت میں کمی کی وجہ ان کا بہترین سماجی تحفظ کا نظام ہی ہے۔ لہٰذا متذکرہ بالا آیات میں یتیم کی عزت نہ کرنے اور مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہ دینے کو محض سطحی انداز میں لینے کی بجائے اسے اس کے وسیع تر معنوں میں لیا جانا چاہیے جو متذکرہ بالا آیات کا حقیقی مفہوم بھی ہے۔

Marfat.com

## ii۔ مال کی اندھی ہوس

متذکرہ بالا آیات (۲۰۔۱۵/۸۹) میں رزق کی بستگی کی دوسری اہم وجہ مال و دولت کی اندھی ہوس بھی بتائی گئی ہے اس اندھی ہوس کے نتیجے میں جہاں ایک طرف معاشرے میں معاشی لحاظ سے کمزور اور پس ماندہ طبقے بڑھتے چلے جاتے ہیں تو دوسری طرف دولت محض چند ہاتھوں میں مرتکز ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ بالفاظ دیگر شدید معاشی عدم مساوات پیدا ہو جاتی ہے جو بذاتِ خود معیشت کی تباہی کا سبب بن جاتی ہے۔

لہٰذا کسی بھی معاشرے میں صرف اس وقت تک ہی افراطِ رزق کی ضمانت دی جاسکتی ہے جب تک کہ اس معاشرے کے افراد انفرادی اور اجتماعی دونوں لحاظ سے معاشرے کے معاشی لحاظ سے پس ماندہ، پیچھے رہ جانے والے، اکیلے رہ جانے والے، کسی حادثے کا شکار ہو جانے والے یا معاشی دوڑ میں پیچھے رہ جانے والے پناہ کے طالب لوگوں کے ساتھ وہی سلوک نہ کریں جس کی وہ دوسروں سے خود اپنے لیے توقع رکھتے ہیں۔ بصورت دیگر اس معاشرے اور اس کی معیشت کو تباہی سے کوئی نہیں روک سکتا۔

حذر آں کہ بہت سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

## چھٹا قانون: حبِ مال میں تباہی ہے:

قرآنی نقطۂ نگاہ سے مال کی جو اہمیت ہے اس پر چوتھے باب میں تفصیل سے بحث کی جاچکی ہے لہٰذا مال کا حصول کوئی ناپسندیدہ شے نہیں ہے بلکہ ایک اچھے معیارِ زندگی کے حصول کے لیے جدوجہد کی جانی چاہئے۔ تاہم اصل غلطی وہاں سے شروع ہوتی ہے جب انسان مال کو زادِ سفر سمجھنے کی بجائے منزل سمجھ لیتا ہے اور اسی کو منتہا و مقصود جان کر زندگی کے اعلیٰ مقاصد کو نظر انداز کرنا شروع کر دیتا ہے بلکہ ان سے غافل ہو جاتا ہے۔ یہ گمراہی ہے اور ہر طرح کی گمراہی کی طرح اس کا انجام بھی محض تباہی ہے۔

Marfat.com

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ۙ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ؕ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ ثُمَّ
كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ؕ كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ؕ لَتَرَوُنَّ
الْجَحِيْمَ ۙ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ ۙ ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ
النَّعِيْمِ ؕ (۱۰۲/۱-۸)

زیادتی کی خواہش نے تمہیں غافل کر دیا ہے۔ یہاں تک کہ تم نے قبریں جا دیکھیں۔ ہرگز نہیں تم عنقریب معلوم کر لوگے ہرگز نہیں پھر تمہیں جلد معلوم ہو جائے گا دیکھو اگر تم جانتے یعنی علم الیقین (رکھتے تو غفلت نہ کرتے) تم ضرور دوزخ کو دیکھو گے پھر تم اسے یقین کی آنکھ سے دیکھ لوگے پھر اس دن تم سے ضرور بالضرور نعمتوں کے بارے میں سوال ہوگا۔

یہ آیات کریمہ صریحاً اس امر پر شاہد ہیں کہ انسان کی مال و دولت کی ہوس اسے اس کی صحیح منزل سے بھٹکا دیتی ہے۔

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّ لَهْوٌ وَّ زِيْنَةٌ وَّ تَفَاخُرٌ بَيْنَكُمْ وَ
تَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ؕ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ
يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا ؕ وَ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ
شَدِيْدٌ ۙ وَّ مَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانٌ ؕ وَ مَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ
الْغُرُوْرِ ؕ (۵۷/۲۰)

خوب جان رکھو کہ دنیا کی زندگی صرف کھیل تماشہ زینت اور آپس میں فخر (وغرور) اور مال و اولاد میں ایک کا دوسرے سے اپنے آپ کو زیادہ بتلانا ہے جیسے بارش اور اس کی پیداوار کسانوں کو اچھی معلوم ہوتی ہے پھر جب وہ خشک ہو جاتی ہے تو زرد رنگ میں تم اس کو دیکھتے ہو پھر وہ بالکل چورا چورا ہو جاتی ہے اور آخرت میں (کافروں کے لیے) سخت عذاب اور (مومنین

Marfat.com

کے لیے) خدا کی طرف سے مغفرت اور خوشنودی ہے اور دنیا کی زندگی متاع فریب کے سوا کچھ بھی نہیں۔

اگر انسان اپنی طلب کو ضروریات کی تکمیل تک محدود رکھے تو وہ حد میں رہتا ہے لیکن اگر نفس کے گھوڑے کو بے لگام چھوڑ دیا جائے تو ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی ہوس انسان کو کسی حد کا پابند نہیں رہنے دیتی کیونکہ اس کی کوئی حد ممکن ہی نہیں۔ انسان جتنا مال و دولت حاصل کرتا جاتا ہے اس کی ہوس اتنی ہی مزید بڑھ جاتی ہے اور پورا معاشرہ دولت کی ایک اندھی دوڑ کا شکار ہو کر تباہی کے گڑھے میں جا گرتا ہے۔ ظاہر ہے یہ ایک عام سی بات ہے انسان اگر جذبات سے ہٹ کر ٹھنڈے دل سے سوچے تو وہ خود جان سکتا ہے کہ یہ روش کس قدر تباہ کن ہوتی ہے اور اگر مزید تدبر کیا جائے تو باآسانی اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ روش انسانوں کو جس جہنم میں لے جاتی ہے اس کا انسان خود بھی اندازہ لگا سکتا ہے بشرطیکہ وہ اس اندھی دوڑ سے ایک لمحے کے لیے الگ ہو کر سوچے لیکن اس اندھی دوڑ کا کمال ہی یہ ہوتا ہے کہ انسان فہم و تدبر، عقل و بصیرت سے محروم ہو کر محض ایک دوسرے کے ساتھ تعداد میں اضافے کی جنگ میں اس طرح الجھ جاتا ہے کہ جب وہ جہنم کی آگ کو یقین کی آنکھ سے دیکھ لیتا ہے تو اس کی آنکھ کھلتی ہے لیکن ظاہر ہے اس وقت اس آنکھ کا کھلنا نہ کھلنا سب برابر ہو جاتا ہے۔ لہٰذا مال و دولت کی اندھی ہوس بھی محض تباہی کا ہی دوسرا نام ہے۔

## ساتواں قانون: تقسیم دولت میں عدم مساوات سے تباہی:

یہ ایک سیدھا سادا قانون فطرت ہے کہ معاشرے اور معیشت میں درجات کا فرق لازمی ہے۔ ہر شخص اللہ تعالیٰ کی جانب سے یکساں نوعیت کی صلاحیتیں لے کر نہیں آتا۔ اگر ایسا ہوتا تو انسانوں اور جانوروں یا انسانوں اور مشینوں میں کوئی فرق نہیں ہوتا اور نام نہاد سوشلزم کا لاطبقاتی معاشرے کا خواب پورا ہو سکتا تھا لیکن بہرحال ایسا نہیں ہے۔

Marfat.com

اَمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ رَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا وَّ رَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ (۴۳/۳۲)

کیا یہ لوگ آپ کے رب کی رحمت کو بانٹتے ہیں ہم نے ان میں ان کی معیشت کو دنیا کی زندگی میں تقسیم کر دیا اور ایک دوسرے پر درجے بلند کیے تا کہ ایک دوسرے سے خدمت لے اور جو کچھ یہ جمع کرتے ہیں تمہارے رب کی رحمت اس سے کہیں بہتر ہے۔

اس کے علاوہ درجات کے اس فرق کا تذکرہ (۱۹/۴۶)، (۳/۱۶۳)، (۴/۳۲)، (۴/۱۹۶)، (۶/۱۳۲)، (۶/۱۶۵) اور (۲۱/۱۷) میں بھی کیا گیا ہے۔

تاہم درجات کا یہ فرق جس کے بغیر معاشرت اور معیشت کا تصور بھی ممکن نہیں انسان کے ہاتھوں خود اس کی اپنی تباہی کا سبب بن جاتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ جو کمانے کی نسبتاً زیادہ استعداد رکھتے ہیں کسی بھی طرح بالعموم ناجائز اور حرام ذرائع سے دولت میں اضافہ کرتے چلے جاتے ہیں اور بتدریج معاشرے اور معیشت کے تمام یا بیشتر وسائل پر قابض ہو جاتے ہیں ان کی ہوس صرف یہیں پر ختم نہیں ہوتی بلکہ وہ معیشت کے تمام وسائل کا رخ صرف اپنے لیے مخصوص کر لیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معیشت میں دولت کی تقسیم میں شدید عدم مساوات پیدا ہو جاتی ہے اور پورا معاشرہ صرف دو طبقات میں تقسیم ہو جاتا ہے ایک وہ جو دولتمند ہوتے ہیں (which they haves) اور ایک غریب جو نان جویں سے بھی محروم ہو جاتے ہیں (which they do not have) دولت کی تقسیم میں یہ ناہمواری قوم اور معیشت دونوں کو تباہ کر دیتی ہے اس حوالے سے قوم ثمود کی مثال مشعل راہ ہے۔

قوم ثمود کے جو حالات قرآن مجید میں مذکور ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قوم کی

Marfat.com

سربراہی مفسدین کے ہاتھ میں تھی جو زمین میں مسلسل فساد پھیلاتے رہتے تھے اور کبھی اصلاح احوال کی نہیں سوچتے تھے۔

وَ لَا تُطِيعُوٓا اَمرَ الْمُسْرِفِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ ط (۲۶/۱۵۱۔۱۵۲)

اور (صالحؑ نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ) حد سے تجاوز کرنے والوں کے حکم کی اطاعت نہ کرو جو زمین میں فساد برپا کرتے رہتے ہیں اور اصلاح نہیں کرتے۔

فساد کی ایک بدترین شکل تقسیم رزق میں ناہمواری ہوتی ہے یعنی دولت کی تقسیم میں عدم مساوات۔ اس بدترین خرابی کے ذمے دار اس قوم میں از روئے قرآن نو (۹) سربرآوردہ اشخاص تھے جنہوں نے اپنا اوڑھنا بچھونا ہی فساد پھیلانا بنا رکھا تھا اور یہ سب کے سب مفسد تھے۔

وَ كَانَ فِى الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ ط (۲۷/۴۸)

اور شہر میں نو آدمی تھے جو زمین میں فساد پیدا کرتے رہتے تھے اور اصلاح نہیں کرتے تھے۔

بالفاظِ دیگر اگرچہ قوم ثمود میں فساد عام ہو چکا تھا لیکن اس فساد کا سرچشمہ ان کی اشرافیہ تھی۔ اور یہ ایک اور تاریخی اور ناقابل تردید حقیقت ہے کہ کسی بھی معاشرہ اور معیشت میں فساد ہمیشہ بالائی سطح سے شروع ہوتا ہے اور پھر بتدریج نچلی سطح تک سرائیت کرتا چلا جاتا ہے۔ اگر اس بالائی طبقہ کی اصلاح ہو جائے تو نچلی سطح کی اصلاح بہت آسان ہو جاتی ہے۔ بنا وجہ ہے کہ جہاں جہاں بھی پیغمبر مبعوث کیے گئے ان کی جانب سے اصلاح احوال کی ہر کوشش کی بنیادی مخالفت ہمیشہ اس معاشرے کے دولتمند طبقات نے کی۔

Marfat.com

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَۃٍ مِّنْ نَّذِیْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ط (۳۴/۳۴)

ہم نے کسی بستی میں نبی نہیں بھیجا کہ اس کے مالداروں نے یہ نہ کہا ہو کہ (اے رسولو) ہم تمہاری رسالت کے منکر ہیں۔

مالداروں یا معاشرہ کے طبقہ اشرافیہ کی جانب سے انبیاء کی تعلیمات کی مخالفت کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ یہ طبقہ پورا معاشی نظام اس طرح ترتیب دیتا تھا کہ دولت کا بہاؤ معاشرے کے نچلے طبقات سے اوپر والے طبقات کی طرف ہو جاتا تھا۔ جس سے ان کی دولت میں مزید اضافہ ہو جاتا تھا اور معاشرے کے پسماندہ طبقات مزید پسماندہ ہو جاتے تھے۔ یہ صورتِ حال آج بھی ہے ملکوں کے اندر بھی اور بین الاقوامی سطح پر بھی۔ آج بھی پوری دنیا کا معاشی نظام اس طرح مرتب ہوا ہے کہ پوری دنیا میں دولت کا بہاؤ کمزور طبقات سے بالادست طبقات کی جانب ہے جو بہر حال وحی کی روشنی سے محرومی کا لازمی نتیجہ ہے۔ اسی وحی کی روشنی کو لے کر جب حضرت صالح علیہ السلام اس قوم ثمود میں مبعوث ہوئے اور اپنی قوم کو کہا کہ اس فاسد نظام کی تباہ کاریوں سے ڈرو اور یہ فاسد نظام چھوڑ کر اللہ کے نظام کی رحمت میں آ جاؤ اور اس نظام میں چونکہ خود اللہ کا نبی مرکز کی حیثیت رکھتا ہے لہٰذا میری اطاعت اور فرمانبرداری کرو اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔

اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ صٰلِحٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ ۝ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوْنِ ط (۲۶/۱۴۲-۱۴۴)

جب ان سے ان کے بھائی صالح نے کہا کہ تم ڈرتے کیوں نہیں؟ میں تو تمہارا امانت دار پیغمبر ہوں تو اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو۔

اور ایسے لوگوں کی اطاعت مت کرو جو حد سے تجاوز کرنے والے ہیں۔

وَلَا تُطِیْعُوْٓا اَمْرَ الْمُسْرِفِیْنَ ط (۲۶/۱۵۱)

اور حد سے نکل جانے والوں کی اطاعت مت کرو۔

Marfat.com

ظاہر ہے اس کی مخالفت طبقۂ اشرافیہ اور اس وقت کے ہامان کی جانب سے شدید انداز میں ہوئی۔ جس کی صراحت قرآن مجید میں مختلف مقامات پر کی گئی ہے۔ یہاں اس اصل ما بہ النزع امر کا تعین لازمی ہے جو اللہ کے رسول اور ان کی قوم کے مابین نزاع کا سبب بنا۔ اس عہد میں مویشی، چراگاہیں، چشمے اور کھیت انسانوں کی کل دولت ہوا کرتے تھے۔ ارباب اقتدار دستیاب چراگاہوں اور پانی کے چشموں کو صرف اپنے مویشیوں کے لیے مخصوص کر لیا کرتے تھے اور غریبوں، کمزوروں اور پسماندہ طبقات کی اوّل تو باری ہی نہیں آتی تھی یا اگر آتی بھی تھی تو اس وقت جب طبقۂ اشرافیہ کے جانور مکمل طور پر سیر ہو جاتے تھے۔ بالفاظِ دیگر آج کی اصطلاح میں وسائل پیداوار پر چند مخصوص لوگوں کا قبضہ تھا اور باقی خلق خدا ان کا منہ دیکھتی رہتی تھی۔ حضرت صالح علیہ السلام کا بنیادی مطالبہ اللہ کی وحدانیت پر ایمان اور اعمال صالحہ تھا جس کی اساس ہی عدل اور احسان ہے یعنی معاشرے کے تمام افراد کے ساتھ عدل اور جس کسی میں کوئی کمی یا خامی رہ جائے یا جو معاشی دوڑ میں پیچھے رہ جائے اس کا ہاتھ تھام لینا۔ اس کے نتیجے میں طبقۂ اشرافیہ کی اجارہ داری یقیناً ختم ہو جاتی تھی جو انہیں یقیناً کسی صورت گوارا نہ تھا۔ حضرت صالحؑ نے اس کا ایک عملی طریقہ بھی تجویز کر دیا کہ جس سے اس وقت کے دستیاب وسائل کی مساوی تقسیم ممکن تھی انہوں نے اللہ کے حکم کے مطابق تمام لوگوں کی باری مقرر کر دی اور ان لوگوں کو آگاہ کر دیا گیا کہ تمام لوگ اپنی اپنی باری پر آئیں گے۔

وَ نَبِّئْهُمْ اَنَّ الْمَآءَ قِسْمَةٌ بَيْنَهُمْ كُلُّ شِرْبٍ مُّحْتَضَرٌ. (۵۴/۲۸)

ان کو آگاہ کر دو کہ ان میں پانی کی باری مقرر کر دی گئی ہے ہر (باری والے کو اپنی) باری پر آنا چاہیئے۔

اور اس مقصد کے لیے آزمائش کے طور پر ایک اونٹنی کو بھیجا گیا اور اسے فیصلہ کن نشانی قرار دیا گیا اور حکم دیا گیا کہ یہ اللہ کی زمین میں جہاں چاہے چرتی پھرے اسے کوئی نقصان

Marfat.com

نہیں پہنچائے گا ورنہ اللہ کا عذاب تمہیں جکڑ لے گا۔

هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ط (۷/۷۳)

یہ اللہ کی اونٹنی تمہارے لیے نشانی ہے پس اسے کھلا چھوڑ دو کہ اللہ کی زمین میں جہاں چاہے چرے اسے کسی طرح کا نقصان نہ پہنچاؤ ورنہ عذاب علیم تمہیں پکڑ لے گا۔

باالفاظِ دیگر یہ ایک آزمائش تھی اس امر کے جانچ کی کہ آیا قوم اور بالخصوص طبقۂ اشرافیہ اللہ کے احکامات کی کس قدر تعمیل کرتی ہے۔

اِنَّا مُرْسِلُوا النَّاقَةِ فِتْنَةً لَّهُمْ فَارْتَقِبْهُمْ وَاصْطَبِرْ ط (۵۴/۲۷)

(اے صالح) ہم اس اونٹنی کو آزمائش بنا کر بھیج رہے ہیں لہٰذا تم ان کی نگرانی کرو اور صبر سے کام لو۔

لیکن سرمایہ پرستی اور اقتدار کی لذت انسان کو اندھا بلکہ بالکل ہی اندھا کر دیتی ہے۔ اندازہ کیجیے ایک اونٹنی نے پوری چراگاہ میں کتنی گھاس کھالی ہوگی؟ ایسی گھاس جو بغیر کسی محنت مشقت کے دوبارہ خود بخود چند دن میں اُگ آتی ہے اس ایک اونٹنی نے ان مفسدوں کا کتنا نقصان کیا ہوگا؟ یا ان کے مال و دولت کے خزانوں میں کتنی ''کمی'' کر دی ہوگی؟ مسئلہ وہی ہے جو آنکھیں ماتھے پر ہیں وہ اندھی نہیں ہوتیں بلکہ جو قلب سینوں میں ہیں وہ اندھے ہو جاتے ہیں (۲۲/۴۶)۔ ہر وہ آمدنی جو باطل ذرائع سے حاصل ہوئی ہو وہ انسانی شخصیت کا توازن برباد کر دیتی ہے۔ بہر حال حضرت صالح علیہ السلام کی قوم سے اس اونٹنی کا وجود برداشت نہیں ہوا اور انہوں نے اس کو ہلاک کر ڈالا۔

فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطٰى فَعَقَرَ ط (۵۴/۲۹)

انہوں نے اپنے ساتھی کو پکارا پس اس نے (اونٹنی پر بھرپور) وار کیا اور (اسے) ہلاک کر ڈالا۔

Marfat.com

نتیجہ ظاہر ہے ایک بھیانک عذاب نے ان سب کو ہلاک کر ڈالا۔

فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَ نُذُرِ ٥ اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَكَانُوْا كَهَشِيْمِ الْمُحْتَظِرِ ط (۵۴/۳۰-۳۱)

پھر دیکھو میرا عذاب اور میرا ڈرانا کیسا تھا؟ (یعنی میرا عذاب کیسا سخت تھا اور میرا ڈرانا کیسا سچا تھا) ہم نے ان پر ایک ہی عذاب نازل کیا پس وہ ایسے ہو گئے جیسے باڑ بنانے والے کی روندی ہوئی گھاس۔

ظاہر ہے اللہ کی گرفت بہت شدید ہوتی ہے جس سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ اس میں یقیناً عبرت حاصل کرنے والوں کے لیے بڑی نشانی ہے۔

فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً وَّمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ٥ (۲۶/۱۵۸)

اور عذاب نے انہیں آ دبوچا بے شک اس میں نشانی ہے اور ان میں سے اکثر لوگ مومن نہ تھے۔

## نواں قانون: معاشی فساد سے تباہی

فساد قرآن مجید کی دیگر اصطلاحات کی طرح ایک بہت جامع اصطلاح ہے فساد کے بنیادی معنی توازن کا بگڑنا یا بے ترتیب ہو جانا ہے۔ یہ درحقیقت صلاح کی ضد ہے جس کے معنی توازن قائم کرنا اور ترتیب میں لانے کے ہوتے ہیں۔ فساد کی صورت میں عدم توازن کئی صورتوں میں ممکن ہوسکتا ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے مختلف النوع ناہمواریوں اور غلط افعال کو فساد کہا ہے مثلاً حرث و نسل کی تباہی فساد ہے (۲/۲۰۵)، صحیح ترتیب کو الٹ دینا فساد ہے (۲۷/۳۴)، ارتکاب جرم فساد ہے (۱۲/۷۳)، زمین میں خون بہانا فساد ہے (۲/۳۰)، صداقتوں سے انکار اور لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکنا فساد ہے (۱۶/۸۸) وغیرہ وغیرہ۔ اور فساد کا نتیجہ تباہی در تباہی ہے (۱۶/۸۸)

Marfat.com

تاہم زیرِ نظر قانون میں فساد کے ان پہلوؤں کو زیرِ بحث لایا گیا ہے جو معاشی معاملات سے متعلق ہیں۔ یہ مندرجہ ذیل ہیں۔

### i۔ چوری فساد ہے

از روئے قرآن چوری فساد ہے۔ یہ نتیجہ قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیت سے مستنبط ہے۔

قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِي الْاَرْضِ وَ مَا كُنَّا سَارِقِيْنَ ؕ (۱۲/۷۳)

وہ کہنے لگے کہ خدا کی قسم تم کو معلوم ہے کہ ہم (اس) ملک میں اس لیے نہیں آئے کہ فساد کریں اور نہ ہم چور ہیں۔

### ii۔ حرث و نسل کی تباہی فساد ہے

قرآن مجید میں خدائے علیم و خبیر کا ارشاد پاک ہے۔

وَ اِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَ يُهْلِكَ الْحَرْثَ وَ النَّسْلَ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ؕ (۲/۲۰۵)

اور جب پیٹھ پھیر کر چلا جاتا ہے تو زمین میں فساد پھیلانے کی اور کھیتی اور نسل کی بربادی کی کوشش میں لگا رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں کرتا۔

اس آیت کی رو سے کھیتی اور نسل کی بربادی فساد ہے۔ اس آیت میں استعمال کیا جانے والا لفظ حرث کا مادہ ح ر ث ہے جس کے بنیادی معنی کمانے اور کسب و ہنر کرنے کے ہیں تاہم یہ کاشتکاری کے لیے عام ہے۔ اس بنیاد پر کسی کی کمائی اور کسب و ہنر سے حاصل شدہ چیزوں کو برباد کرنا خواہ اس کی شکل کچھ ہی کیوں نہ ہو فساد ہے۔

### iii۔ یتیموں کی دیکھ بھال نہ کرنا فساد ہے

از روئے قرآن یتیموں کی دیکھ بھال نہ کرنا ان کے لیے خاطر خواہ انتظامات نہ کرنا ظلم

ہے اور فساد پھیلانے کے مترادف ہے۔

وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ط قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ط وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ط وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ط (۲/۲۲۰)

اور آپ سے یتیموں کے بارے میں بھی سوال کرتے ہیں آپ کہہ دیجئے کہ ان کی خیر خواہی بہتر ہے تم اگر ان کا مال اپنے مال میں ملا بھی لو تو وہ تمہارے بھائی ہیں فساد کرنے والا کون ہے اور اصلاح کرنے والا کون ہر ایک کو اللہ خوب جانتا ہے۔

جیسا کہ اسی باب میں یتیم کے متعلق عرض کیا جا چکا ہے لہٰذا اگر ایک معاشرہ بہ حیثیت مجموعی یا انفرادی سطح پر بھی یتیموں کی خیر خواہی نہیں کرتا تو یہ امر موجب فساد ہوگا۔

## iii۔ ناپ تول میں کمی فساد ہے

قرآن مجید نے صریحاً ناپ تول میں کمی کو فساد قرار دیا ہے۔

وَيٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَاۗءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ط (۱۱/۸۵)

اور اے میری قوم! تم ناپ اور تول کو انصاف کے ساتھ پورا کیا کرو اور لوگوں کو انکی چیزیں کم نہ دیا کرو اور زمین میں فساد اور خرابی نہ پھیلاؤ۔

اس آیت میں واضح طور پر ناپ تول کو پورا پورا رکھنے کا حکم ہے نہ صرف حکم ہے بلکہ یہاں لفظ قسط بھی استعمال کیا گیا ہے جس کا مادہ ق س ط ہے جس کے معنی ہیں مبنی بر عدل۔ قسط عدل کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ یہ واجبات کو پورا پورا ادا کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ بالفاظ دیگر مکمل انصاف کے ساتھ ناپ تول پورا رکھنے کا حکم ہے اور ایسا نہ کرنا فساد پھیلانے کے مترادف ہے۔

Marfat.com

## iv۔ قارون کی ذہنیت فساد ہے

قارون کی دولت ضرب المثل ہے لیکن وہ اس قابل نہیں تھا کہ اللہ کے بندوں پر اللہ کے وہ احسانات لوٹا سکتا جو اس پر اللہ تعالیٰ نے کیے تھے۔ بالفاظِ دیگر اس میں اتنی صلاحیت نہیں تھی کہ وہ اللہ کے دیئے ہوئے مال میں سے خلق خدا کا بھلا کر سکتا یا انفاق کر سکتا۔ اس صورت حال کو بھی فساد کہا گیا ہے۔

وَ ابْتَغِ فِيمَآ اٰتٰكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْاَرْضِ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ (۲۸/۷۷)

جو کچھ اللہ نے تجھے دے رکھا ہے اس سے آخرت (کی بھلائی) طلب کر اور اپنے دنیاوی حصے کو بھی نہ بھول اور جیسا کہ اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے تو بھی (لوگوں سے) بھلائی کر اور ملک میں فساد کا خواہاں نہ ہو کیونکہ اللہ مفسدوں کو دوست نہیں رکھتا۔

## v۔ ناانصافی پر مبنی معاشی نظام فساد ہے

قوم ثمود نے جو غلط اور لوٹ کھسوٹ پر مبنی معاشی نظام مرتب کر رکھا تھا اس کے متعلق بھی کہا گیا کہ یہ فساد ہے (۷/۴۴)۔

## vi۔ رزق کی بابت جھگڑا فساد ہے

رزق دینے والی اللہ کی ذات ہے اور اللہ رزق دیتا ہے اور بے حساب رزق بھی دیتا ہے لیکن یہ انسان ہی ہے جو اس بابت آپس میں جھگڑا شروع کر دیتے ہیں۔ رزق کی بات کسی قسم کی آویزش کو فساد قرار دیا گیا ہے۔

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ (۲/۶۰)

(اور ہم نے کہہ دیا کہ) اللہ کا دیا ہوا رزق کھاؤ پیو اور زمین میں فساد نہ کرتے پھرو۔

Marfat.com

متذکرہ بالا (٦) چھ افعال کو معاشی لحاظ سے فساد قرار دیا گیا ہے اور اس قسم کا کوئی بھی فعل جو فساد کے زمرے میں آتا ہو اس کا انجام صرف اور صرف تباہی ہے اس سے ماسوا کچھ نہیں۔

اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ زِدْنٰھُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ بِمَا کَانُوْا یُفْسِدُوْنَ ۝ (۱۶/۸۸)

جن لوگوں نے کفر کیا اور (لوگوں کو) اللہ کے راستے سے روکا ہم ان کو عذاب پر عذاب دیں گے اس لیے کہ فساد کیا کرتے تھے۔

مفسد یوم آخرت خسارے میں رہ جانے والوں میں سے ہوں گے۔

وَیُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْخٰسِرُوْنَ (۲/۲۷)

اور جو لوگ زمین میں فساد پھیلاتے ہیں وہی خسارہ اٹھانے والے ہیں۔

یہ وہ بدقسمت لوگ ہوتے ہیں جن کے کام کبھی نہیں سنورتے۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِیْنَ (۱۰/۸۱)

بے شک اللہ مفسدین کے کام نہیں سنوارتا۔

لہٰذا فساد خواہ وہ کوئی ہو کسی بھی نوعیت کا ہو اس کا انجام بہر حال اوّل آخر صرف اور صرف تباہی ہے۔

## دسواں قانون: انفرادی سطح پر چند ایسے افعال جو فوری تباہی کا سبب بن جاتے ہیں

یہ ہمارا ایک عام مشاہدہ ہے کہ بعض اشیاء ایسی ہوتی ہیں جن کے اثرات طویل المعیاد ہوتے ہیں اور بعض کے بہت زود اثر مثال کے طور پر سگریٹ نوشی کے مضر اثرات آہستہ آہستہ ظاہر ہونے شروع ہوتے ہیں جبکہ اگر کوئی زہر کھا لیا جائے تو اس کا اثر فوری طور پر ظاہر ہوتا ہے بعینہٖ یہی صورت حال بعض افعال کے معاشی نتائج کے بارے میں بھی ہے۔

Marfat.com

قرآن مجید میں بعض ایسے افعال کا تذکرہ کیا گیا ہے جن کے نتیجے میں فوری معاشی تباہی مقدر ہو جاتی ہے ان افعال میں یہ تصور کر لینا کہ حاصل ہونے والی دولت ذاتی علم و دانش کا نتیجہ ہے اور اس کے نتیجہ میں تکبر کا مظاہرہ کرنا اور دوم ''اللہ کے مال'' کو مستحقین تک پہنچنے سے روکنا شامل ہے۔ اوّل الذکر کی مثال قارون کی ہے جبکہ ثانی الذکر کی مثال اصحاب الجنہ (باغ والے اصحاب) ہیں جن کا تذکرہ قرآن مجید میں کیا گیا ہے۔

اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو دونوں کا پس منظر ایک ہی ہے یعنی حاصل ہونے والی مال و دولت کو بالکلیۂ ذاتی کسب و ہنر کا نتیجہ سمجھنا اور دیگر عوامل جو تمام تر اللہ کی دین ہوتے ہیں ان کی نظر اندازی یا بالفاظِ دیگر اللہ تعالیٰ نے انسانی مال و دولت پر وہ حق جو دیگر لوگوں کا رکھا ہے اسے غصب کرنا۔ یہ صورتِ حال فوری تباہی کا سبب بنتی ہے۔

درحقیقت دولت کی افراط دولتمندوں کے دماغوں میں یہ خناس بھر دیتی ہے کہ انہیں جو کچھ بھی حاصل ہوا ہے وہ ان کے فہم و فراست اور عقل و دانش کا نتیجہ ہے۔ یہاں مال و دولت کے حصول میں انسانی محنت کے عنصر سے انکار نہیں ہے لیکن ساتھ ساتھ یہ امر بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ انسان جو بھی مال و دولت حاصل کرتا ہے اس میں انسانی محنت کے ساتھ متعدد ایسے عوامل یقیناً شامل ہوتے ہیں جن پر انسان کا اپنا کوئی اختیار نہیں ہوتا اور یہ عوامل اتنے اہم ہوتے ہیں کہ اگر انہیں نظر انداز کر دیا جائے تو انسان کی ساری محنت مٹی میں مل جاتی ہے۔ ان عوامل میں وراثت میں ملنے والی صلاحیتیں، ابتدائی تعلیم و تربیت اور مواقع شامل ہیں جن کا فائدہ اٹھا کر انسان دولت حاصل کرتا ہے۔ ظاہر ہے اگر یہ عوامل منفی ہوں تو انسان لاکھ محنت کرے وہ کچھ بھی حاصل نہیں کر سکتا۔ لہٰذا انسان کو حاصل ہونے والی دولت جہاں ایک طرف اس کی محنت کا ثمر ہوتی ہے تو دوسری طرف متذکرہ بالا عوامل کو کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

قرآن مجید اس حقیقت کی وضاحت زراعت کی مثال کی مدد سے کرتا ہے۔ زرعی

Marfat.com

پیداوار کے حوالے سے بھی صورتِ حال وہی ہے جو اوپر بیان کی گئی ہے۔ زرعی پیداور کے حوالے سے انسانی کردار زمین کی تیاری، فصل کی بوائی اور اس حوالے سے دیگر اقدامات تک محدود ہے لیکن بیج سے پودے کی پیداوار، پانی کی دستیابی، زمین کی پیداواری صلاحیت اور موافق موسم وغیرہ یہ سب وہ عوامل ہیں جو اس کی دسترس سے باہر ہیں۔ یہ سب اللہ کی عطا ہیں لہٰذا انسان کا کردار اس کی محنت سے زائد نہیں۔ اس پورے عمل کی وضاحت قرآن مجید میں سورۃ الواقعہ میں کی گئی ہے۔ جہاں اللہ تعالیٰ نے زراعت کی جانب انسانوں کی توجہ مبذول کرواتے ہوئے کچھ سوالات کیئے ہیں۔

أَفَرَءَيْتُم مَّا تَحْرُثُونَ ۝ ءَأَنتُمْ تَزْرَعُونَهُۥٓ أَمْ نَحْنُ الزَّارِعُونَ

(۵۶/۶۳-۶۴)

کیا تم کو معلوم ہے جو تم بوتے ہو؟ کیا تم اس کو اگاتے ہو یا ہم اس کو اگاتے ہیں؟

ظاہر ہے ان آیات سے ہرگز یہ مفہوم نہیں نکالا جا سکتا کہ اللہ تعالیٰ زرعی اجناس کو خود زمین سے نکالتا ہے بلکہ اس سے مراد اس کے وہ قوانین ہیں جن کی مدد سے زمین سے پیداوار حاصل ہوتی ہے۔ اس عمل میں انسان محنت کرتا ہے لیکن اگر اللہ تعالیٰ نے زمین میں پیدواری صلاحیت نہ رکھی ہوتی اور ایسے قوانین متعین نہ کیئے ہوتے جن سے زرعی پیداوار حاصل ہوتی ہے تو ظاہر ہے انسان کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن دوسری طرف یہ امر بھی ذہن میں رکھیئے کہ اگر انسان بیج میں نہ ہوتا یا اس کی محنت نہ ہوتی تو بھی یہ عمل ممکن نہ تھا گویا خام مال سارا اللہ کا فراہم کردہ ہے اور وہ خام مال اسی کے طے شدہ قوانین کے مطابق ثمر بھی دیتا ہے لیکن اس خام مال کو تیار شے کی شکل بہر حال انسانی محنت ہی دیتی ہے۔

اسی طرح مضمون کو مسلسل رکھتے ہوئے اگلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے انسانوں سے کچھ مزید استفسارات کیئے ہیں۔ ان سوالات کا بنیادی مقصد اس حقیقت کی طرف انسانوں

Marfat.com

کی توجہ دلوانا ہے کہ جملہ اختیار بہر حال اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ قدرتی قوانین کی تیاری یا خام مال کی فراہمی میں کسی قسم کا کوئی انسانی عمل دخل نہیں ہے یہ سب اللہ کا فراہم کردہ ہے۔ انسان صرف اور صرف اپنی محنت سے ان چیزوں اور ان چیزوں سے متعلق قوانین سے مستفید ہو سکتا ہے اس سے زائد انسان کے بس میں کچھ بھی نہیں۔

مندرجہ بالا آیات سے منسلک اگلی آیات میں خدائے علیم وخبیر کا ارشاد پاک ہے۔

لَوْ نَشَاۗءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ o اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ o بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ o اَفَرَءَيْتُمُ الْمَاۗءَ الَّذِيْ تَشْرَبُوْنَ o ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ o لَوْ نَشَاۗءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ o اَفَرَءَيْتُمُ النَّارَ الَّتِيْ تُوْرُوْنَ o ءَاَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَآ اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِــُٔوْنَ o (۵۶/۶۵۔۷۲)

اگر ہم چاہتے تو اس کو بالکل جلا ہوا چورا بنا دیتے اور پھر تم باتیں بناتے رہ جاتے اور کہتے کہ ہم پر چٹی پڑ گئی بلکہ ہم محرومین میں سے ہیں ذرا اس پانی کو دیکھو جس کو تم پیتے ہو کیا تم نے اسے بادل سے اتارا ہے یا ہم اتارتے ہیں اگر ہم چاہیں تو اسے کھاری کر دیں پھر تم شکر کیوں نہیں کرتے۔ ذرا اس آگ کا حال تو بتاؤ جو تم جلاتے ہو کیا تم نے اس کے درخت کو پیدا کیا ہے یا ہم اس کو پیدا کرتے ہیں؟۔

یہ آیات صریحاً اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ کسی بھی حوالے سے خام مال اللہ کا پیدا کردہ ہوتا ہے البتہ انسانی محنت اسے مکمل شے یا تیار شے کی شکل دیتی ہے۔ اگر یہ خام مال اور زمین سے حاصل ہونے والی اشیاء اللہ کی جانب سے فراہم نہ کی جاتیں تو انسان کچھ بھی کرنے پر قادر نہیں نہ وہ کھارے پانی کو میٹھا بنا سکتا ہے نہ وہ درخت یا کوئی بھی خام مال پیدا کرنے پر قادر ہے۔ یہ سب کچھ رب العالمین کی عطا ہے۔ اقبال کے الفاظ میں:

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون؟
کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب؟
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار؟
خاک یہ کس کی ہے کس کا ہے یہ نورِ آفتاب؟
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب؟
موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب؟

مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ پیدائش دولت ایک دوطرفہ عمل ہے جس میں خام مال اور قوانین پیدائش دولت مشیت ایزدی کی عطا ہیں جبکہ اس خام مال کو مکمل شے کی شکل انسانی محنت دیتی ہے۔ اس بنیاد پر انسان جو بھی مال و دولت حاصل کرتا ہے اس میں اس کا حصہ اس کی محنت کے بقدر ہے جو اس کی ضروریات کی تکمیل کر سکے اور ضروریات کی تکمیل کے بعد جو کچھ بچتا ہے وہ اللہ کا مال ہے اسے تو اللہ نے انسانوں کی ملکیت تسلیم ہی نہیں کیا بلکہ اسے اللہ کا مال کہا ہے:

وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ نِكَاحًا حَتّٰى يُغْنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَالَّذِينَ يَبْتَغُونَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِيهِمْ خَيْرًا ۖ وَّاٰتُوهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰىكُمْ ؕ وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ وَمَنْ يُّكْرِهْهُّنَّ فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْۢ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ

(۲۴/۳۳)

اور جن کو نکاح مقدور نہ ہو وہ پاک دامنی کو اختیار کیئے رہیں یہاں تک کہ اللہ ان کو اپنے فضل سے غنی کر دے اور جو غلام تم سے مکاتبت کرنا چاہیں اگر تم ان میں نیکی پاؤ تو ان سے مکاتبت کرلو اور اللہ کے مال میں سے ان کو بھی دو

Marfat.com

اور اپنی لونڈیوں کو اگر وہ پاک دامن رہنا چاہیں تو دنیاوی زندگی کے فوائد حاصل کرنے کے لیے انہیں بدکاری پر مجبور نہ کرو اور جو ان کو مجبور کرے گا تو ان (بیچاریوں) کے مجبور کیئے جانے کے بعد اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔

اس آیت میں دیگر امور کے علاوہ جو توجہ طلب پہلو ہے وہ یہ ہے کہ وہ مال جو گردن چھڑانے کے لیے ہو اس کی نسبت اللہ تعالیٰ سے ہے یعنی یہ اللہ کا مال ہے اس بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ انسان جو کچھ کماتا ہے اس سے اس کی ضروریات کی تکمیل کے بعد جو بھی بچتا ہے وہ اللہ کے مال ہے بالفاظِ دیگر ضرورتمندوں کا ہے۔ اس مال پر اللہ نے انسانوں کی ملکیت تسلیم ہی نہیں کی ہے۔ لہٰذا اپنی ضروریات سے ماسوا تمام مال کو اللہ کی راہ میں کھلا رکھنا لازمی ہے یہ درحقیقت ان لاتعداد عوامل کے شکر کا انداز ہے جو منجانب اللہ ہوتے ہیں اور جن کی مدد سے ہی انسان اس قابل ہوتا ہے کہ مال و دولت حاصل کر سکے۔

اس حوالے سے انسان، جیسا کہ عرض کیا گیا دو (۲) بنیادی غلطیوں کا ارتکاب کرتا ہے اوّل یہ کہ تمام مال و دولت کو ذاتی علم و دانش کا نتیجہ سمجھ لینا یا مال و دولت کے نشے میں خود کو خدا سمجھ لینا دوم ''اللہ کے مال'' کو مستحقین تک پہنچنے نہ دینا۔ ان دونوں کی وضاحت حسبِ ذیل ہے۔

جہاں تک اوّل الذکر غلطی کا تعلق ہے اس کی مثال قارون ہے جس کے پاس بے تحاشہ دولت تھی۔

اِنَّ قَارُوْنَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰى فَبَغٰى عَلَيْهِمْ ۖ وَاٰتَيْنٰهُ مِنَ الْكُنُوْزِ مَآ اِنَّ مَفَاتِحَهٗ لَتَنُوْٓاُ بِالْعُصْبَةِ اُولِى الْقُوَّةِ ۚ اِذْ قَالَ لَهٗ قَوْمُهٗ لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ ۝ (۲۸/۷٦)

قارون موسیٰ کی قوم میں سے تھا اور ان پر تعدی کرتا تھا اور ہم نے اس کو اتنے خزانے دیئے تھے کہ ان کی کنجیاں ایک طاقتور جماعت کو اٹھانی مشکل

ہوتیں جب اس سے اس کی قوم نے کہا اترا مت اللہ تعالیٰ اترانے والوں سے محبت نہیں کرتا۔

اس کی قوم نے اسے نصیحت کی کہ:

وَابْتَغِ فِيْمَآ اٰتٰكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَ اَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَ لَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْاَرْضِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ط (۲۸/۷۷)

اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے تجھے دے رکھا ہے اس میں سے آخرت کی بھلائی بھی طلب کر اور اپنے دنیوی حصے کو بھی نہ بھول اور جیسے کہ اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے تو بھی اچھا سلوک کر اور ملک میں طالبِ فساد نہ ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ مفسدوں کو پسند نہیں کرتا۔

لیکن قارون کا جواب ہر مفسد سرمایہ دار بلکہ سرمایہ پرست کی مخصوص ذہنیت کا آئینہ دار تھا کہ یہ سب کچھ مجھے میرے کسب سے ملا ہے میری فہم و دانش کا نتیجہ ہے۔

قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ (۲۸/۷۸)

(قارون نے) کہا کہ یہ (مال) مجھے میری دانش (کے زور) پر ملا ہے۔

یہ تکبر اور حدود فراموشی کی آخری حد ہے جو لامحالہ ہلاکت پر منتج ہوتی ہے اور یہ وہ حد ہے جس پر اس امر کی بھی ضرورت نہیں ہوتی کہ جرائم کے متعلق پوچھ گچھ کی جائے کیونکہ جرائم اتنے واضح، بدیہی اور نمایاں ہوتے ہیں کہ ان کا نتیجہ صرف اور صرف تباہی ہی ہو سکتا ہے اس سے ماسوا کچھ نہیں۔ اور صرف قارون ہی نہیں بلکہ اس سے پہلے بھی سرمایہ دارانہ ذہنیت کا انداز یہی تھا اور آج بھی ہے اس وقت بھی اس تقدیر کا انجام تباہی تھا آج بھی ہے اور تا قیامت رہے گا۔

اَوَلَمْ يَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهٖ مِنَ الْقُرُوْنِ مَنْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَّاَكْثَرُ جَمْعًا ۭ وَلَا يُسْـَٔلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ (۲۸/۷۸)

Marfat.com

کیا اس کو معلوم نہیں کہ اللہ نے اس سے پہلے بہت سی امتیں جو اس سے قوت میں بڑھ کر اور معیشت میں بیشتر تھیں ہلاک کر ڈالی ہیں اور گناہ گاروں سے ان کے گناہوں کی باز پرس ایسے وقت نہیں کی جاتی۔

لہٰذا اسی قانون کے تحت تباہی قارون کا مقدر بنی اور اسے اس کے گھر سمیت زمین میں دھنسا دیا گیا اور رہتی دنیا تک وہ عبرت کی مثال بن گیا:

فَخَسَفْنَا بِهٖ وَ بِدَارِهِ الْاَرْضَ فَمَا كَانَ لَهٗ مِنْ فِئَةٍ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُنْتَصِرِيْنَ ۝ (۲۸/۸۱)

پس ہم نے قارون کو اور اس کے گھر کو زمین میں دھنسا دیا تو کوئی گروہ ایسا نہ تھا جو اللہ کے مقابلے میں اس کی مدد کر سکتا نہ ہی ان سے خود ہی ایسا ہو سکا کہ وہ اس تباہی سے بچ نکلتا۔

یقیناً اللہ کی گرفت بہت سخت ہوتی ہے اور کوئی اس سے بچ نہیں سکتا۔ یہ تباہی کل بھی ان لوگوں کے لیے باعث عبرت تھی اور آج بھی ہے اور تا قیامت رہے گی جو اس قسم کی دولت و حشمت کے خواہشمند ہوتے ہیں۔

وَ اَصْبَحَ الَّذِيْنَ تَمَنَّوْا مَكَانَهٗ بِالْاَمْسِ يَقُوْلُوْنَ وَيْكَاَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَ يَقْدِرُ لَوْ لَآ اَنْ مَّنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا لَخَسَفَ بِنَا ۝ (۲۸/۸۲)

وہ لوگ جو کل اس کے رتبے کی تمنا کرتے تھے آج کہنے لگے کہ مال و دولت کی فراوانی اور تنگی اللہ کے قانون کے مطابق ہوتی ہے (جو جس قسم کی روش اختیار کرتا ہے ویسا نتیجہ سامنے آ جاتا ہے) اگر ہم پر اللہ کا احسان نہ ہوتا تو (ہم بھی وہی روش اختیار کر لیتے جسے قارون نے اختیار کیا تھا اور) ہم بھی اسی طرح تباہ و برباد ہو جاتے۔

Marfat.com

اور حتمی اور یقینی نتیجہ یہ کہ:

وَ یْکَاَنَّہٗ لَا یُفْلِحُ الْکٰفِرُوْنَ (۲۸/۸۲)

کافروں (ناشکر گذاروں) کو کبھی فلاح حاصل نہیں ہوتی۔

قارونی ذہنیت یہ ہے کہ جو کچھ مجھے ملا ہے وہ میرے علم و دانش کا نتیجہ ہے اس کا انجام ہمارے سامنے ہے۔ اسی ذہنیت کا ایک اور رخ یہ بھی ہے کہ انسان مال و دولت کے نشے میں خود کو خدا سمجھنے لگ جاتا ہے۔ یہ صورتِ حال بھی فوری تباہی کا سبب بن جاتی ہے۔ اس امر کی وضاحت سورۃ الکہف میں دو اصحاب کے واقعے سے کی گئی ہے۔ ان دونوں افراد کو اللہ تعالیٰ نے باغات کی شکل میں عمدہ ذریعہ رزق فراہم کیا تھا۔ ان میں سے ایک شخص کو یہ نعمت زیادہ مقدار میں ملی تھی دوسرے کو نسبتاً کم مقدار میں:

وَاضْرِبْ لَھُمْ مَّثَلًا رَّجُلَیْنِ جَعَلْنَا لِاَحَدِھِمَا جَنَّتَیْنِ مِنْ اَعْنَابٍ وَّ حَفَفْنٰھُمَا بِنَخْلٍ وَّجَعَلْنَا بَیْنَھُمَا زَرْعًا ؕ کِلْتَا الْجَنَّتَیْنِ اٰتَتْ اُکُلَھَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْہُ شَیْئًا وَّ فَجَّرْنَا خِلٰلَھُمَا نَھَرًا (۱۸/۳۲-۳۳)

اور ان میں سے دو اشخاص کا حال بیان کیجیے جن میں سے ایک کو ہم نے انگور کے دو باغ عطا کیئے تھے اور ان کے گرداگرد کھجوروں کے باغ لگا دیئے تھے۔ اور ان کے درمیان کھیتی پیدا کر دی تھی۔ دونوں باغ کثرت سے پھل لاتے اور ان کی پیداوار میں کسی طرح کی کمی نہ ہوتی اور دونوں میں ہم نے ایک نہر بھی جاری کر رکھی تھی۔

اس صورتِ حال میں وہ شخص جس پر اللہ نے اپنا فضل کر رکھا تھا شیخی آ گیا اور اپنے اس ساتھی سے جو مال و دولت میں نسبتاً کم تھا یہ کہنے لگا کہ میں تم سے نہ صرف یہ کہ مال و دولت میں زیادہ ہوں بلکہ میرا باغ بھی کبھی تباہ نہیں ہوگا اور نہ صرف یہ کہ اس طرح تکبر کر کے اپنے نفس پر ظلم کیا بلکہ قیامت کے وجود سے بھی انکار کیا اور کہا کہ اگر بالفرض ایسا ہوا

Marfat.com

بھی یعنی قیامت اگر آ ئی بھی تو میں اپنے رب کے پاس اس سے بھی بہتر جگہ پاؤں گا۔

وَّ كَانَ لَهٗ ثَمَرٌ فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ وَ هُوَ يُحَاوِرُهٗٓ اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّاَعَزُّ نَفَرًا ﴿﴾ وَ دَخَلَ جَنَّتَهٗ وَ هُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ قَالَ مَآ اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖٓ اَبَدًا ﴿﴾ وَّ مَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً وَّ لَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا ﴿﴾ (۱۸/۳۴-۳۶)

(اس طرح) اس (شخص) کو (ان کی) پیداوار (ملتی رہتی) تھی تو (ایک دن) جبکہ وہ اپنے دوست سے باتیں کر رہا تھا کہنے لگا میں تم سے مال (و دولت) میں بھی زیادہ ہوں اور (جماعت) کے لحاظ سے بھی زیادہ عزت والا ہوں اور (ایسی شیخیوں سے) اپنے حق میں ظلم کرتا ہوا اپنے باغ میں داخل ہوا اور کہنے لگا کہ میں نہیں خیال کرتا کہ یہ باغ کبھی تباہ ہوگا اور نہ خیال کرتا ہوں کہ قیامت برپا ہوگی اور اگر میں اپنے رب کی طرف لوٹایا بھی جاؤں تو (وہاں) ضرور اس سے اچھی جگہ پاؤں گا۔

تکبر کی انتہا یہ ہے کہ خدا کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے تئیں یہ فیصلہ کر لینا کہ یہ باغ کبھی تباہ نہیں ہوگا حالانکہ یہ قبضہ واختیار صرف اور صرف خدا کو ہے وہ اپنی مشیت سے اپنے طے شدہ قوانین کے مطابق انسانوں کو اپنی نعمتیں دیتا بھی ہے اور اگر انسان ناشکری کرے تو چھین بھی لیتا ہے لیکن کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اس قسم کے فیصلے صادر کرتا پھرے کہ یہ شے رہے گی یا نہیں رہے گی۔ یہ انسانی بس میں ہے ہی نہیں لیکن جب دولت وثروت کا خمار زیادہ چڑھ جاتا ہے تو انسان اپنے آپ میں نہیں رہتا اور خود کو نہ جانے کیا سمجھنے لگتا ہے اور اسی تکبر میں اپنے آپ کو خدا کا چہیتا سمجھنے لگتا ہے۔ دولت کی اس نفسیات کا تذکرہ قرآن مجید میں اس انداز میں بھی بیان کیا گیا ہے کہ دولتمند اپنے آپ کو عقل کل سمجھنے لگتا ہے۔ اس تکبر کی بنیادی وجہ متذکرہ بالا آیات میں بیان کر دی گئی ہے اور وہ ہے روزِ قیامت

Marfat.com

کا انکار یا اس کے بارے میں شک وشبہ میں مبتلا ہونا۔ اگر انسان کو اس امر پر یقینِ راسخ ہو کہ قیامت ضرور برپا ہوگی اور تمام اعمال کا حساب کتاب ہوگا تو اس قسم کے خناس پھر دل میں جگہ نہیں پا سکتے اور انسان اپنے آپ میں رہتا ہے۔ نہ صرف متذکرہ بالا تکبر بلکہ انسان کے تمام اقسام کے گناہوں کے پیچھے درحقیقت روزِ آخرت کا انکار ایک بہت موثر عامل کی حیثیت سے موجود ہوتا ہے۔ اگر انسان کے دل میں جوابدہی کا احساس جاگزیں ہو تو وہ خود بخود سیدھی راہ پر چلنے لگتا ہے۔

روزِ قیامت سے انکار ہی وہ بنیادی وجہ بنی جس کی وجہ سے متذکرہ بالا آیات میں مذکور شخص اتنا تکبر کرنے لگا اور یہ کہنے لگا کہ ''میں نہیں خیال کرتا کہ یہ باغ کبھی تباہ ہوگا''۔ یہ صریحاً خدائی طاقت سے انکار کے مترادف ہے وہ اللہ جو کائنات کی واحد طاقت ہے اسے نعوذ باللہ ایک طرح سے چیلنج کے مترادف ہے کیونکہ اختیارِ مطلق تو اسی کا ہے اور صرف اسی کو زیبا بھی ہے۔ انسان کیا اس کی اوقات کیا:

چہ نسبت خاک را عالمِ پاک

یہ کہنا کہ میرے کہنے سے یہ باغ کبھی تباہ نہیں ہوگا خدائی کا بالواسطہ دعویٰ ہے جو صریحاً کفر ہے۔ تمام تر اختیار صرف اور صرف اللہ کے پاس ہے۔ یہی وہ بنیادی غلطی تھی جس کی طرف اس کے دوست نے نشاندہی کی۔

قَالَ لَهُ صَاحِبُهُ وَهُوَ يُحَاوِرُهُ أَكَفَرْتَ بِالَّذِي خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُطْفَةٍ ثُمَّ سَوَّاكَ رَجُلًا ۝ لَكِنَّا هُوَ اللَّهُ رَبِّي وَلَا أُشْرِكُ بِرَبِّي أَحَدًا ۝ وَلَوْلَا إِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَاءَ اللَّهُ لَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ إِنْ تَرَنِ أَنَا أَقَلَّ مِنْكَ مَالًا وَوَلَدًا ۝ (۱۸/۳۷-۳۹)

تو اس کا دوست جو اس سے گفتگو کر رہا تھا کہنے لگا کہ کیا تم اس (خدا) سے کفر کرتے ہو جس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا پھر نطفے سے تمہیں پورا مرد بنایا۔

Marfat.com

مگر میں تو یہ کہتا ہوں کہ اللہ ہی میرا رب ہے اور میں اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا اور (بھلا) جب تم اپنے باغ میں داخل ہوئے تو تم نے یہ کیوں نہ کہا کہ یہ سب کچھ اللہ کے قانون مشیت کے مطابق ہوتا ہے اور اللہ کے سوا کوئی قوت نہیں اگر تم مجھے مال و اولاد میں اپنے سے کمتر دیکھتے ہو۔

متذکرہ بالا آیات کے تجزیے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس مغرور شخص کے دوست نے اسے نصیحت کی اور اس نے کہا کہ کیا تم اس خدا سے انکار کرتے ہو جس نے انسان کو مٹی سے پیدا کیا پھر بتدریج مختلف مراحل سے گزارتے ہوئے اس مرحلے پر لایا جہاں انسانوں میں تولید و تناسل کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس کی ہستی سے انکار کیسے ممکن ہے؟ میں تو اپنے رب کا مطیع ہوں اور اس کی ذات میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ یہاں اس متکبر شخص کے دوست کے الفاظ کہ ''میں اس کی ذات میں کسی کو شریک نہیں کرتا'' اس امر کی صریح شہادت ہیں کہ متکبر شخص کا یہ کہنا کہ یہ باغ کبھی تباہ نہیں ہوگا خود خدائی کا بالواسطہ دعویٰ ہے جبکہ اختیار مطلق صرف اور صرف اللہ کو حاصل ہے اس کی مزید صراحت اگلی آیت میں یہ کہہ کر کر دی گئی کہ جب وہ متکبر شخص اپنے باغ میں تکبر کے ساتھ داخل ہوا تو اس کے دوست نے اس کو نصیحت کی کہ یہ کہو کہ یہ سب کچھ خدا کے قانون مشیت کی رو سے ہے اور سب سے اہم ترین یہ کہ ''اللہ کے سوا کوئی قوت نہیں'' اس آیت کے یہ الفاظ کہ **لا قوۃ الا باللّٰہ** ''اللہ کے سوا کوئی قوت نہیں'' اپنے اندر معنی کا ایک پورا جہان آباد کیے ہوئے ہیں۔ سیدھے سادے انداز میں ''اللہ ہی کائنات کی واحد قوت ہے''۔ یہ نکتہ ایک طرف سائنس کے حوالے سے تدبر کے لامحدود مواقع پیش کرتا ہے تو دوسری طرف سیدھے سادے انداز میں اس سادہ سی حقیقت کا بھی غماز ہے کہ قوت و طاقت صرف اللہ کی ہے اس کے علاوہ کسی کو کسی صورت یہ حق نہیں کہ وہ ''اپنی طاقت'' کے بارے میں کسی خوش فہمی میں مبتلا ہو سکے۔ اس پس منظر میں اس متکبر شخص کا یہ جملہ کہ یہ باغ کبھی تباہ نہیں ہوگا کائنات کی واحد قوت کو اپنی

Marfat.com

بدترین جہالت کی وجہ سے ایک طرح سے ''چیلنج'' کے مترادف تھا نتیجہ صاف ظاہر تھا اس کا باغ بری طرح برباد ہو گیا اور وہ کہیں کا نہیں رہا۔

وَاُحِيطَ بِثَمَرِهٖ فَاَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلٰى مَآ اَنْفَقَ فِيْهَا وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا ٥ وَلَمْ تَكُنْ لَّهٗ فِئَةٌ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَمَا كَانَ مُنْتَصِرًا ؕ (۴۳_۴۲/۱۸)

اور اس کے میوؤں کو عذاب نے آ گھیرا پس وہ اپنے اس خرچ پر جو اس نے اس پر کیا تھا اپنے ہاتھ ملنے لگا وہ باغ تو اوندھا پڑا تھا اور (وہ شخص) یہ کہہ رہا تھا کہ کاش میں اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرتا۔ اس کی حمایت میں کوئی جماعت نہ اٹھی کہ اللہ سے اس کا کوئی بچاؤ کرتی نہ وہ خود ہی بدلہ لینے والا بن سکا۔

اس قسم کی بدترین جہالت کا یہی انجام ہو سکتا ہے۔ یہ وہ تقدیر ہے جو فی الفور نتائج مرتب کرتی ہے اور فوری بدترین تباہی پر منتج ہوتی ہے۔ آخری اور حتمی حقیقت صرف اور صرف یہ ہے کہ:

هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ ؕ هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا وَّ خَيْرٌ عُقْبًا (۴۴/۱۸)

یہاں (سے ثابت ہوا کہ) اختیار صرف خدائے برحق کا ہے اسی کا صلہ بہتر اور (اسی کا) بدلہ اچھا ہے۔

اس حوالے سے دوسری بنیادی غلطی جیسا کہ عرض کیا گیا اللہ کے مال کو مستحقین تک پہنچنے نہ دینا ہے۔ اس کی مثال اصحاب الجنہ کے واقعہ سے دی جا سکتی ہے۔ اس قسم کی ذہنیت کا انجام بھی فوری تباہی ہے۔ اس واقعہ کو قرآن مجید میں سورۃ القلم میں بیان کیا گیا ہے۔ از روئے قرآن یہ کچھ افراد تھے جو ایک باغ کے مالک تھے جب باغ میں پھلوں کے کاٹنے کا وقت آیا تو وہ رات کو جمع ہوئے اور اگلی صبح پھل توڑنے کا پروگرام بنایا قرآن مجید کے الفاظ

Marfat.com

میں:

اِذْ اَقْسَمُوْا لَیَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِیْنَ (۶۸/۱۷)

جب انہوں نے قسمیں کھائیں کہ صبح ہوتے ہی باغ کے پھل اتار لیں گے۔

لیکن اس پیداوار میں جو غربا اور ناداروں کا حصہ تھا اسے غصب کر گئے انہوں نے ذرا سا بھی حصہ اس مقصد کے لیے الگ نہیں کیا۔

وَ لَا یَسْتَثْنُوْنَ (۶۸/۱۸)

انہوں نے اس میں سے ضرورتمندوں کے لیے حصہ الگ نہ کیا۔

اس آیت میں استعمال ہونے والا لفظ یستثنون نمایاں اہمیت کا حامل ہے اس کا مادہ ث ن ی ہے اس کے بنیادی معنی ایک کام کو دوبارہ کرنا اور ایک چیز کی دو (۲) الگ الگ چیزیں بنانا ہے۔ اسی سے استثناء ہے جس کے معنی کسی کو مستثنیٰ کرنے اور الگ نکال کر رکھنے کے ہیں۔ اس بنیاد پر جب قرآن مجید نے ان کے لیے یستثنون کا لفظ استعمال کیا ہے تو اس سے مراد یہ ہے کہ انہوں نے استثنیٰ نہیں برتا بلکہ ساری پیداوار اپنے پاس رکھنے کا فیصلہ کیا۔ یہ ایک تباہ کن فیصلہ تھا۔ جس رات انہوں نے یہ فیصلہ کیا اسی رات ان کا باغ مکمل طور پر تباہ ہو گیا اور یہ تباہی اتنی شدید تھی کہ جب صبح وہ اپنے باغ تک پہنچے تو پہلے یہ گمان کیا کہ شاید وہ راستہ بھول گئے ہیں لیکن حقیقت بہر حال یہ تھی کہ باغ بری طرح تباہ ہو چکا تھا۔

فَطَافَ عَلَیْهَا طَآئِفٌ مِّنْ رَّبِّکَ وَ هُمْ نَآئِمُوْنَ ٥ فَاَصْبَحَتْ کَالصَّرِیْمِ ٥ فَتَنَادَوْا مُصْبِحِیْنَ ٥ اَنِ اغْدُوْا عَلٰی حَرْثِکُمْ اِنْ کُنْتُمْ صٰرِمِیْنَ ٥ فَانْطَلَقُوْا وَ هُمْ یَتَخَافَتُوْنَ ٥ اَنْ لَّا یَدْخُلَنَّهَا الْیَوْمَ عَلَیْکُمْ مِّسْکِیْنٌ ٥ وَّ غَدَوْا عَلٰی حَرْدٍ قٰدِرِیْنَ ٥ فَلَمَّا رَاَوْهَا قَالُوْٓا اِنَّا لَضَآلُّوْنَ ٥ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ٥ (۶۸/۱۹-۲۷)

سو وہ ابھی سو ہی رہے تھے کہ تمہارے رب کی طرف سے اس پر ایک آفت پھر گئی پس وہ باغ ایسا ہو گیا جیسے کٹی ہوئی کھیتی۔ جب صبح ہوئی تو وہ لوگ ایک دوسرے کو پکارنے لگے اگر تم کو کاٹنا ہے تو اپنی کھیتی پر صبح ہی جا پہنچو سو وہ چل پڑے اور آپس میں چپکے چپکے کہتے جاتے تھے کہ آج یہاں کوئی مسکین نہ آنے پائے اور کوشش کے ساتھ سویرے ہی جا پہنچے گویا کھیتی پر قادر ہیں۔ جب انہوں نے باغ دیکھا تو کہنے لگے یقیناً ہم راستہ بھول گئے نہیں بلکہ ہم محرومین میں سے ہو گئے۔

متذکرہ بالا آیات میں سے آیت (۶۸/۲۵) کے الفاظ پر غور کیجیے ایک سرمایہ پرست ذہنیت کی اس سے بہتر عکاسی نہیں ہو سکتی ''اور کوشش کے ساتھ سویرے ہی جا پہنچے گویا کھیتی پر قادر ہیں''۔ یہ ہر سرمایہ دار کی ذہنیت ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو خدا سمجھنے لگتا ہے گویا کہ وہ ہر شے پر قادر ہے لیکن وہ یہ بھول جاتا ہے کہ اس سے کہیں برتر ہستی خدا کی ہستی ہے جو درحقیقت قادرِ مطلق ہے اور کسی بھی شے کا حتمی انجام اسی کے ہاتھ میں ہے جو عدل کرنے والا ہے۔

اس تباہی کے بعد ان افراد میں سے ایک شخص جو صاحب بصیرت تھا وہ ان سے مخاطب ہوا اور کہا کہ اگر تم اپنی ساری جدوجہد کو خدائی قانون کے تابع رکھتے تو تمہیں یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔ اس حوالے سے خدائی قانون بہر حال یہ ہے کہ جو بھی مال و دولت کمایا جائے اس میں غریبوں، ناداروں اور دیگر مستحقین کا حق رکھنا لازمی ہے۔

وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۝ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝

(۷۰/۲۴-۲۵)

اور جن کے مال میں حصہ مقرر ہے مانگنے والے کا اور محرومین کا۔

اور یہ بھی یاد رہے کہ یہ ضرورتمندوں پر کوئی احسان نہیں ہے بلکہ یہ ضرورت مندوں کا

Marfat.com

حق ہے قرآن مجید نے اسے ان کا حق قرار دیا ہے:

فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ذٰلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۳۰/۳۸)

پس قرابت دار محتاجوں اور مسافروں کو ان کا حق دیتے رہو جو لوگ رضائے خدا کے طالب ہیں یہ ان کے حق میں بہتر ہے اور یہی لوگ فلاح حاصل کرنے والے ہیں۔

گویا یہ کہا جاسکتا ہے کہ مالداروں کے مال پر ناداروں کا حق ہے اور یہ ایسا حق ہے جسے قرآن مجید نے تسلیم کیا ہے اور جس سے فرار ممکن نہیں ہے اور جو بھی یہ حق مارنے کی کوشش کرے گا بلکہ متذکرہ بالا واقعہ کی رو سے صرف اس کا عزم یا اس کے ابتدائی اقدامات بھی کرے گا وہ قابل مواخذہ ہوگا اور یہ مواخذہ بھی شدید اور فوری نوعیت کا ہے جیسا کہ متذکرہ بالا واقعہ سے واضح ہے۔

لہٰذا مندرجہ بالا واقعات جو قرآن مجید میں بیان کیے گئے ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ:

i۔ حاصل شدہ دولت کو ذاتی علم و دانش کا نتیجہ سمجھنا،

ii۔ اللہ تعالیٰ کی قوت و اقتدار کو نظر انداز کر کے یہ سمجھنا کہ یہ مادی اشیاء یا مال و دولت سدا باقی رہے گا اور

iii۔ اللہ کے مال کو مستحقین تک پہنچنے سے روکنا، یہ تین ایسی تقدیریں ہیں جو فوری تباہی کا سبب بنتی ہیں۔

انسان کو جو مال دولت دی جاتی ہے وہ محض دنیاوی زندگی کی زینت کی اشیاء ہیں جو زادِ راہ سے زیادہ کی حیثیت نہیں رکھتیں زادِ راہ کو زادِ راہ ہی سمجھنا چاہیئے نہ کہ مقصودِ حیات۔

Marfat.com

اک عمر میں کھلا کارِ ہوس میں کچھ نہیں رکھا
پھر اس کے بعد میں نے دسترس میں کچھ نہیں رکھا

یہ سبق انسان جتنا جلد سیکھ لے اس کے لیے اتنا ہی اچھا ہے۔ قرآن مجید کے الفاظ میں:

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا ؕ (۱۸/۴۵)

اور ان سے دنیاوی زندگی کی مثال بھی بیان کریں (وہ ایسی ہے) جیسے پانی جسے ہم نے آسمان سے برسایا تو اس کے ساتھ زمین کی روئیدگی مل گئی پھر وہ چورا چورا ہوگئی کہ ہوائیں اسے اڑاتی پھرتی ہیں اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

اصل چیز ایمان اور صالح ہیں یہ ہی اثاثہ ہیں یہی حقیقی دولت ہیں اور باقی رہنے والی شے ہیں۔

اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ اَمَلًا ؕ (۱۸/۴۶)

مال اور بیٹے تو دنیا کی زینت ہیں اور نیکیاں جو باقی رہنے والی ہیں وہ تیرے رب کے نزدیک ثواب کے لحاظ سے بہت اچھی اور امید کے لحاظ سے بہت بہتر ہیں۔

Marfat.com

## باب ۸

# آزمائش کا پہلو

رزق کی بست وکشاد کے قوانین کے ساتھ ساتھ ایک اہم پہلو آزمائش کا بھی ہے۔ آزمائش کے حوالے سے قرآن مجید میں دو الفاظ استعمال کیے گئے ہیں اوّل ''نبلو'' دوم ''فتنہ''۔ ان الفاظ کا انفرادی تجزیہ مندرجہ ذیل ہے۔

### ا۔ نبلو

قرآن مجید میں آزمائش کے حوالے سے متعدد مقامات پر یہ لفظ آیا ہے۔ جس کا مادہ ب ل و ہے اس مادہ کے دو بنیادی معنی ہیں (۱) کسی کا حال معلوم کرنا یعنی اس کے متعلق جو باتیں معلوم نہ ہوں انہیں معلوم کرنا اور (۲) کسی چیز کی اصل حالت کا ظاہر ہونا خواہ وہ اچھی ہو یا بُری۔ جب یہ لفظ خدا کے لیے استعمال ہوگا تو وہاں صرف دوسرے معنی مراد ہوں گے کیونکہ خدا علام الغیوب ہے اس لیے اس کے متعلق یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کسی کی حالت سے بے خبر ہے۔ لہٰذا اس لفظ کے بنیادی معنی حالات کا معلوم کرنا یا اصل حقیقت کا ظاہر کرنا ہیں۔

یہ امر اللہ تعالیٰ کی شان سے بہت بعید ہے کہ وہ کسی کو آزمائے اسے تو ہر ہر شے خواہ وہ کوئی بھی ہو اس کا کامل علم ہے جب وہ سب کچھ جانتا ہے تو اس کی جانب سے آزمائش ایک بے معنی بات ہے۔ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی جانب سے آزمائش سے مراد یہ ہوتی ہے کہ انسان خود اپنی صلاحیتوں کو آزمائے۔ اللہ تعالیٰ انسانوں کو ایسے مواقع بہم پہنچاتا ہے جس میں ان کی صلاحیتوں کی نمود کے مواقع ہوتے ہیں۔ اس طرح انسان اپنی صلاحیتوں کو نمو دیتا ہے اسے مشکل حالات میں اپنی صلاحیتوں کی جانچ کے مواقع ملتے ہیں اور اس طرح اس کی ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش بھی درحقیقت اس کی رحمت ہے کیونکہ اسی کے ذریعے انسان مشکلات سے نبرد آزما ہوتا ہے اور آگے بڑھتا

ہے۔اس طرح اس کی شخصیت یا اقبال کی اصطلاح میں خودی کی تعمیر ہوتی ہے۔

سورۃ الدھر میں "ابتلی" کے لفظ کو قرآن مجید نے ایسے موقع پر استعمال کیا ہے جس سے مضمر جوہروں کے محسوس شکل میں سامنے آنے کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔وہ کہتا ہے کہ انسان کی پیدائش، مرد اور عورت کے نطفے کے امتزاج سے ہوتی ہے۔نطفہ ایسے باریک جرثوموں پر مشتمل ہوتا ہے جو خوردبین کے بغیر نظر بھی نہیں آ سکتے لیکن انہی جرثوموں میں پورے کا پورا انسانی بچہ چھپا ہوتا ہے۔اس حقیقت کی وضاحت کے لیے قرآن کہتا ہے:

اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا

(۷۶/۲)

ہم نے انسان کی پیدائش ایک ملے جلے نطفے سے کی (اور ایسا انتظام کیا کہ رحم مادر میں اس کے مضمر جوہروں کی نمود ہوتی جائے) تا آنکہ وہ ایک سننے اور دیکھنے والا انسانی بچہ بن جائے۔

یہ ہے ابتلی کا صحیح نقشہ، مضمر جوہروں کا محسوس شکل میں سامنے آ جانا۔ان کی نمود ہو جانا۔

تصریحات بالا سے واضح ہے کہ ابتلی سے مراد خدا کی جانب سے کسی کو آزمانا نہیں کیونکہ یہ بذاتِ خود ایک بے معنی بات ہے۔ایک جامع العلوم ہستی کی بابت یہ تصور بھی ممکن نہیں۔لہٰذا آئندہ مباحث میں لفظ "آزمائش" سے مراد "اللہ تعالیٰ کی طرف سے نمودِ ذات کے مواقع کی فراہمی ہوگا تا کہ انسان اپنی شخصیت/انا/خودی کی تعمیر کر سکے۔یہ تعمیر اچھے اور بُرے دونوں قسم کے حالات میں ممکن ہوتی ہے یعنی مشکلات میں اور کامیابیوں و کامرانیوں کے ادوار میں بھی اسی وجہ سے آزمائش دونوں صورتوں میں ممکن ہے۔

سورۃ البقرہ میں بنی اسرائیل سے کہا گیا کہ قوم فرعون تمہیں طرح طرح کے عذاب میں مبتلا رکھا کرتی تھی ہم نے تمہیں ان کے پنجۂ استبداد سے نجات دلائی۔

Marfat.com

وَ اِذْ نَجَّیْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ یَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ یُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَ یَسْتَحْیُوْنَ نِسَآءَكُمْ وَ فِیْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِیْمٌ ؕ (۲/۴۹)

جب ہم نے تم کو قوم فرعون سے مخلصی بخشی وہ تم کو بڑا دکھ دیتے تھے تمہارے بیٹوں کو قتل کر ڈالتے تھے اور بیٹیوں کو زندہ رہنے دیتے تھے اس میں تمہارے رب کی طرف سے بڑی (سخت) آزمائش تھی۔

قوم فرعون کے مظالم سے بنی اسرائیل کو نجات اس لیے دلائی تا کہ یہ دیکھا جا سکے کہ آزادی ملنے پر وہ کس قسم کے طرزِ عمل کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ غزوہ بدر میں اللہ کی امداد و تائید کا مقصد احسانات کی جانچ تھی۔

فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ وَ مَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى وَ لِیُبْلِیَ الْمُؤْمِنِیْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ (۸/۱۷)

تم نے ان (کفار) کو قتل نہیں کیا بلکہ خدا نے انہیں قتل کیا اور (اے محمدؐ) جس وقت آپ نے کنکریاں پھینکی تھیں اس سے غرض یہ تھی کہ مومنوں کو اپنے (احسانوں سے) اچھی طرح آزمالے بے شک خدا سننے والا اور جاننے والا ہے۔

بنی اسرائیل کو اقوام عالم سے منتخب کیا گیا انہیں دیگر اقوام کے مقابلے میں سرفراز کیا گیا انہیں جو مقام دیا گیا اس میں بھی ان کی نمود ذات کے مواقع تھے۔

وَ لَقَدِ اخْتَرْنٰهُمْ عَلٰى عِلْمٍ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ ۚ وَ اٰتَیْنٰهُمْ مِّنَ الْاٰیٰتِ مَا فِیْهِ بَلٰٓؤٌا مُّبِیْنٌ ؕ (۴۴/۳۲-۳۳)

ہم نے بنی اسرائیل کو اہل عالم سے دانستہ منتخب کیا تھا اور ان کو ایسی نشانیاں دی تھیں جن میں صریح آزمائش تھی۔

Marfat.com

ظاہر کردینے کے معنی میں یہ لفظ سورۃ الطارق میں آیا ہے:

یَوْمَ تُبْلَی السَّرَآئِرُ (۸۶/۹)

جس دن تمام چھپی ہوئی باتیں ظاہر کردی جائیں گی۔

سورۃ آل عمران میں ہے۔

وَلِیَبْتَلِیَ اللّٰہُ مَا فِیْ صُدُوْرِکُمْ (۳/۱۵۴)

تا کہ اللہ ان باتوں کو ظاہر کردے جو تمہارے سینوں میں تھیں۔

سورۃ یونس میں ہے۔

ھُنَالِکَ تَبْلُوْا کُلُّ نَفْسٍ مَّآ اَسْلَفَتْ (۱۰/۳۰)

وہاں ہر شخص اپنے اعمال کو سامنے موجود دیکھے گا جو اس نے پہلے کیئے تھے۔

اسی طرح بعض دیگر مقامات مثلاً (۲۳/۳۰) میں بھی اسے ظاہر کرنے کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔

مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ابتلا سے مراد نمود ذات ہے جو مشکل حالات اور سہولت وآسائش دونوں صورتوں میں ممکن ہوتی ہے اور جو اس میں سرخرو ہوجاتے ہیں وہی کامیاب ہوتے ہیں اس کی بہترین مثال حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہے جو اسی قسم کی مختلف آزمائشوں میں پورے اترے اور کامیاب ہوئے۔

وَ اِذِ ابْتَلٰٓی اِبْرٰھِمَ رَبُّہٗ بِکَلِمٰتٍ فَاَتَمَّھُنَّ ط قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ط (۲/۱۲۴)

جب ابراہیم کو اس کے رب نے بعض باتوں کے ذریعے سے آزمایا اور اس نے ان کو پورا کر دکھایا (اس پر اللہ نے فرمایا) میں یقیناً تجھے انسانوں کا مقرر کرنے والا ہوں۔

## ۲۔ فتنہ

آزمائش کے حوالے سے قرآن مجید میں جو دوسرا لفظ استعمال ہوا ہے وہ فتنہ ہے اس کا مادہ ف ت ن ہے۔ اس کے بنیادی معنی ہیں سونا یا چاندی کو آگ میں گلانا تا کہ اس کا کھوٹ الگ ہو جائے۔ اسی سے اس کے معنی کسی چیز کی اصلیت کو ظاہر کرنے کے آتے ہیں چنانچہ الفتانۃ کسوٹی کو کہتے ہیں جس پر سونا چاندی کو گھس کر ان کی اصلیت کو ظاہر کیا جاتا ہے یہیں سے فتنہ کے معنی تاؤ دے کر پرکھنے اور آزمائش کرنے کے آتے ہیں۔ (۲/۴۰) میں اسے آزمائش کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ (۳-۲/۲۹)، (۴۹/۳۹)، (۴۴/۱۷)، (۶۴/۱۵) وغیرہ میں بھی اسے آزمائش کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔

قرآن مجید میں یہ لفظ آزمائش کے علاوہ دیگر مختلف معنوں میں بھی استعمال کیا گیا ہے مثلاً (۹/۱۲۶) میں اسے جنگ کی مصیبتوں اور مشکلات کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ (۳۷/۱۶۲) میں صحیح راستے سے ہٹا کر غلط راہ پر لگا دینے کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ (۴/۹۱) میں اسے جنگ کے معنوں میں، (۴۹/۳۹)، (۴۹/۵) اور (۷۳/۱۷) میں اسے گمراہی یا راہ ہدایت سے ہٹا دینے کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ (۲۲/۱۱) میں اسے خیر کے مقابلے میں استعمال کیا گیا ہے (۲/۱۹۳) اور (۳۹/۸) میں اسے ان رکاوٹوں کے لیے استعمال کیا گیا ہے جو دین خداوندی کی راہ میں حائل ہو جاتی ہیں۔ ایذا، مصیبت اور تکلیف کے معنوں میں (۲۲/۱۱)، سزا یا عذاب کے معنوں میں (۳۷/۶۳)، دھوکہ اور فریب کے معنوں میں (۲/۱۰۲)، فریب خوردہ اور گمراہ کے معنوں میں (۶/۶۸)، سزا دینے کے معنوں میں (۶/۵۳) اور معذرت اور حجت کے معنوں میں اس کا استعمال (۶/۲۳) میں کیا گیا ہے۔

جہاں تک آزمائش کا تعلق ہے از روئے قرآن بنی نوع انسان کی تخلیق کا مقصد ہی آزمائش ہے یعنی اللہ تعالیٰ تمام انسانوں کو مختلف قسم کے مواقع فراہم کرتا ہے جن سے ان کی

ذات کی نمود ہو سکے۔ اس کٹھالی سے تمام انسانوں کو بہر صورت گذرنا ہوتا ہے یہ مشیت ایزدی کی ایک ایسی تقدیر ہے جس سے کسی صورت کسی انسان کو فرار ممکن نہیں ہے۔ موت و حیات کی تخلیق کا مقصد ہی انسانوں کی آزمائش ہے۔

الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفُوْرُ ؕ

(۶۷/۲)

اسی نے موت وحیات کو پیدا کیا تا کہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں سے کون اچھے کام کرتا ہے اور وہ غالب اور بخشنے والا ہے۔

یہ امر تخلیق ارض وسماوات کے وقت سے ہی معین ہے۔

وَھُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّۃِ اَیَّامٍ وَّکَانَ عَرْشُہٗ عَلَی الْمَآءِ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ

(۱۱/۷)

اور وہی تو ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ ایام میں خلق کیا اور اس کا عرش پانی پر تھا تا کہ وہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے اچھے عمل والا کون ہے؟

سختی اور آسودگی دونوں اس آزمائش کی مختلف شکلیں ہیں۔

کُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَۃُ الْمَوْتِ ؕ وَنَبْلُوْکُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَیْرِ فِتْنَۃً ؕ وَاِلَیْنَا تُرْجَعُوْنَ ؕ

(۲۱/۳۵)

ہر متنفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے اور ہم تم لوگوں کو سختی اور آسودگی میں آزمائش کے طور پر مبتلا کرتے ہیں اور تمہیں ہماری طرف ہی لوٹنا ہے۔

اس آزمائش کا ذریعہ زمین پر اور زمین میں پیدا کی جانے والی تمام تر اشیاء ہیں۔ بالفاظِ دیگر زمین کی ہر ہر شے انسان کے لیے ذریعۂ آزمائش ہے بالفاظِ دیگر پوری حیات ایک جامع آزمائش ہے۔

Marfat.com

اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (۱۸/۷)

روئے زمین پر جو کچھ ہے ہم نے اس کو زمین کے لیے آرائش کا باعث بنایا ہے تاکہ لوگوں کی آزمائش کریں کہ ان میں سے کون اچھے عمل کرنے والا ہے۔

نہ صرف روئے زمین کی تمام اشیاء بلکہ تمام انسان باہم ایک دوسرے کی آزمائش کا ذریعہ ہیں اور اس آزمائش میں بہر حال صبر لازمی ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ ۭ وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً ۭ اَتَصْبِرُوْنَ (۲۵/۲۰)

اور ہم نے آپ سے پہلے جتنے پیغمبر بھیجے سب کھانا کھاتے تھے اور بازاروں میں چلتے پھرتے تھے اور ہم نے تمہیں ایک دوسرے کے لیے آزمائش بنایا کیا تم صبر کرو گے اور تمہارا رب تو دیکھنے والا ہے۔

یقیناً اللہ تعالیٰ کے لیے یہ کوئی مشکل نہ تھا کہ تمام انسانوں کو ایک ہی دستور و منہاج کا پابند کر دیتا۔ اس طرح تمام انسان ایک ہی طریقے اور دستور کے پابند ہو جاتے تاہم مشیت ایزدی کا منشاء جانچ کا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو عطا کی جانے والی تمام تر اشیاء کو ان کی ذات کی نمود و ترقی کا ذریعہ بنایا ہے تاکہ انسان اپنی ذات کی خود نشو و نما کر سکے۔

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ۭ (۵/۴۸)

تم میں سے ہر ایک کے لیے ہم نے ایک دستور اور راہ مقرر کر دی ہے اگر اللہ کو منظور ہوتا تو تم سب کو ایک ہی امت بنا دیتا لیکن اس کی مشیت یہ ہے کہ

Marfat.com

اس نے جو تمہیں دیا ہے اس میں سے تمہیں آزمائے سو تم نیکیوں کی طرف جلدی کرو۔

اس آزمائش میں مسلمانوں کے لیے کوئی رعایت یا استثناء نہیں ہے یہاں ایک قانون ہے اور سب کے لیے ہے اس میں کوئی تخصیص نہیں ہے۔

الٓمّٓ ۝ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَكُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَ هُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ ۝ وَ لَقَدْ فَتَنَّا الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَیَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَ لَیَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِیْنَ ط
(۲۹/۱-۳)

الم کیا یہ لوگ یہ خیال کیے ہوئے ہیں کہ (صرف) یہ کہنے سے کہ ہم ایمان لائے چھوڑ دیے جائیں گے اور ان کی آزمائش نہیں کی جائے گی اور جو لوگ ان سے پہلے ہو چکے ہیں ہم نے ان کو بھی آزمایا تھا (اور ان کو بھی آزمائیں گے) یقیناً اللہ انہیں بھی جان لے گا جو سچ کہتے ہیں اور انہیں بھی معلوم کرے گا جو جھوٹے ہیں۔

ماضی کے نظائر میں قوم فرعون اور بنی اسرائیل ہیں جنہیں مختلف حوالوں سے جانچا گیا۔

وَ لَقَدْ فَتَنَّا قَبْلَهُمْ قَوْمَ فِرْعَوْنَ وَ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ كَرِیْمٌ (۴۴/۱۷)

اور ان سے پہلے ہم نے قوم فرعون کی آزمائش کی اور ان کے پاس ایک عالی قدر پیغمبر آئے۔

بنی اسرائیل کے متعلق کہا گیا کہ ان کو ایسی نشانیاں دی گئی تھیں جن میں صریح آزمائش تھی۔

وَ لَقَدِ اخْتَرْنٰهُمْ عَلٰى عِلْمٍ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ ۝ وَ اٰتَیْنٰهُمْ مِّنَ الْاٰیٰتِ مَا فِیْهِ بَلٰٓؤٌا مُّبِیْنٌ ط
(۴۴/۳۲-۳۳)

Marfat.com

اور ہم نے اسرائیل کو اہل عالم سے دانستہ منتخب کیا تھا اور ان کو ایسی نشانیاں دیں تھیں جن میں صریح آزمائش تھی۔

مثلاً اس حوالے سے سبت کے دن مچھلی نہ پکڑنے کا حکم بھی ایک آزمائش تھا۔

وَ سْئَلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِىْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ اِذْ يَعْدُوْنَ فِى السَّبْتِ اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَّ يَوْمَ لَا يَسْبِتُوْنَ لَا تَاْتِيْهِمْ كَذٰلِكَ نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ (۷/۱۶۳)

اور آپ ان لوگوں سے اس بستی والوں کا جو کہ دریائے (شور) کے قریب آباد تھے اس وقت کا حال پوچھیے جبکہ وہ ہفتے کے بارے میں حد سے نکل رہے تھے جبکہ ہفتے کے روز تو ان کی مچھلیاں تو ظاہر ہو کر ان کے سامنے آتی تھیں اور جب ہفتے کا دن نہ ہوتا تو ان کے سامنے نہ آتیں ہم ان کی اس طرح آزمائش کرتے تھے کیونکہ وہ نافرمانی کیا کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں کی آزمائش کی یہ سنت آج بھی جاری ہے اس کی شکل کچھ بھی ہو سکتی ہے یہ مال اور اولاد کی شکل میں ممکن ہے۔

اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَ اَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ وَّاللّٰهُ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ (۶۴/۱۵)

تمہارا مال اور تمہاری اولاد تو آزمائش ہے اور اللہ کے پاس بڑا اجر ہے۔

اس کی شکل، دشمنوں کا ڈر، بھوک، پیاس اور مال وجان کا خسارہ یا کسی بھی دیگر صورت میں ممکن ہے۔

وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَىْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَ نَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ (۲/۱۵۵)

اور ہم کسی نہ کسی طرح تمہاری آزمائش ضرور کریں گے، دشمن کے ڈر سے، بھوک پیاس سے، مال وجان اور پھلوں کی کمی سے اور صبر کرنے والوں کے لیے خوشخبری ہے۔

(۳/۱۸۶) میں بھی اس حقیقت کا اعادہ کیا گیا ہے کہ تمہاری مالوں اور نفوس سے آزمائش کی جائے گی۔ دنیاوی آرائش کی چیزوں کی دستیابی بھی آزمائش ہی کی ایک شکل ہے۔

وَ لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ وَ رِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّ أَبْقَىٰ (۲۰/۱۳۱)

اور کئی طرح کے لوگوں کو ہم نے دنیا کی آرائش کی چیزوں سے بہرہ مند کیا تاکہ ان کی آزمائش کریں ان پر نگاہ نہ کرنا اور تمہارے رب کا عطا کیا ہوا رزق بہتر اور باقی رہنے والا ہے۔

## آزمائش کا مقصد:

جہاں تک اس ہمہ جہت آزمائش کا تعلق ہے اس کے مقصد کی وضاحت بھی خود قرآن مجید میں باصراحت کردی گئی ہے یعنی اس کا مقصد شکر گذاری ہے۔ شکر گذاری سے مراد ایسے اعمال صالحہ ہیں جن سے اللہ کی رضا حاصل ہو۔ اور اس کا بالواسطہ اور بلا واسطہ فائدہ انسانی نفس کو ہی ہوتا ہے۔ یہ حقیقت پھر اس امر کی تصدیق ہے کہ آزمائش سے مراد یہ ہرگز نہیں کہ اللہ کسی کو جاننا چاہتا ہے بلکہ اس کا مقصد انسانی انا/خودی/شخصیت کو جو خام حالت میں ہوتی ہے اسے مختلف تجربات و حادثات و واقعات کی کٹھالی سے گذار کر کندن بنانا ہے۔ اس کی تصدیق مندرجہ ذیل آیت کریمہ سے ہوتی ہے

قَالَ الَّذِي عِندَهُ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ أَنَا آتِيكَ بِهِ قَبْلَ أَن يَرْتَدَّ إِلَيْكَ طَرْفُكَ فَلَمَّا رَآهُ مُسْتَقِرًّا عِندَهُ قَالَ هٰذَا مِن فَضْلِ رَبِّي لِيَبْلُوَنِي أَأَشْكُرُ أَمْ أَكْفُرُ وَمَن شَكَرَ فَإِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهِ وَ مَن كَفَرَ فَإِنَّ رَبِّي غَنِيٌّ كَرِيمٌ (۴۰/۲۷)

جس کے پاس کتاب کا علم تھا بول اُٹھا کہ آپ پلک جھپکائیں اس سے بھی پہلے میں اسے آپ کے پاس پہنچا سکتا ہوں جب آپ نے اسے اپنے پاس

Marfat.com

موجود پایا تو فرمانے لگے کہ یہ میرے رب کا فضل ہے تا کہ وہ مجھے آزمائے
کہ میں شکر گزاری کرتا ہوں یا ناشکری، شکر گزار اپنے ہی نفس کے لیے شکر
گزاری کرتا ہے اور جو ناشکری کرے تو میرا رب بے نیاز اور کریم ہے۔

اس آیت کریمہ سے مترشح ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عنایات اس کا فضل ہیں اللہ کا فضل اس کی جانب سے آزمائش کا درجہ رکھتا ہے اور آزمائش کا مقصد شکر گزاری ہے اگر انسان اللہ کی جانب سے ملنے والی نعمتوں پر اس کا شکر ادا کرے یعنی ان نعمتوں کو خلق خدا کی بہتری کے لیے یا اعمال صالحہ کے لیے استعمال کرے تو اس سے انسان کے نفس کو فائدہ ہوتا ہے اور جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ انسانی زندگی کا بنیادی مقصد اور اس کی کامیابی کا معیار نفس کے توازن کو برقرار رکھنا ہے جو شخص بھی ایسا کرنے میں کامیاب ہو گیا وہ کامیاب و کامران ہے اور جو ایسا نہیں کر سکا وہ خاسر اور ناکام و نامراد ہے۔ اور اس کامیابی کی واحد راہ نیکیوں اور اعمال صالح کی راہ ہے یہی وجہ ہے کہ آزمائش کے عنوان کے تحت بیان کردہ متذکرہ بالا آیات (۲/ ۶۷)، (۱۱/۷)، (۱۸/۷) اور (۴۸/ ۵) میں تمام جگہوں پر آزمائش کا ایک ہی مقصد بتایا گیا ہے یعنی اس امر کی جانچ کہ تم میں سے کون اچھے کام کرتا ہے یا یہ کہ تم لوگ نیکیوں میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرو تا کہ نفس انسانی کی زیادہ سے زیادہ تعمیر ہو سکے جو کہ انسانی زندگی کا مقصود و منتہا ہے اور اس مقصد کو حاصل کرنے کی اس کی سوا اور کوئی راہ نہیں ہے۔

## ایک سطحی تضاد

آزمائش کے حوالے سے قرآن مجید کی متذکرہ بالا آیات اور رزق کی بست و کشاد کے بیان کردہ قوانین کا اگر موازنہ کیا جائے تو ایک سطحی تضاد ابھرتا ہے۔ تضاد بنیادی طور پر یہ سامنے آتا ہے کہ جب قوانین اپنی جگہ مطلق ہیں ان میں لچک کی کسی قسم کی کوئی گنجائش نہیں ہے تو اس کے نتیجے جو نفس جو بھی کرے اس کا اسی قسم کا نتیجہ سامنے آنا چاہیئے۔ اعمال صالح

Marfat.com

کے نتیجے میں اچھے نتائج اور اعمال بد کے نتیجے میں بُرے نتائج بغیر کسی استثناء کے سامنے آجانے چاہیں جبکہ اگر آزمائش کا پہلو بیچ میں لے آیا جائے تو اس کے نتیجے میں استثناء کی گنجائش پیدا ہو سکتی ہے۔ مثلاً آزمائش کے حوالے سے سورۃ البقرہ کی مندرجہ ذیل آیت کو زیر غور لائیے۔

وَ لَنَبۡلُوَنَّکُمۡ بِشَیۡءٍ مِّنَ الۡخَوۡفِ وَالۡجُوۡعِ وَ نَقۡصٍ مِّنَ الۡاَمۡوَالِ وَالۡاَنۡفُسِ وَ الثَّمَرٰتِ ؕ وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِیۡنَ ۙ (۲/۱۵۵)

اور ہم کسی نہ کسی طرح تمہاری آزمائش ضرور کریں گے، دشمنوں کے ڈر سے، بھوک پیاس سے، مال و جان اور پھلوں کی کمی سے اور صبر کرنے والوں کے لیے خوشخبری ہے۔

یہ آیت واضح طور پر اس امر کی کھلی شہادت ہے کہ آزمائش لازمی ہے اس میں کسی قسم کی استثناء نہیں ہے آزمائش کی شکل کچھ بھی ہو سکتی ہے تاہم یہ بہر حال لازمی ہے۔ اب اگر سب کچھ ایک واضح قاعدے قانون کے تحت ہو رہا ہے اور ایک شخص ایمان کے ساتھ مکمل صالح زندگی گذار رہا ہے تو رزق کی کشاد کے قوانین کے تحت اس کے رزق کی بستگی کا امکان نہیں لیکن آزمائش تصور کے تحت رزق کی بستگی یا کسی بھی نوع کا دیگر نقصان ممکن ہے۔ یہ ہے وہ تضاد جو یہاں سامنے آتا ہے۔ باالفاظِ دیگر قوانین کی موجودگی میں سب کچھ صرف اور صرف قانون کے مطابق ہونا چاہیے جبکہ آزمائش کا تصور اس میں استثنائی صورت پیدا کر دیتا ہے۔

یہ تضاد صورتِ حال کو سطحی انداز میں لینے سے پیدا ہوتا ہے تاہم اگر اس صورتِ حال کا ذرا گہرائی میں جا کر جائزہ لیا جائے تو صورتِ حال واضح ہو جاتی ہے کہ اس حوالے سے کوئی تضاد نہیں ہے بلکہ ان دونوں احوال کی تطبیق باآسانی ممکن ہے۔

یہ تضاد اس وجہ سے ہوتا ہے کہ ہر فرد یقیناً اپنے اعمال کے عوض گروی ہے (۷۴/۳۸)

جیسا کرے گا ویسا بھرے گا (۹/۸۲) یقیناً اجتماعی سطح پر بھی یہی صورتِ حال ہے اور اس میں یقیناً کوئی کسی قسم کا شک نہیں ہے لیکن ایک فرد انفرادی سطح پر کسی تنہا جزیرے میں زندگی بسر نہیں کرتا۔ وہ ایک معاشرے کا حصہ ہوتا ہے اور بہ حیثیت سماج کے ایک فرد کے وہ کسی نہ کسی قوم کا حصہ ہوتا ہے۔ قوموں کی اجتماعی تقدیر ان کے افراد کی تقدیر سے بنتی ہے۔ اس کے علاوہ کسی نہ کسی مخصوص علاقے میں رہائش پذیر ہوتا ہے۔ اس مخصوص علاقے کے جغرافیائی عوامل سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح وہ نوع انسانی کا نمائندہ بھی ہوتا ہے پوری نوع انسانی بہ حیثیت نوع جس صورتِ حال سے دوچار ہوتی ہے وہ بھی اسی کا حصہ ہوتا ہے۔

اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک انسان پر انفرادی سطح سے لے کر اجتماعی سطح تک اور من حیث النوع بے شمار تقدیرات اثر انداز ہوتی ہیں۔ صرف انفرادی سطح پر ہی ایک انسان صبح سے لے کر شام تک کئی افعال انجام دیتا ہے اس کے نتائج اعمال کے وقوع پذیر ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے انجام کی طرف بڑھنا شروع ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے بعض افعال ایسے ہوتے ہیں جو طویل مدت میں اپنے اثرات ظاہر کرتے ہیں بعض فوری نوعیت کے حامل ہوتے ہیں۔ مثلاً اگر ایک شخص سگریٹ نوشی کرتا ہے تو سگریٹ کے بد اثرات فوری نوعیت کے نہیں ہوتے یہ آہستہ آہستہ اپنے اثرات بد کے نتیجے میں انسانی صحت کو ختم کرتا چلا جاتا ہے اور ایک مرحلے پر اپنے منطقی انجام یعنی انسانی موت کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس کے برعکس اگر کوئی شخص کھولتے ہوئے پانی میں ہاتھ ڈالتا ہے یا آگ میں ہاتھ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ یا پیٹرول یا مٹی کا تیل پی لیتا ہے تو اس کے نتائج فوری نوعیت کے ہوتے ہیں۔ اسی طرح لاتعداد انسانی افعال نیک ہوں یا بد اپنی اپنی مخصوص تقدیر کے حامل ہوتے ہیں جو انسان پر اثر انداز ہوتے ہیں اسی طرح اس قوم کی لاتعداد تقدیریں جس کا ایک فرد حصہ ہوتا ہے اس پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ اس کی ایک واضح مثال حضرت لوط علیہ السلام کی اللہ تعالیٰ کے حضور دعا ہے جس میں انہوں نے اپنی قوم کے اعمالِ بد کے اثرات سے محفوظ

Marfat.com

رہنے کے لیے اللہ کی پناہ طلب کی۔

رَبِّ نَجِّنِیْ وَ اَھْلِیْ مِمَّا یَعْمَلُوْنَ ط (۲۶/۱۶۹)

اے میرے رب مجھ کو اور میرے گھر والوں کو ان کے کاموں (کے وبال) سے نجات دے۔

یہ دعا اس امر کی صریحاً غماز ہے کہ کس طرح اقوام کے اعمال کی تقدیرات کے نتائج اس کے افراد پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اسی حوالے سے حضرت نوح علیہ السلام کا اپنی قوم کے بارے میں مندرجہ ذیل تجزیہ بھی اس حقیقت کا غماز ہے کہ ہر نسل پر ایک مخصوص حد تک اس کے آباواجداد کے اعمال کی تقدیریں بھی اثر انداز ہوتی ہیں۔

وَ قَالَ نُوْحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَی الْاَرْضِ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ دَیَّارًا ○ اِنَّکَ اِنْ تَذَرْھُمْ یُضِلُّوْا عِبَادَکَ وَ لَا یَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا کَفَّارًا (۷۱/۲۶-۲۷)

اور (حضرت) نوح (علیہ السلام) نے کہا کہ اے میرے رب تو روئے زمین پر کسی کافر کو بستا نہ چھوڑنا۔ اگر تو انہیں چھوڑ دے گا تو (یقیناً) یہ تیرے (اور) بندوں کو (بھی) گمراہ کریں گے اور یہ فاجروں اور کفار ہی کو جنم دیں گے۔

متذکرہ بالا آیات ربانی اس امر کی صریح شہادت ہیں کہ کفر کی انتہا تک پہنچ جانے والوں کے افعال ان کی اپنی اولادوں کی راہ میں سدِ راہ بن جاتے ہیں۔

اس کے علاوہ انسان پر نوعِ انسانی کا فرد ہونے کے ناطے بھی بے شمار تقدیرات اثر انداز ہوتی ہیں۔ اس طرح یہ تمام تقدیرات جس میں ذاتی انسانی افعال کے نتائج سے لے کر بنی نوعِ انسانی تک کی تقدیرات شامل ہیں عمل اور ردِ عمل کا ایک انتہائی پیچیدہ نظام ترتیب دیتی ہیں اس نظام کی وسعت اور پیچیدگی کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ انسانی ذہن میں پیدا ہونے والے خیالات بھی اپنے الگ اثرات رکھتے ہیں۔

اس ماوراءِ تصور پیچیدہ اور گنجلک نظام کی کلید صرف اور صرف اللہ کے پاس ہے وہی

Marfat.com

ذاتِ واحد ہے جو ان تمام تقدیرات پر قادر ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ط (۳/۱۶۵)

بے شک اللہ تمام تقدیرات پر قادر ہے۔

اس پس منظر میں عملی طور پر یہ ہوتا ہے کہ ایک خاص وقت میں جب انسان اپنے کسی عمل کے کسی خاص نتیجے کا منتظر ہوتا ہے تو یہ عین ممکن ہے کہ اس عمل کے نتائج کسی دیگر تقدیر کی وجہ سے مؤخر ہو جائیں اور انسان حسب منشا نتائج حاصل نہ کر سکے یا وہ نتائج تاخیر سے حاصل ہوں یہی آزمائش ہے، اور اس میں ثابت قدم رہنا صبر کہلاتا ہے اور صبر کرنے والے صابرین کہلاتے ہیں اور انہی کے لیے خوشخبری ہے جس کا وعدہ متذکرہ بالا آیت (۲/۱۵۵) میں کیا گیا ہے۔

یہاں اس امر کی صراحت لازمی ہے کہ اگر صورتِ حال اس قسم کی ہو کہ صاحب ایمان افراد کے اعمال صالح کے نتیجے میں اگر مثبت نتائج رونما نہیں ہوتے یا ویسے ہی ایسے افراد اگر کسی موسمی تقدیر یا کسی بھی دیگر تقدیر کے نتیجے میں اگر بحران یا مشکل سے دوچار ہو جاتے ہیں تو ان لوگوں کے لیے پاک پروردگار کا وعدہ ہے۔

فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا o اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا (۶۔۵/۹۴)

یقیناً مشکل کے ساتھ آسانی بھی ہے (اور) بے شک مشکل کے ساتھ آسانی بھی ہے۔

گویا مشکلات میں صبر کے نتیجے میں مشکلات کی تقدیر لازمی طور پر آسانی پر منتج ہوتی ہے۔ یعنی یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسان پر اثر انداز ہونے والی لاتعداد تقدیرات کے نتیجے میں اگر انسان وقتی طور پر کسی مشکل سے دوچار ہو جاتا ہے تو اسے آزمائش کہا جاتا ہے۔ یہ آزمائش پھر انسان کے لیے خیر کا پہلو اس صورت میں لیے ہوتی ہے کہ ان مشکلات سے عہدہ برا ہونے کے لیے جو آزمائش کی صورت میں سامنے آتی ہیں انسان اپنی مضمر صلاحیتیں

یا معلوم صلاحیتوں کو زیادہ بہتر انداز میں استعمال کرتا ہے اور اس طرح اپنی شخصیت کی مزید تعمیر کرتا ہے۔

اس کی ایک مثال عہد نبوی (ﷺ) میں مدینہ میں پڑنے والے قحط سے دی جا سکتی ہے۔ عہد نبوی (ﷺ) سے پاک، اعلیٰ اور ارفع دور روئے زمین پر یقیناً کبھی نہیں آ سکتا۔ لیکن اس کے باوجود آپ (ﷺ) کے دور میں بعض جغرافیائی عوامل کی وجہ سے قحط پڑا۔ یہ آزمائش کی مثال ہے۔ اس دور میں کس طرح اس مشکل پر قابو پایا گیا لوگوں نے کس طرح ایک دوسرے کی مدد کی اور کس طرح ایک دوسرے کے کام آئے یہ دوران آزمائش ثابت قدمی اور صبر کی مثال ہے۔ اس دور میں مسلمانوں نے صبر کیا اور حوصلے سے اس مشکل کو برداشت کیا نتیجے کے طور پر مشکل کی تقدیر کا اختتام آسانی پر ہوا۔

یہاں یہ امر بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ آزمائش کا دائرہ صرف سختی یا مشکلات تک ہی محدود نہیں ہے۔ لاتعداد تقدیروں کے اس انتہائی پیچیدہ عمل اور ردعمل کے نتیجے میں یہ بھی ممکن ہے کہ سہولیات، آسانیاں اور آسائشات کی کثرت بھی ہو سکتی ہے اس صورت میں اس حاصل ہونے والی دولت (خواہ اس کی شکل کچھ کیوں نہ ہو کیونکہ اس میں عام مال و دولت سے لے کر انسانی صلاحیتوں کی شکل میں ملنے والی دولت بھی شامل ہے) کا صحیح اور بامقصد استعمال اس کی آزمائش ہے۔ کیونکہ اسرافِ دولت تو کوئی مسئلہ نہیں یہ تو لمحوں میں ممکن ہے لیکن دولت کا تعمیری اور مثبت استعمال اصل جانچ ہے۔ یہاں مثبت اور تعمیری استعمال سے مراد ہر نوع کی دولت کا ایسا استعمال ہے جس سے دوسروں کو منفعت حاصل ہو۔ اس حوالے سے مختلف ممالک کو اللہ کی طرف سے عطا ہونے والے معدنی وسائل بالخصوص تیل کی دولت کی مثال دی جا سکتی ہے۔ اسی طرح انسانوں کو ودیعت ہونے والی صلاحیتیں جن میں ظاہر ہے انسانی کسب و ہنر کا کوئی دخل نہیں ہوتا اس کی مثالیں ہیں جن کا تعمیری اور مثبت استعمال انسانی آزمائش ہے۔

Marfat.com

ان بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ رزق کی بست و کشاد کے قوانین اور آزمائش کے پہلو میں کوئی تضاد نہیں ہے بظاہر یہ دونوں باہم متصادم نظر آتے ہیں لیکن در حقیقت ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں۔

Marfat.com

Marfat.com

پروفیسر ڈاکٹر فاروق عزیز کی آئندہ آنے والی کتاب

# قرآن تصورِ نفس

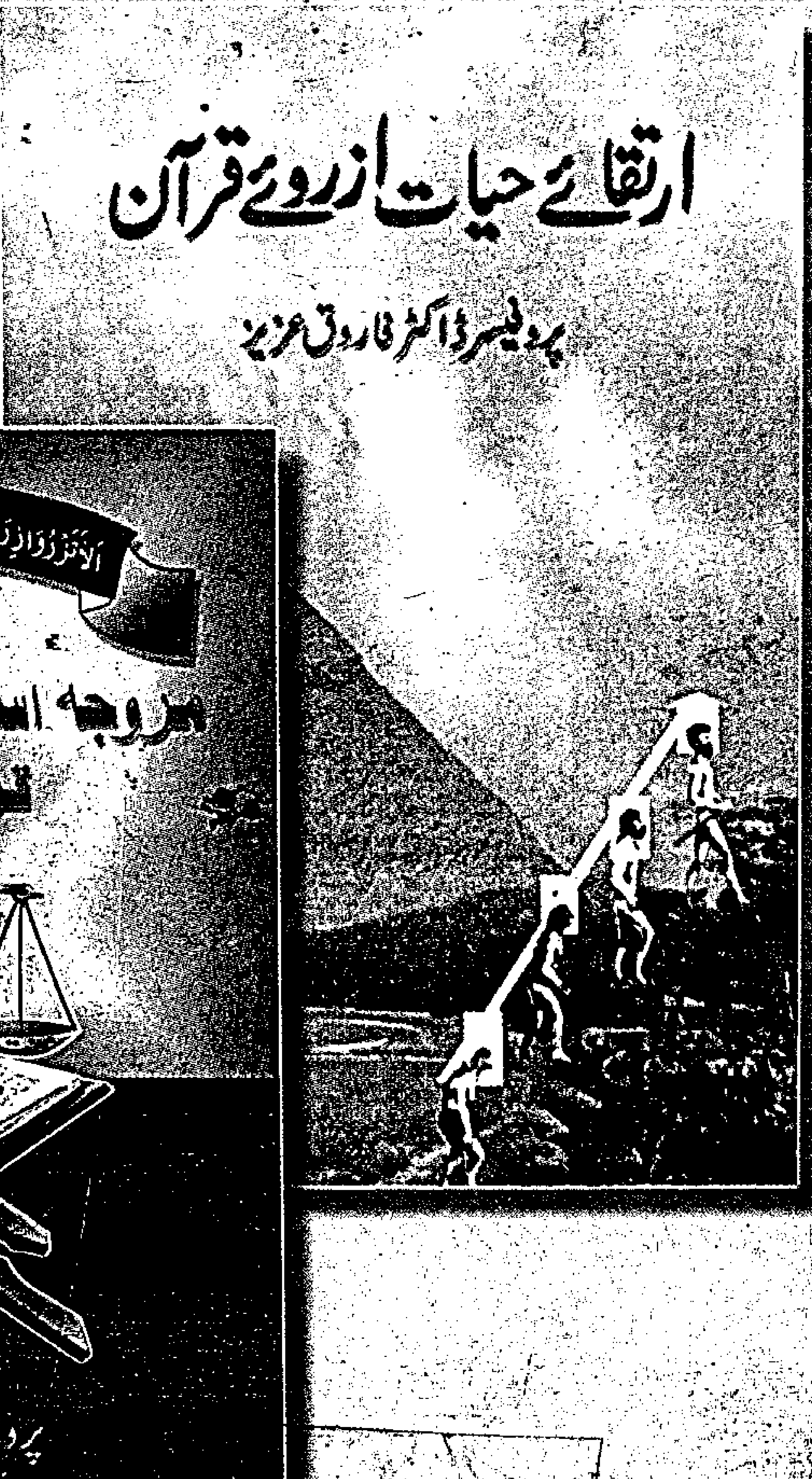


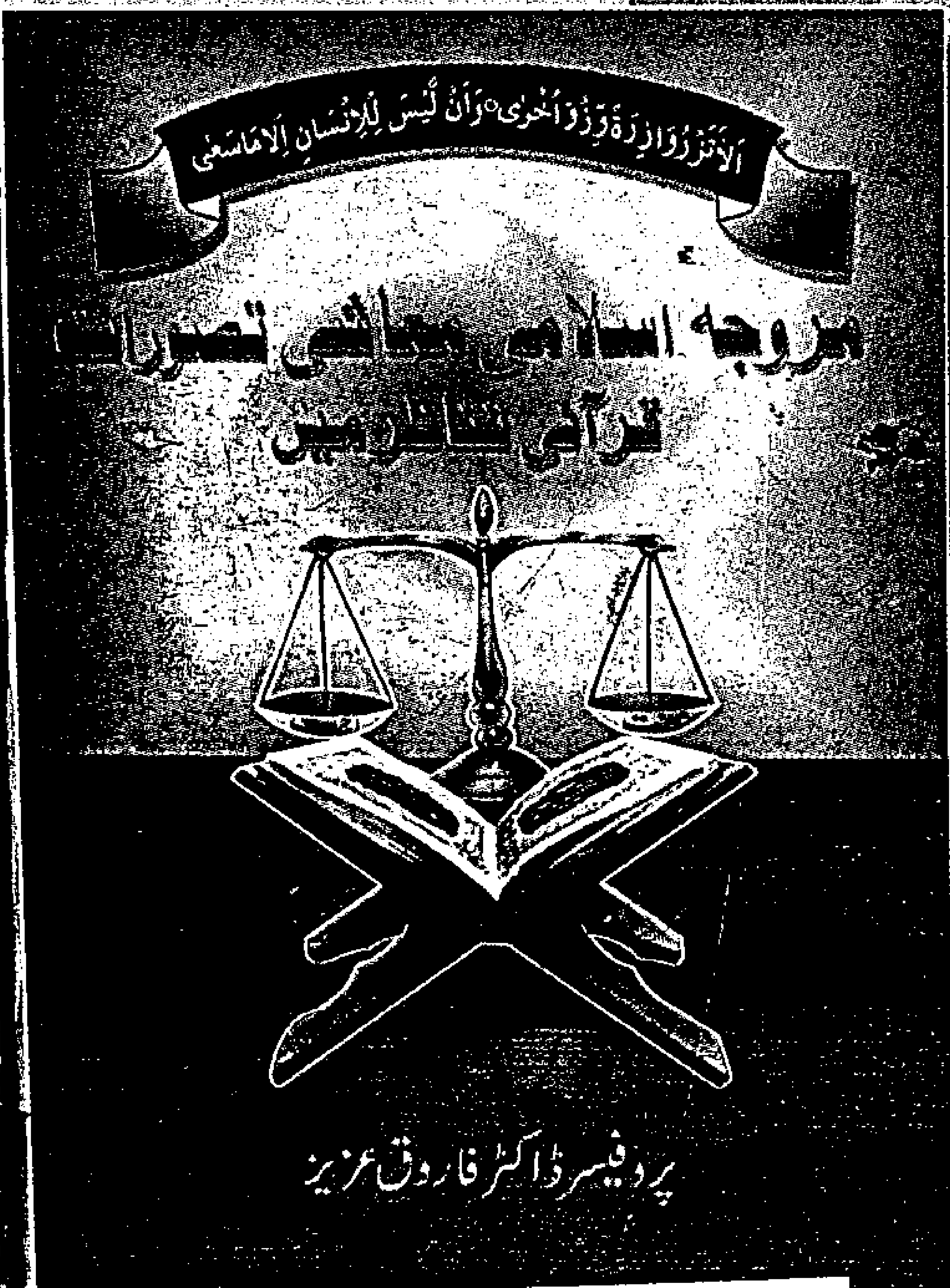


297.11 ف 19 ر
*70153-U-67*

اسلامک بک سینٹر
مقدس مسجد اردو بازار کراچی۔ فون: 2736870

Marfat.com

# رزق کی بسط و کشاد کے قرآنی قوانین

پروفیسر ڈاکٹر فاروق عزیز